پریم چند: گھر میں

شِورانی دیوی

مترجم

سیّد حسن منظر

پریم چند : گھر میں

پریم چند: گھر میں

شِو رانی دیوی

مترجم

سید حسن منظر

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۶۷

سنِ اشاعت : ۲۰۰۷ء
قیمت : =/۲۰۰
ڈیزائن سرورق : جاوید رحمانی
بہ اہتمام : اختر زماں
کمپوزنگ : عارفہ خانم، جاوید رحمانی
طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

Premchand Ghar Mein
by : Shivrani Devi
Translated by : Syed Hasan Manzar
Price : 200.00
2007

ISBN : 81-7160-136-7

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
Phone 23236299, 23237210, Fax 23239547
E-mail anjuman.urdughar@gmail.com
E-mail urduadabndh@bol.net.in

نذر

سوامی،

تمہاری ہی چیز تمہارے چرنوں میں چڑھاتی ہوں۔اس حقیر سیوا کو اپنانا۔

تمہاری داسی پریاگ رانی

شیو رانی

انتساب

شورانی دیوی پریم چند کی کتاب 'پریم چند گھر میں' کا ہندی سے اردو ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بار بار اپنی والدہ محترمہ انور جہاں بیگم یاد آئیں جنھوں نے اس وقت جب میں پڑھ نہیں سکتا تھا مجھے ہمیشہ اچھی، ادبی اہمیت کی کہانیاں سنائیں اور مجھ میں اچھی فلمیں دیکھنے کا ذوق پیدا کیا۔

آخیر عمر میں وہ کچھ بھی نہیں رہی تھیں لیکن مجھے یقین ہے اگر اس کتاب کا ترجمہ میں نے آج سے چالیس، پینتالیس سال پہلے کر لیا ہوتا تو وہ اسے بڑے شوق سے پڑھتیں اور اختتام پر پہنچ کر روتی ہوئی مجھ سے کہتیں، تم نے ایسی کتاب مجھے پڑھنے کو کیوں دی تھی، اور دو چار دن بعد وہی رلانے والے حصے پھر سے پڑھنے لگتیں۔

سید حسن منظر

حیدرآباد۔ سندھ

۱۲ مارچ ۱۹۹۷ء

فہرست

حرفِ آغاز

'پریم چند گھر میں' اپنی نوعیت کی ایک ایسی سوانح عمری ہے جس کی اردو میں دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔ اس سوانح عمری میں ایک بے لوث اور وفادار بیوی نے اپنے اس شوہر کے حالات لکھے ہیں جس نے اپنی بیوی کو اتنا پیار دیا کہ وہ زندگی بھر اُس کی گرویدہ رہی۔

سوانح عمری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسی خاتون نے لکھی ہے جسے ادبی تحریر لکھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا یعنی جسے نہ زبان پر قدرت ہے اور نہ جس کے پاس اسلوب ہے، بس ایک جاں نثار شوہر کے ساتھ ایک وفادار بیوی کی گزاری ہوئی زندگی کی انتہائی نا قابلِ فراموش اور خوب صورت یادیں ہی اس کی کتاب کی بنیاد ہیں۔ اس کتاب کو لکھنے کے لیے شِورانی دیوی کے پاس سرمایۂ کمال بس دل کے گہرے رشتوں کے نہ مٹ سکنے والے وہ نقوش تھے جنھیں اُنھوں نے کاغذ پر سوانح عمری کی شکل میں سجا کر رکھ دیا۔ شِورانی بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ اُنھوں نے غالبًا کسی اسکول میں باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی تھی لیکن دن رات پریم چند کی صحبت میں رہنے سے اُن میں وہ سیاسی اور سماجی سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی تھی جو پریم چند جیسی شخصیت کی سوانح عمری لکھنے کے لیے ضروری تھی۔

پریم چند نے خود اپنی کوئی باضابطہ خودنوشت لکھی اور نہ ہی ایسی کوئی یادداشت لکھی جو اُن کے سوانح نگار کے کام آسکتی۔ پھر بھی شاید اُنھیں یہ یقین تھا کہ اُن کے مرنے کے بعد لوگ اُن کی سوانح عمریاں لکھیں گے، اس لیے وہ دوسروں کو وقتاً فوقتاً ایسی یادداشتیں لکھواتے رہتے تھے جن سے اُن کی زندگی، شخصیت، سیرت اور اُن کے تخلیقی فن پر روشنی پڑ سکے۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو شِورانی کے علاوہ کسی اور نے شاید ہی اپنی یادداشتوں اور پریم چند کی لکھوائی ہوئی یادداشتوں سے استفادہ کر کے اُن کی سوانح عمری لکھی ہو۔ شِورانی نے شوہر کے لیے بے پناہ جذبے، ایثار، پیار اور اپنی اور پریم چند کی ملی جلی یادداشتوں کی بنیاد پر یہ کرشمہ کر دکھایا ہے۔ شِورانی تقریباً تیس سال تک دن

رات پریم چند کے ساتھ رہیں۔ اُنھوں نے پریم چند کو جس حال میں بھی دیکھا، اُس کو انتہائی سادہ زبان میں اور بغیر کسی مبالغہ کے بیان کر دیا ہے۔ شورانی نے پریم چند کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس کا بیشتر حصہ سیاسی اور اُن کے ذاتی تجربے اور مشاہدات کی بنیاد پر تھا اور بقیہ کچھ باتیں وہ تھیں جو اُنھوں نے پریم چند کے دوستوں، مداحوں اور رشتے داروں سے سنی تھیں اور جنھیں اُنھیں شوہر کے ساتھ اپنے تعلق کی گرمی سے بہت دل چسپ بنا دیا ہے۔ یہ سوانح عمری پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شورانی نے جو واقعات بیان کیے ہیں اُن میں سے جو دوسروں کی زبانی سنے ہوئے ہیں اُنھیں خوب چھان پھٹک کر کے ہی لکھا ہے۔

سوانح عمری میں جگہ جگہ یہ احساس ہوتا ہے کہ شورانی کو یقین تھا کہ وہ ایک غیر معمولی انسان کی ایک ایسی خوش نصیب بیوی ہیں جسے اپنے شوہر کے ساتھ طویل عرصے تک رہنے کا موقع ملا تھا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ شورانی ادیب نہیں تھیں پھر بھی قدرت نے اُنھیں پریم چند جیسی عظیم ہستی کے سوانح لکھنے کا موقع دیا تھا اور اس موقع کا استعمال اُنھوں نے اتنا جی لگا کر کیا ہے کہ وہ آپ ہی آپ پریم چند کی اور اپنی مشترکہ سوانح عمری کی ایک صاحب طرز قسم کی ادیب بنتی چلی گئیں۔

شورانی ادیب نہیں ہیں۔ اُنھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ اُنھیں لکھنا نہیں آتا لیکن کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند کی طرح اُن کی بیوی بھی منکسر المزاج تھیں۔ ورنہ ایسی خوب صورت زبان میں وہ اتنی اچھی سوانح عمری نہیں لکھ سکتی تھیں۔ اس طرح یہ دعویٰ بالکل بے معنی ہو کر رہ گیا کہ اُنھوں نے اس سوانح عمری سے قبل کچھ نہیں لکھا۔

سادہ اور سلیس زبان میں اپنی بات کہنے کا یہ سلیقہ اُن کے یہاں یقیناً پریم چند کی صحبتوں کے فیض ہی سے آیا ہے۔ اُن کی نثر قلم برداشتہ، بے تکلف ہے۔ اس کی زبان آج کل کی ہندی کی طرح مصنوعی نہیں ہے۔ شورانی نے یہ کتاب 'پریم چند گھر میں' ایسی سادہ زبان میں لکھی ہے جس میں ہندی اور اردو دونوں کی چاشنی ہے۔ شورانی نے اس سوانح عمری کے ذریعے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ ایک ذی شعور اور حساس خاتون تھیں۔ اُنھوں نے پریم چند اور اُن کے مداحوں اور اُن کے قارئین کی نظر سے نہیں خود اپنی نظر سے پریم چند کو دیکھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے یہ سوانح عمری پریم چند کی اُس پریم چند سے مختلف ہے جو ہمارے ذہنوں میں بسے ہوئے ہیں۔ یہ شورانی کے دل و دماغ میں رہنے والے پریم چند کی سوانح عمری ہے۔

کتاب کے مترجم نے صحیح لکھا ہے کہ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ تجربہ کار، منجھے ہوئے

سوانح نگار کی لکھی ہوئی بلکہ ایک ایسی خاتون کی ہے جس کا اثاثہ محبت، خلوص اور پریم چند کی تیس سال کی صحبتوں سے اُٹھایا ہوا فیض ہے۔

سوانح عمری کہیں کہیں کچھ غیر مربوط بھی ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف لکھتے لکھتے خیالوں کی دنیا میں بھٹک گیا ہے۔ شو رانی دیوی کہیں کہیں جذباتیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہو جانا فطری عمل بھی تھا۔ اسی لیے ایسے مقامات پر تسلسل برقرار نہیں رہتا۔ ہوتا یوں ہے کہ وہ کچھ واقعات سنا رہی ہیں کہ اُنھیں اپنے ماضی کا کوئی واقعہ یاد آ گیا جو اُنھیں کچھ دیر کے لیے کسی اور ہی رَو میں بہا کر لے گیا۔ کہیں کہیں اُن کا لب و لہجہ ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ ہمارے ذہنوں میں اُن کی تصویر ایک سوانح نگار سے زیادہ وفادار بیوی کی اُبھرنے لگتی ہے۔ اس سوانح عمری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شو رانی نے اپنے شوہر کے تمام حالات اور واقعات انتہائی ایمان داری اور سچائی سے پیش کیے ہیں۔

حسن منظر صاحب پیشے کے اعتبار سے ایک ممتاز ڈائٹر ہیں لیکن اُنھوں نے زیرِ نظر کتاب کا ہندی سے اردو میں ترجمہ ایسی زبان میں کیا ہے جو بہت خوب صورت اور دلآویز ہے اور جس سے آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُنھیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر بہت اچھا عبور حاصل ہے۔ اُنھوں نے کامیاب کوشش کی ہے کہ ہندی اور اردو کے اجنبی الفاظ کا استعمال نہ کریں۔

سید منظر حسن کا نام ہندوستانی قارئین کے لیے کچھ نیا نیا سا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کھڑی وہ دیوار ہے جس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے ادیب ایک دوسرے ملک کے ادب کے مطالعہ سے محروم رہتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خدا نے منظر صاحب کو خودنمائی کی صلاحیت نہیں دی۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے ادیبوں نے دونوں ملکوں کے ادبی رسالوں میں اپنی تخلیقات شائع کرا کے اور ادیبوں کو خط لکھ لکھ کر خود کو روشناس کرا رکھا ہے۔ مگر منظر صاحب ان صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ حالاں کہ وہ بہت زیادہ پڑھے لکھے اور باصلاحیت ادیب ہیں۔

۴ر مارچ ۱۹۳۴ء کو وہ اتر پردیش کے ایک شہر باپوڑ میں پیدا ہوئے تھے، وہ مرادآباد کے ہیوٹ مسلم ہائی اسکول (جو بعد میں انٹر کالج ہو گیا) کے طالب علم رہے۔ اس کالج سے انٹر کر کے وہ پاکستان چلے گئے، جہاں اُنھوں نے فورمین کرسچین کالج اور اسلامیہ کالج لاہور سے اعلا تعلیم حاصل کی۔ کنگ ایڈورڈ کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے یونی ورسٹی آف ایڈمبرا، ڈی، پی، ایم، روئل کالجز آف فزیشینز اینڈ سرجنز ایڈمبرا، گلاسگو ڈی پی ایم سے مزید تعلیم حاصل کی۔

پیشہ کے اعتبار سے وہ سائیکٹرسٹ Consultant Psychiatrist اُنھوں نے یونی ورسٹی آف ملایا ایڈمبرا، ویسٹ لودین اسکوٹ لینڈ، شمالی نائیریا، لیگوس، روئل ڈچ مرچنٹ نیوی، سعودی عرب، موری پور، کراچی میں ملازمتیں کیں اور اب حیدرآباد سندھ میں مقیم ہیں جہاں اُن کا کلینک ہے۔ اُن کے اب تک افسانوں کے پانچ مجموعے'رہائی'، 'مدیدی'، 'انسان کا دیش'، 'سوئی بھوک' اور'ایک اور آدمی' شائع ہو چکے ہیں۔

انھیں ہندی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اُنھوں نے پریم چند کے ادھورے ناول 'منگل سوتر' کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

'پریم چند گھر میں' کی سوانح عمری سے پتا چلتا ہے کہ حسن منظر صاحب بہترین مترجم بھی ہیں۔

انھیں آسان اور عام فہم زبان پر قدرت حاصل ہے۔ اس ترجمے سے اُنھوں نے پریم چند ادب میں ایک بڑا اور اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں انتہائی سلیقے اور مہارت سے کیے گئے اس ترجمے کے لیے حسن منظر صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

خلیق انجم

دو لفظ

پڑھنے والوں کے سامنے اس کتاب کو رکھتے ہوئے مجھے وہی سکھ محسوس ہو رہا ہے جو ایک آدمی کو اپنا فرض پورا کرنے سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد اس مہان آتما کی شہرت کو پھیلانا نہیں ہے جیسا کہ زیادہ تر سوانح عمریوں کا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں آپ کو گھریلو واقعات کی جھلکیاں ملیں گی لیکن ان جھلکیوں کی ادبی قیمت بھی اس لحاظ سے ہے کہ ان سے اس عظیم ادیب کی شخصیت کا تعارف ہوتا ہے۔ انسان ہونے کے زاویے سے بھی وہ شخص کتنا بڑا، کتنا عظیم تھا یہی بتانا اس کتاب کا مقصد ہے۔ اور یہ بتانے کا حق جتنا مجھے ہے اتنا اور کسی کو نہیں کیونکہ انہیں کے لفظوں میں ہم دونوں 'ایک ہی ناؤ کے یاتری' تھے اور ہم نے ساتھ ساتھ ہی زندگی کے سب طوفانوں کو جھیلا تھا دکھ میں اور سکھ میں' میں ہمیشہ ان کے ساتھ ان کے پہلو میں تھی۔ آدمی کی پہچان تکلیف کے بھنور میں پڑکر ہی ہوتی ہے اور چونکہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ان تکلیفوں سے لڑے ساتھ ساتھ روئے اور ہنسے اسی لیے مجھے ان کی عظمت کا تھوڑا سا اندازہ لگانے کا موقع ملا۔

ان کے ساتھ' اور ان کے ان گنت پریمیوں کے ساتھ یہ میری بے وفائی ہوتی اگر میں بحیثیت انسان کے ان کا تھوڑا سا تعارف نہ کراتی۔ مجھے یقین ہے یہ کتاب ادبی ناقدوں کو بھی پریم چند کی تصانیف کے سمجھنے میں مدد دے گی کیونکہ ان کی آدمیت کی چھاپ ان کی ایک ایک سطر اور ایک ایک حرف پر ہے۔

کتاب کے لکھنے میں میں نے صرف ایک بات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا ہے اور وہ ہے ایمانداری' سچائی' واقعات جیسے جیسے یاد آتے گئے میں انھیں لکھتی گئی ہوں۔ انھیں سنوارنے کا نہ مجھے وقت تھا نہ حوصلہ۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہیں کہیں پہلے کے واقعات بعد میں اور بعد کے پہلے آ گئے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انجانے ہی میں میں نے کسی واقعے کا ذکر دوبارہ کر دیا ہو۔ ایسی بھولوں کو امید ہے پڑھنے والے نظر انداز کریں گے۔

ممکن ہے ادبیت کے بھوکے قارئین کو اس کتاب کو پڑھ کر کچھ ناامیدی ہو کیونکہ ادبیت میرے اندر

ہے ہی نہیں ۔ لیکن میری ایمانداری ان کے دلوں میں گھر کر لے گی یہ میں جانتی ہوں ۔ میں نے کسی بات کو بڑھا کر بیان کرنے کی کوشش نہیں کی ہے ۔ گوکہ تمیں سال سے زیادہ زندگی کے ہر سکھ ہر دکھ میں ان کی ساتھی ہونے کے ناطے میں جانتی ہوں کہ ان کی خوبیوں کا بکھان کرنے میں میں اگر تل کا تاڑ بھی بناتی تو بھی ان کے کردار کی بڑائی کا پڑھنے والوں کو پورا اندازہ نہ ہو پاتا ۔ لیکن میں نے تو سب ہی باتیں بغیر اپنی طرف سے کچھ بھی ملائے جوں کی توں کہہ دی ہیں ۔

شِوْرانی دیوی

حسن منظر

پیش لفظ

پریم چند، ان کا گھرانا، ان کا دور

''پریم چند گھر میں'' شورانی دیوی کے اپنے پتی کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی کتھا ہے۔ اس کے سوا اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ ویسا ہی ہے جیسا ایک عورت کو شادی کے بعد اپنے شوہر کی پچھلی زندگی کے بارے میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معلوم ہوتا جاتا ہے۔ کچھ خود شوہر کی زبانی' کچھ خاندان والوں کی زبانی۔ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے شورانی دیوی نے اعتراف کیا ہے کہ انھیں جو باتیں اپنے پتی کی یاد آتی گئیں وہ انھیں لکھتی گئیں۔ نہ انھوں نے کبھی یہ سوچا تھا کہ پتی ان سے پہلے چل بسیں گے نہ ہی وہ جس دن سے پریم کے گھر میں آئی تھیں اس نیت سے ان کے ساتھ گزرتے ہوئے دنوں کی یادداشتیں کاغذ پر محفوظ کرتی گئی تھیں کہ ایک دن اس کتاب کے لکھنے کا ناخوشگوار کام انھیں کرنا پڑے گا۔

پریم چند کا بھی ارادہ اس طرح سے شہرت حاصل کرنے کا نہیں تھا کہ وہ گاہے گاہے دوستوں اور اپنے مداحوں سے' جن میں بیوی کا نام بھی آتا ہے' اپنی زندگی کے بارے میں نوٹس لکھواتے رہتے کہ میرے بعد میری سوانح عمری مرتب کرنا۔ جتنی شہرت انھیں اپنی زندگی میں ملی تھی ان کے ادبی کام کا نتیجہ تھی۔ شہرت حاصل کرنے کی خواہش کا اس میں دخل نہیں تھا۔ نہ انھوں نے کوئی ڈائری اپنے پیچھے چھوڑی ہے نہ باضابطہ خودنوشت۔ ڈائریوں میں وہ کہانیوں کے لیے نوٹس کبھی کبھار لکھ لیتے تھے جیسا کہ ادیبوں میں سے اکثر کیا کرتے ہیں۔ ان کے خطوط میں البتہ زندگی کی مصروفیتوں' خواہشوں اور صدموں کی باتیں ہوتی تھیں جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ایک آدمی تھا جس نے اپنی زندگی کا کام باوجود اپنی مسلسل معاشی مشکلات اور طویل بیماری کے اپنے نصب العین کے مطابق پورا کیا اور خاموشی سے رخصت ہوگیا۔ لیکن وہ خط بھی شاید اس خواہش کے تحت نہیں لکھے گئے تھے کہ کبھی مرتب کیے جائیں گے۔

شورانی کا یہ اعتراف کہ واقعات کو صحیح ترتیب دینا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس سچائی کو اجاگر کرتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے بے ساختگی سے کہا گیا ہے' چنانچہ صداقت پر مبنی ہے۔ جو سچ نہیں تھا اُسے الفاظ کے بناؤ سنگھار اور بیان کی چترائی سے ڈھانک کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اور بیان کرنے والی ایک ایسی صاف گو عورت ہے جو شوہر سے اپنی کج بحثی کے واقعات تک نہیں چھپاتی ہے اس کی کجرویوں کو کیوں بخشنے لگی۔

یقیناً پریم چند نے جو کچھ شورانی سے یا ان کی موجودگی میں دوسروں سے کہا ہوگا انھی الفاظ میں نہیں ہوگا جن میں شورانی نے انھیں سپرد قلم کیا ہے۔ پریم چند ودوان تھے۔ ان کی گفتگو ان کے علم اور زبان پر ان کی قدرت کے مطابق ہوتی ہوگی۔ شورانی کے پاس ایک ایسی عورت کی زبان تھی جو کالج اور یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ جس کا سنسار صرف دو گھروں پر مشتمل تھا۔ اسی سنسار میں پہلے ماں باپ کے گھر میں اُسے تعلیم ملی تھی اور اُسی سنسار میں اس نے شوہر کے گھر میں ادبی ذوق حاصل کیا۔ شوہر اور بیوی کی ذہانت بھی ایک جیسی نہ تھی۔ پریم چند جب کسی ادبی' سماجی یا سیاسی موضوع پر شورانی سے بات کرتے تھے تو زبان سہل سے سہل رکھتے تھے۔ پھر بھی شورانی کی کتاب پڑھتے ہوئے یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ پریم چند کے الفاظ کچھ اور ہوں گے اور ان کا کہا پوری طرح سے اس تحریر میں نہیں آپایا ہے۔ صرف روزمرہ کی خوشیوں' غموں اور فکروں سے متعلق ان کے منہ سے جو کچھ بے اختیار نکلتا ہوگا' کہا جا سکتا ہے' وہ ان کی پتنی کو یاد رہا۔ اور یہی یاد رہ جانے والی باتوں کا خاصہ ہے۔ جس طرح اگر صبح اٹھ کر رات کے خواب کو لکھا جائے تو وہ اپنا بھیس بدل لیتا ہے اسی طرح عالمانہ گفتگو بھی بعد میں لکھی جانے پر کچھ کا کچھ بن جاتی ہے۔ بے ساختہ منہ سے نکلے ہوئے جملے عرصہ تک ہمارے کانوں میں جوں کے توں گونجتے رہتے ہیں۔ ایسے جملوں اور روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے سوا کتاب میں باقی جو کچھ ہے وہ پریم چند کے سماجی' سیاسی' مذہبی اور اخلاقی شعور کے خیالات ہیں لیکن انھیں بھی شورانی دیوی نے مکالموں کی صورت میں لکھنا پسند کیا۔ شاید یہی ان باتوں کو سنانے کا آسان طریقہ تھا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان مکالموں میں پورب کا محاورہ جگہ جگہ در آیا ہے اور پڑھنے میں لطف دیتا ہے۔ بیان میں بھی اکثر جگہ الفاظ اور محاورے اس دور کے ہیں جو پریم چند کا تھا' اب کم ہی سنائی دیتے ہیں اور بول چال کی زبان میں وقت کے ساتھ تبدیلی آجانے کا پتہ دیتے ہیں۔ ایسی ہی تبدیلی اردو میں دیکھنے میں آتی ہے۔

کتاب میں جہاں ایک ہی بات کو الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ دہرایا گیا ہے وہاں اس زاید جملے کو تحریر سے خارج کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے زیادہ زبان کی درستگی ہندی روزمرہ پر اثر انداز ہوتی اور اپنے اردو لباس میں بھی سادگی سے عاری لگتی۔

اگر یہ کتاب ۱۹۳۶ء کے اوائل میں شوہر کی تیزی سے گرتی ہوئی صحت کو دیکھتے ہوئے شورانی نے لکھ لی ہوتی اور اُسے پریم چند نے پڑھا ہوتا تو اغلب یہ ہے وہ اسے نہ چھپوانے کا مشورہ دیتے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شورانی کتاب کو ان سے بالا بالا ہی چھپوا لیتیں۔ قارئین کو یہ بات دونوں کی شخصیت کو پہچاننے میں شاید مدد دے گی پریم چند بیوی کی تحریر پر بے لاگ تبصرہ کر سکتے تھے لیکن اس معاملے میں اپنی رائے ان پر مسلط نہیں کرتے۔ شورانی بالعموم شوہر کی بات کو توجہ سے سنتی تھیں، اس پر بحث کرتی تھیں لیکن گھر سے باہر کے معاملات کو چھوڑ کر، کرتی وہی تھیں جو ان کی مرضی ہوتی تھی۔ پریم چند نے ان کی شخصیت کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے۔

> ''وہ اک نڈر، ہمت ور، مصالحت نا آشنا، پرخلوص خاتون ہیں۔ اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے والی، لیکن ضرورت سے زیادہ مضطرب مزاج، وہ عدم تعاون تحریک میں شریک ہوئیں اور جیل گئیں۔ میں ان کے ساتھ خوش ہوں۔ اس کی تمنا نہیں کرتا جو وہ نہیں دے سکتی ہیں۔ انھیں لچکا نہیں جا سکتا ہے چاہے وہ اس میں ٹوٹ ہی جائیں''

(اندرناتھ کے نام بمبئی سے ۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کا خط)

کسی کے بارے میں ایسی کتاب سے جسے ماسوا اس کے چند خطوط اور ایک ادھوری خودنوشت کے زیادہ تر یادداشتوں کے سہارے مرتب کیا گیا ہے یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ ماضی میں دور کے واقعات کی تعداد اور تفصیلات نزدیک کے دور کے واقعات اور ان کی تفصیلات کم ہوں گی۔ شورانی دیوی کو شادی کے شروع سالوں کی تفاصیل کم یاد تھیں، وہ نقوش وقت کے ساتھ دھندلے پڑ چکے تھے۔ بالکل آخری دنوں کے واقعات کی یادیں شدتِ جذبات اور ذہن میں تصویری وضاحت کے ساتھ ان کے دماغ پر مرتسم ہیں۔ حتیٰ کہ کتاب کے آخری چند صفحات میں ہمیں لگنے لگتا ہے کہ جیسے ہم بھی شورانی کے ساتھ کسی کی آخری سانسیں گن رہے ہیں۔ جب کتاب لکھی گئی ہے پریم چند کے انتقال کو بمشکل تین سال ہوئے تھے۔ واقعات کا تسلسل اس وقت تک شورانی کے ذہن میں دھندلا نہیں ہوا تھا۔

شورانی کی کتاب پر واقعات کو خلط ملط کرنے کا الزام بارہا لگایا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ تسلسل سے ایک خاص زمانے کے واقعات سناتے سناتے انھیں پچھلے دنوں کی کوئی بات یاد آ جاتی ہے اور وہ اسے بھی ربط نہ ہوتے ہوئے بھی سنا بیٹھتی ہیں اور بعض واقعات کو انھوں نے اپنے بیان میں دہرایا بھی ہے لیکن واقعات کو گڈمڈ کرنے کا الزام بے بنیاد ہے۔ جو ہوا ہے وہ بالارادہ نہیں ہوا

ہے۔ ''پریم چند گھر میں'' کوئی باضابطہ لکھی ہوئی سوانح عمری نہیں ہے جس کے لئے پہلے سے واقعات کو جمع کیا گیا ہو پھر انھیں ترتیب دیا گیا ہو اور ضروری معلومات کا ڈھانچہ تیار کر لینے کے بعد مصنفہ نے اس پر الفاظ کا گوشت پوست چڑھانے کا کام اپنے بیان کرنے کی صلاحیت کے مطابق انجام دیا ہو۔ شورانی دیوی نے یہ سب صعوبتیں نہیں اٹھائی ہیں۔ معلومات (Data) جمع کرنے اور ترتیب دینے کے لیے بڑے سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ شورانی دیوی اپنے بیانیے میں ہمہ تن جذبات ہیں۔ ایک درد سے پُر واقعے کو سناتے ہوئے ان کے خیالات کی رو اکثر جگہ انھیں کسی اور اس واقعے سے مماثلت رکھنے والے کسی دوسرے واقعے کے دور میں پہنچا دیتی ہے۔ اور جب وہ اس واقعہ کو بھی بیان کر چکی ہیں تو بجائے قاری کے براہ راست اپنے شوہر سے اس درد کو بیان کرنے لگتی ہیں جو دنیا سے جاتے ہوئے وہ انھیں دے گئے ہیں۔ اکثر ابواب کا یہ آخری حصہ ایک طرح کا نالہ وشیون بن جاتا ہے جسے محض اس وجہ سے بیان سے خارج کرنا کہ وہ کتاب کی ادبی روح کو مجروح کر رہا ہے مصنفہ کی اجازت کے بغیر بددیانتی ہوتا۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مکمل ہو جانے کے بعد یا تو شورانی نے کتاب کسی اور کو اس پر رائے دینے کے لئے نہیں دکھائی تھی کہ اس میں سے کیا رہنے دیا جائے اور کیا خارج کیا جائے یا پھر جنہوں نے پریس میں جانے سے پہلے کتاب پڑھی تھی انھوں نے اس کے آہ و بکاہ کے جملوں کو حذف کرنے کا مشورہ مصنفہ کو نہیں دیا تھا۔ شورانی کا غم اتھاہ تھا' ایک ایسے شخص کا غم تھا جس نے انھیں زندگی میں ہر قدم پر سہارا دیا تھا۔ ان کی ہر جائز و ناجائز بات کو پورا کیا تھا۔ جس نے ایسے سماج میں جو بیسویں صدی کے شروع میں سراسر مرد کے تفوق کا سماج تھا بیوی سے خدمت گار کا کام نہیں لیا تھا بلکہ درد ہونے پر اپنی بیوی کے پیر دبائے تھے اور نیند نہ آنے پر اس کے سر میں تیل لگایا تھا' جسے بیوی کے بغیر کہیں بھی جانا دوبھر ہوتا تھا اور جو جانتا تھا کہ عورت کی ذات کو کتنا خوشیوں سے محروم رکھا گیا ہے۔ وہ کسی بھی خوشی کو صرف مرد کا حق نہیں سمجھتے تھے۔

انیسویں صدی کا دوسرا نصف اور بیسویں صدی کا شروع کا زمانہ ہندو سماج میں نئی مذہبی اور سماجی تحریکوں کا زمانہ تھا۔ پریم چند نے اسی دور میں آنکھیں کھولی تھیں' اسی میں ان کا شعور پروان چڑھا تھا اور اپنے دور کی مثبت 'صحت مند' اصلاحات کو خواہ وہ مروج ہو چکی تھیں یا نہیں انھوں نے دوست جان کر اپنایا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر اور دوسرے بیدار مغز انسانوں کی طویل جدوجہد کے بعد حکومت بیوہ کی شادی کو قانونی درجہ دے چکی تھی لیکن اسے ٹھکرانے والوں کی تعداد نئے قانون کے ردِ عمل میں بجائے کم ہونے کے بڑھ گئی تھی۔ سوسائٹی بیوہ کے اس کے شوہر کے ساتھ آگ میں جلائے جانے کو تو برداشت کر سکتی تھی اور بقیہ عمر اسے نظر انداز کئے رکھنے کو بھی لیکن

زندگی میں اسے دوبارہ بحال کرنا اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ پریم چند کا شادی کا پہلا تجربہ تلخ تھا۔ وہ ان کی پسند کی شادی نہیں تھی' ان پر مسلط کی گئی تھی۔ ہر لحاظ سے ہندو سماج کے مطابق ہونے کی بنا پر وہ شادی درست تھی' لڑکی کنواری تھی اور اس کا باپ متمول۔ لڑکی کو دیکھ کر پہلے تو پریم چند کے باپ منشی عجائب لال نے اپنا سر پیٹ لیا تھا اور جب پریم چند نے اسے دیکھا تو ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ لڑکی صورت کی تو جیسی بھی تھی' عادات و خصلت میں وہ ایک تکلیف دہ عجوبہ تھی۔ چناں چہ وہ شادی باوجود سماج کی پسندیدگی کے ناکام رہی تھی۔

پریم چند نے جب دوسری شادی کا ارادہ کیا وہ سماج کی بیشتر رسوم سے برگشتہ ہو چکے تھے۔ دوسری شادی انھوں نے ایک بال ودھوا سے کی۔ یہ ان کی پسند کی شادی تھی نہ کہ سماج کی پسند کی۔ اور کامیاب رہی۔ ایسے شخص کی جو مناسب عمر کی بیوہ سے شادی کرنے کو عیب نہیں سمجھتا تھا اس کی وسیع النظری اور تصمیم فیصلہ کی بنا پر اس کی بیوی کیوں عزت نہ کرتی۔ شادی سے پہلے ہی شوہر نے اپنی اعلیٰ حوصلگی اور اپنے اخلاق کی بلندی کا بیج بیوی کے دماغ میں بو دیا تھا' اس سے پھوٹنے والا پودا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خدمت اور پاسداریٔ خاطر کی آبیاری سے پھلتا پھولتا رہا۔ ایسے شوہر کے لئے باقی زندگی اس کی بیوی کا نہ رونا اچنبھے کی بات ہوتی۔

پریم چند کو اپنی دادی اور ماں سے والہانہ پیار تھا۔ عورت کا تصور جوان دو اہم کرداروں سے ان کے ذہن میں مرتب ہوا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اپنی بیوی میں ایسے ہی کردار کو پانے کا خواہاں تھا۔ اس میں بچپن سے ذہنی اور جذباتی طور سے آگے نہ بڑھ پانے کے نفسیاتی عمل کو دخل نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے پریم چند نے بچپن اور لڑکپن ہی میں ان دو ہستیوں میں عورت کو اس رتبے پر دیکھ لیا تھا جو ان کے نزدیک عورت ذات کی تو کیا انسانیت کی معراج ہے۔ دادی شرابی شوہر کے ہاتھوں سے خاموشی سے پٹ لینے والی عورت تھیں۔ مجسمۂ صبر اور محبت' زبان پر حرف شکوہ نہ لانے والی۔ وہ عورت کے ظلم کا شکار بنے رہنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کی برداشت کو ضرور سراہتے تھے جس سے مرد کی درندگی تقابل میں اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

ماں خوبصورت تھیں' نرم مزاج' درگزر کرنے والی۔ ان کی آواز میٹھی تھی اور وہ کسی حد تک پڑھی لکھی بھی تھیں۔ انھیں تعلیم دینے سے بھی کسی قدر شغف تھا اور اسی طرح کا دوسروں کے کام بھی آتی تھیں۔ پریم چند کے ذہن میں ان کا تصور ہمیشہ ایثار اور خدمت کی دیوی کا رہا اور لگتا ہے وہ ہمیشہ ان ہی کی امیج (Image) میں ہے۔ ماں کی محبت کا پودا پریم چند کے دل میں پوری طرح سے پروان نہیں چڑھ سکا جو بڑھ کر اپنے سینچنے والے کو سایہ پہنچاتا۔ ماں کا انتقال پریم چند کی عمر کے آٹھویں سال میں ہو گیا تھا۔

پہلی بیوی جو پریم چند کو ملیں ماں کے تمام اوصاف سے مبّرا تھیں۔ پھوہڑ' دوسروں سے خدمت لینے والی' خود کسی کے لئے اپنے آرام کو قربان نہ کرنے والی' بدزبان اور توہمات میں گرفتار اور وہ سب کچھ جو ماں نہ تھیں۔ ان میں ہمیں ایک پری میٹو کردار نظر آتا ہے جو بعض اوقات' خودگرفتہ' ہوکر اردگرد کے ماحول سے کچھ دیر کے لئے کٹ جاتا ہے۔ اور اس کی حرکات اور منہ سے نکلنے والے الفاظ اور بے ربط جملوں کو پری میٹو شخصیت رکھنے والے ''اثر'' سے منسوب کرتے ہیں۔ پریم چند کی پہلی بیوی کے لیے بھی یہی سمجھا جاتا تھا کہ ان کو وقتاً فوقتاً ''اثر'' اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، ایک طرح کی طاقت' جس کی بنا پر انھیں خود بھی گمان تھا کہ بچ اس اثر کے بہت سے کام لے سکتی ہیں' مثلاً شوہر اگر دوری برتتے تو وہ اس اثر سے زور سے باندھ کر اپنے پاس کھینچ کر لے آسکتی ہیں۔ پریم چند کا دماغ' پری میٹو' دماغ نہیں تھا۔ ان کی فکر میں سوچنے سمجھنے کو دخل تھا توہمات کے لیے گنجائش نہ تھی۔ ایسے دماغ والے شخص کو کسی دوسرے کے اپنے میں ایسی مبہم طاقت کی موجودگی کے دعوے سے نفرت ہوتی ہوگی۔ اور تھی۔ ان کا افیون لینا اور جاہل عورتوں کے سے شغل پریم چند کی برداشت کے باہر تھے۔ وہ محبت جو پریم چند کو ماں سے ملی تھی وہ اسے بڑے ہونے کے بعد انھیں لوٹا لیتے لیکن یہ جذبہ ادھورا ہی رہ گیا۔ پہلی بیوی اس کے لائق نہ تھیں۔

دوسری بیوی کو وہ تمام محبت ملی جو پریم چند کی ماں کو اپنے بیٹے سے ملتی اور جس نے انھیں ایثار' خدمت اور بے لوث محبت کی دیوی بنا دیا۔ جو وہ شاید شادی کے وقت نہ تھیں۔ جو عقیدت پریم چند کو پہلے اپنی دادی' اور سب سے بڑھ کر ماں سے اور بعد میں دوسری بیوی سے ہوئی وہ عقیدت ہندوستان کی عورت کو ان کے افکار سے ملی۔

دوسری قسم کی جو اہم عورتیں پریم چند کی دنیا میں آئیں ان کی پروٹو ٹائپ ان کی چھوٹی تائی تھیں۔ مہاویر لال کی بیوی۔ یہ وہی مہاویر لال ہیں جنھوں نے اپنی دانست میں بہت سوچ سمجھ کر پریم چند کا نام نواب رکھا تھا۔ یہ نام دے کر انھوں نے ایک غریب گھرانے کے لڑکے کو بچ مچ نواب بنا دیا تھا۔ اس سے زیادہ ان کے ذہن کی اپج نہیں تھی۔

مہاویر لال سیدھے' سادے کسان آدمی تھے۔ جو اپنی ماں کی طرف داری میں شراب کے نشے میں دھت باپ سے ٹکر لے لیتے تھے۔ لیکن ان کی بیوی' پریم چند کی چھوٹی تائی' کی زبان شاید چھچھوندر کی طرح ہر وقت نیچی آواز میں چک چک کرتی رہتی ہوگی۔ وہ پورے گھرانے پر حاوی تھیں اور ان کی زبان کے مارے ہوئے سب ہی تھے۔ اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے پریم چند پر ایک روپے کی چوری کا الزام انھوں نے ان کے لڑکپن میں لگایا تھا۔ اپنی جٹھانی' یعنی پریم چند کی

بڑی تائی پر بیوہ ہونے کے بعد بدظنی کا الزام بھی انھوں نے لگایا تھا اور اس حد تک انھیں تنگ کیا کہ وہ گھر چھوڑ کر چنار چلی گئی تھیں۔ یہ کردار ایک تیز الزام تراش عورت کا تھا۔

اس دوسری قسم (کیٹیگوری) کی جو دوسری عورت پریم چند کی زندگی میں آئی وہ ان کی سوتیلی ماں تھیں۔ وہ ممتا، ایثار اور عفو کے جذبات سے ناآشنا تھیں۔ خدمت گزار نہ تھیں، خدمت طلب تھیں، پریم چند نے ساری زندگی اس عورت کو ماں نہیں کہا۔ چچی کہا۔

تیسرا بنیادی کردار جس سے پریم چند کو نفرت رہی وہ ان کی پہلی بیوی کا تھا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

پریم چند کے اپنے بارے میں کہے ہوئے چند جملوں کو ان سے متعلق ادب میں بہت ہوا دی گئی ہے۔ زندگی کے جس دور میں ان کی حیثیت کٹی ہوئی پتنگ کی سی تھی یعنی جب ماں مر چکی تھیں دادی ان سے دور تھیں بڑی بہن سگی اپنی سسرال میں تھی اور باپ کو اپنے سرکاری کام سے فرصت نہیں تھی گھر میں صرف سوتیلی ماں تھیں اور وہ نہیں جانتے تھے کس سے انھیں لگاؤ ہو۔ کس کے سامنے خود کو جواب دہ سمجھیں اور کس کی شفقت کا احساس انھیں خود کو ایک 'اچھا لڑکا' بنائے رکھنے پر مجبور کرے اس دور کے بارے میں مشرق اور بالخصوص اردو ہندی ادب کی پردہ پوشی کی روایت کو بھول کر ایک جگہ اپنے لئے وہ صاف دلی سے لکھ بیٹھے ہیں ''جس گھر میں میں تھا وہ ایک اہیرن کا تھا وہ بیوہ تھی۔ ان میں اور میری چاچی (سوتیلی ماں) میں کافی ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ میں بھی سنتا۔ مجھے ان کے ہنسی مذاق میں مزہ آتا۔ مجھے تیرہ سال کی عمر میں ہی ان باتوں کا علم ہو گیا تھا جو بچوں کے لئے قاتل ہیں''۔

اسی دور سے متعلق ایک جملہ امرت رائے نے لکھا ہے' بارہ تیرہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اسے سگریٹ بیڑی کا چسکا لگ چکا تھا اور ان باتوں کا علم ہو گیا تھا جو بچوں کے لئے مہلک ہیں۔

اس ایک جملے سے کہ ان باتوں کا علم پریم چند کو وقت سے پہلے ہو گیا تھا جو بچوں کے اخلاق کو سنورنے نہیں دیتیں ان کے کردار کے بارے میں بہت کچھ قیاس کر لیا گیا ہے کہ جب یہ باتیں انھیں کم عمری ہی میں پتہ چل گئی تھیں تو وہ ان پر عمل پیرا بھی ہوئے ہوں گے۔ پریم چند کو اپنے بارے میں یہ بات بتاتے ہوئے یہ ادراک نہیں تھا کہ بچے کی جنسی تربیت بہت کم عمری میں شروع ہو جاتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ تکمیل کو پہنچتی جاتی ہے۔ اگر ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے نہ ہوتا اور گھر میں آنے والی ایک بیوہ اہیرن (نیچ ذات) کی جگہ کوئی باعزت گھرانے کی بیوہ ہوتی تو بھی اس کا امکان ہے کہ اس میں اور ان کی سوتیلی ماں میں معنی خیز جنسی جملوں میں چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ بیوہ ہونے کی وجہ سے یقیناً اہیرن اگر جوان تھی منشی عجائب لال کی نو بیاہتا بیوی کے

جنسی تجربات سننے میں لطف آتا ہوگا اور تو بیا جتا کو اس ان پڑھ عورت کے تجربات اور جنسی معلومات کی وسعت پر حیرت بھی ہوتی ہوگی۔ اور ان باتوں میں جنسی تلذذ بھی ملتا ہوگا۔ جو ٹھیٹ گنوارو زبان میں کی جاتی ہوں گی۔ ان ملاقاتوں میں یوں بھی ہوتا ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے سے یہ باتیں کرید کرید کر پوچھتی ہوں گی کیونکہ جنس پر اس طرح کی گفتگو خود ایک جنسی تلذذ کا جنسی عمل ہے۔ ایک اہیرن ہی کیوں ایسے نچلے متوسط طبقے اور غریبوں کے محلے میں دوسری عورتیں بھی وقت ملنے پر ایک دوسرے کے گھروں میں بے ضرورت جھانکتی پھرتی ہیں۔ منشی عجائب لال باعزت آدمی تھے۔ ان کی بیوی ان کم عزت والے لوگوں کے گھروں میں نہیں جاتی ہوں گی۔ وہ عورتیں ہی ان کی غیر موجودگی میں اپنا دل بہلانے کو ان کے گھر آجاتی ہوں گی۔ ایسے ماحول میں بچوں کے کان بڑوں کی باتوں پر لگے رہتے ہیں بشرطیکہ ان باتوں میں محلے والوں اور رشتے داروں کی ذاتی زندگی کے راز کھل رہے ہوں اور نامکمل معنی سے پر جملوں میں جنسی اختلاط کا ذکر ہو۔ بڑوں کی دیا دھرم اور ملکی سیاست کی باتوں میں بچوں کو کم ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ محلے کی کون عورت یا لڑکی کس سے چھپ کر ملتی ہے اس بات کو پوری توجہ سے سمجھ میں نہ آنے کے باوجود بھی سب تجسس سے پر ہوشیار بچے توجہ سے سنتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے بڑوں سے جن کے بارے میں انھیں بوکھلا دینے والے سوال بھی کر بیٹھتے ہیں۔

پریم چند نے ان باتوں کا سننا اپنی عمر کے لحاظ سے مہلک سمجھا اور لگتا ہے اس کی ذمہ داری وہ سراسر اپنے ماحول پر ڈالتے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں یہ باتیں بڑے سے بڑے گھرانوں میں بھی بچوں کے کانوں میں پڑتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی اساتذہ (اور گھر کے نوکر) جن پر ان کے ماں باپ مکمل بھروسہ کرتے ہیں کہ اعلیٰ اخلاق کے دیوی دیوتا ہوں گے اور ان کے پاس ان کے بچے محفوظ رہیں گے وہی ان بچوں کو اولین درسِ جنس دیتے ہیں نہایت ہی نامہذب طریقوں سے جنسی باتیں کرنے کے لئے نہ ایک عورت کا ان پڑھ اور بیوہ ہونا شرط تھا نہ دوسری کا اپنے بڑی عمر کے شوہر کی دوسری کم عمر بیوی ہونا جوان باتوں کو سننے کی بھوکی ہو۔

اگر گھر میں چاچی اور اہیرن بیوہ کی صحبتیں نہ ہوتیں جن میں جنس کا ذکر استعاروں کنایوں میں بھی ہوتا ہوگا اور کبھی کبھی کھلم کھلا الفاظ میں بھی، اور گھر مکمل طور سے مدرسہ اخلاق ہوتا تو بھی یہ جملہ لکھتے وقت پریم چند بھول رہے ہیں گھر کی دیواروں اور صحن کے پیڑوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں، سڑکوں پر نکلنے والے، دودھ دینے والے جانوروں کے گلّے انھیں دوڑاتے ہوئے، سن کئے ہوئے بجار، معلمی کے یہ فرائض بہت پہلے سے کر رہے تھے کیونکہ زندگی کی درسگاہیں گلی کوچوں، گھروں، محلوں، گاؤں اور جنگلوں میں ہر جگہ ہمہ وقت کھلی ہیں۔

لیکن اگر کبھی منشی عجائب لال اپنی نو بیاہتا بیوی سے بے احتیاطی میں نزدیک ہو جاتے ہوں گے یا یہ بے احتیاطی گفتگو میں جھلک آتی ہوگی تو اس کا اثر پریم چند کے دماغ میں حسد کی آگ جلا دینے والا ہوتا ہوگا نہ کہ تلذذ کا باپ سے نفرت کہ انھوں نے وہ جگہ اس نئی عورت کو دے دی ہے جو مرنے کے بعد بھی میری ماں کی رہنی چاہئے تھی اور سوتیلی ماں سے حسد کہ وہ ماں کی جگہ لینے والی کون تھی۔ ویسے بھی سوتیلی ماں میں ایک بھی وصف ماں کا سا نہیں تھا۔ یہ پریم چند کا اعلیٰ ظرف تھا کہ انھوں نے باپ کے مرنے کے بعد بھی سوتیلی ماں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر ایسا کیا ہوتا تو انھیں غلط فہمی ہے کہ شاید ان کی اپنی پہلی بیوی سے نبھ جاتی کیونکہ سوتیلی ماں ہی انھیں اس بدنصیب عورت کے خلاف ابھارتی رہتی تھیں۔

اغلب یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو بھی یہ معاملہ ساتھ نبھانے سے زیادہ وہ آگے نہ بڑھتا۔ دونوں میں وہ رشتہ کبھی قائم نہ ہوتا جسے انھوں نے ایک غیر عورت میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اور جس کا ذکر انھوں نے شورانی دیوی سے بھی بطور اقرار جرم کیا ہے۔ وہ عورت پریم چند کی دوسری شادی کے بعد بھی کچھ عرصہ ان کی زندگی میں رہی لیکن اس وقت جب تک ان میں اور شورانی دیوی میں ذہنی دوری رہی۔ اس دور میں شورانی خود تھیں، بیلی اور اپنی ہستی کو مکمل طور سے اپنے پتی کی ہستی میں ضم کر دینے کی صلاحیت سے نا آشنا۔ جب وہ دوری ختم ہوگئی تو پریم چند کو کسی غیر عورت کا مصنوعی سہارا لینے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے بعد وہ اپنی بیوی کے لیے سراپا محبت تھے جن کے بغیر وہ کہیں دو دن بھی نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اتنی صراحت سے اپنی جنسی زندگی کا ذکر بیسویں صدی کے شروع کے ادیبوں میں تو کیا آخری نصف کے ادیبوں میں بھی کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

پریم چند نے اپنی Sexual Precocity قبل از وقت جنسی بلوغت کا ذکر ایک لحاظ سے ان معنوں میں کیا ہے کہ اگر ماں نہ مرتیں تو میں اس کم عمری میں نہ سگریٹ بیڑی پھونکتا نہ جنس کے سربستہ رازوں سے آگاہ ہوتا۔ یہ بیان اقرارِ جرم و گناہ سے زیادہ بیانِ حسرت ہے۔

ان کی جنس کی دوسری واردات زندگی کی ایک مادی ضرورت کا بیان ہے جو حقیقت میں ان کا احساس گناہ تھا اور جسے انھوں نے آخری دنوں میں (ایک بار پھر) شورانی دیوی کے سامنے بیان کر کے جیسے عفو کے چند کلمات سننے کی خواہش کی ہو جوان کے چھاتی کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا۔ لیکن ایسے موقع پر شورانی کا ردعمل وہ نہ تھا جس کی توقع پریم چند کو تھی۔ وہاں بھی شاید یہ احساس گناہ رہا ہوگا کہ اگر میں اپنی ذات میں اتنی ڈوبی ہوئی نہ ہوتی تو وہ مادی ضرورت خود ہی شادی کے بعد دم توڑ دیتی۔ شورانی کا جواب ایک روکھا سا ''مجھے معلوم ہے'' تھا۔

پریم چند کو اپنی ماں سے بے انتہا پیار رہا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے ایک ہی بیٹے تھے

اور بڑی منت مرادوں سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ پریم چند کو دیکھ کر جیتی تھیں اور وہی پریم چند کی کائنات کا محور تھیں۔ آٹھ سال ماں اور بیٹے کا ساتھ رہا اور ان آٹھ سالوں میں پریم چند کے پتا منشی عجائب لال بس شاید چھٹیاں ہی گزارنے گھر آتے تھے۔ ایک بار روپے کی چوری پر سزا دینے کے لیے انھوں نے پریم چند پر ہاتھ اٹھایا تھا کہ پریم چند نے رو رو کر گھر کو سر پر اٹھا لیا اور انھوں نے ڈر کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

ماں کے مرنے کے بعد پہلی بار پریم چند کو باپ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اور ظاہر ہے کہ اس میں اکبارگی وہ اپنائیت نہیں آسکتی تھی جو گزرے ہوئے آٹھ سالوں میں ساتھ رہنے سے پیدا ہوتی۔ اگر دونوں ساتھ رہے ہوتے تو بیٹا باپ پر اپنا حق سمجھتا' فرمائشیں کرتا' باہر کے دوروں میں ساتھ چلنے کی ضد کرتا لیکن اب پریم چند کو اپنے اور باپ کے درمیان ایک دوری کا احساس تھا جسے کم کرنے کے لیے نہ باپ کے پاس وقت تھا نہ بیٹے کے پاس الفاظ۔ بچپن میں اگر باپ کے ہاتھ اٹھانے پر انھوں نے بن مارے کی تو بہ کی تھی تو اس کے پیچھے یہ یقین ہی تھا کہ پٹنے پر ماں بچائے گی۔ اب بدلی ہوئی زندگی میں ایک اجنبی جیسے شخص کے ساتھ رہتے ہوئے غلطی کر بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی اور غلطی کر بیٹھنے پر پٹنے کا احساس قوی تھا جہاں بچانے والی ماں بھی نہ تھی۔ اور اگر یہ سب نہ بھی ہوتا تو یہ دھڑ کا تو ہمیشہ لگا رہتا ہوگا کہ اس خاموش رہنے والے شخص کو نجانے میری کون سی بات بری لگ جائے۔ مختصراً یہ کہ اتنے سال ساتھ نہ رہنے کے نتیجے میں پریم چند کے دل میں باپ کی طرف سے مغائرت کا پکا یقین تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ پریم چند کبھی اپنے باپ کو سمجھ نہیں پائے اور ہمیشہ اپنی ماں کے تصور میں جیے۔ انھوں نے اپنے باپ کے بارے میں جو کچھ کہا اور لکھا ہے وہ ایک ایسے لڑکے کے جذبات ہیں جو لڑکپن سے نوجوانی میں داخل ہو رہا ہے۔ باپ کی محبت کو صحیح طرح سے سمجھ نہیں پا رہا ہے اور چاہتا ہے اس کی محبت کی نوعیت بھی وہی ہو جو ماں کی تھی۔ پریم چند کے باپ کے کردار کو سمجھنے کے لیے خود ان کے باپ کے کردار کو سمجھنا ضروری ہے۔

پریم چند کے دادا گرسہائے لال ایرے سے لمہی پٹواری ہو کر آئے تھے۔ وہ ذات کے کائستھ تھے۔ نوکری پیشہ قلم چلانے والے۔ کائستھ کے دوسرے معنی ہیں بھگوان۔ لمہی میں وہ ایک معمولی آدمی یعنی پٹواری کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے۔ لیکن لگتا ہے کائستھ نام کی دونوں صفات ان کی سرشت میں تھیں کیونکہ انھوں نے بہت جلد نئی جگہ میں اپنے لیے مکان بھی بنوا لیا اور کچھ زمین پر بھی قابض ہو گئے بعد میں یہ زمین جو ۲۰ بیگھے تھی انھوں نے اپنے نمبر ۲ بیٹے مہاویر لال کے نام کر دی جوان کا سا معاملہ نہیں اور میار نہ سہی طاقت اور جسم کے لحاظ سے کھیتی باڑی کے لائق ضرور تھا۔

اگر باقی تین بیٹوں کو بھی زمینداری میں دلچسپی ہوتی تو گمان یہ ہے کہ باپ انھیں بھی اپنی چالبازیوں سے زمیندار بنا ڈالتے۔ لیکن گرسہائے لال کے چاروں بیٹوں کے حصّے میں نہ باپ کی عیاری آئی تھی' نہ طمع اور نہ ہی ان کی دوسری عادات۔ حیا کے معاملہ میں وہ چکنے گھڑے تھے۔ گرسہائے لال کے پاس نہ پیسے کی کمی تھی' نہ وقت کی۔ شراب وہ بے جگری سے پیتے تھے اور بے دردی سے بیوی کو مارتے تھے۔ ظاہر ہے گھر میں جو ادھم فساد وہ مچاتے ہوں گے وہ گھر سے باہر بھی سنائی دیتا ہوگا۔ دیکھا جائے تو ان کے چاروں بیٹوں کے کردار باپ کے کردار کے ردِ عمل میں وضع ہوئے تھے۔

بڑا بیٹا کولیشور خاموش طبع تھا۔ کچھ پڑھا لکھا تھا۔ ماں سے محبت کرتا تھا باپ کے ہاتھوں اسے پٹتے دیکھ سکتا تھا لیکن اس پر احتجاج نہیں کرسکتا تھا۔ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ڈاک منشی بنا' گھر سے باہر رہا ہوگا اور اس میں اس نے اپنی عافیت سمجھی ہوگی۔ ۳۰ برس کی عمر میں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔

دوسرا بیٹا مہاویر جسے باپ نے زمین دی تھی طاقت اور دماغ دونوں میں اجڈ دیہاتی تھا۔ باپ نے اسے اپنا جانشین بنایا تھا لیکن اس حقیقت نے اسے مصلحت کوش نہیں بنا دیا تھا جس کے لیے عقل درکار ہوتی ہے۔ جب باپ نشے میں ماں کو روئی کی طرح دھننے لگتا تھا تو اس کا بیل کا سا دماغ اور بیل ہی کا سا جسم دونوں حرکت میں آجاتے تھے اور وہ کھدیڑتا ہوا باپ کو گھر سے باہر لے جاتا تھا۔

تیسرا بیٹا عجائب لال۔ یعنی پریم چند کے والد۔ پڑھے لکھے آدمی تھے اور اسی بنا پر بڑے بھائی نے انھیں ڈاک منشی لگوا دیا تھا۔ اور یوں ایک عرصہ تک پریم چند کے نام کے ساتھ بھی منشی لگتا رہا۔ یہ بھی خاموش طبیعت انسان تھے لیکن انھیں دل اور جسم کا کمزور بتایا جاتا ہے۔ وہ بھی باپ کے ہاتھوں ماں کی درگت تو دیکھتے تھے جن سے انھیں پیار تھا لیکن انھوں نے کبھی اپنے باپ کو اس تہذیب سے گری ہوئی حرکت پر للکارا نہیں۔ ان کا کردار متحمل سے زیادہ مزاحمت نہ کرنے والا تھا جس کو اگر کبھی جائز طور سے بھی غصہ آجاتا تھا تو جلد ٹل جاتا تھا۔ اور اس کا تجربہ پریم چند کو بچپن سے تھا۔

گرسہائے لال کا چوتھا بیٹا اُدت نرائن لال بھی باپ کے سامنے منہ کھولتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ بھی پڑھا لکھا ہوگا کیونکہ اسے بھی سب سے بڑے بھائی نے ڈاک منشی لگوا دیا تھا۔ وہ بھی باقی تین بھائیوں سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ نوکری میں اس نے غبن کیا جیل گیا اور وہاں سے رہا ہونے کے بعد منہ چھپا کر کہیں نکل گیا۔

گرسہائے لال کی حرکات کا علم تمام رشتے داروں اور ملنے والوں کو ہوگا۔ پی کر ضبط کھو بیٹھنے والے

تشدد کا شکار بچے بھی رہے ہوں گے اور بیوی بھی تاعمر رہیں۔ گھر سے روز اٹھنے والا یہ قیامت کا شور گاؤں والوں کے کانوں میں بھی پڑتا ہوگا اُن میں گر سہائے لال کے بارے میں جو باتیں ہوتی ہوں گی وہ ان کے حساس بچوں کے ذہن پر بڑا تکلیف دہ اثر چھوڑتی ہوں گی۔ اس ماحول میں گزارہ صرف بیل جیسے دماغ و جسم والے مہاویر کا ہوسکتا تھا جس کا ردِّعمل باپ کی ان گالیوں اور مار پیٹ کے طوفان پر خود طیش میں آجانے کا ہوتا تھا اور جس کا اظہار وہ الفاظ میں کرتا بھی تھا اور جسمانی طور سے بھی۔ گاؤں والوں سے شرمندگی محسوس کرنے کا کھاتہ اس کے دماغ میں نہیں کھلا ہوا تھا۔

چھوٹے بیٹے اوّت نرائن لال کے ذہن میں باپ کے خلاف جو نفرت پل رہی تھی بالآخر وہ جرم کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس کا کردار مزاحمت نہ کرنے والا نہیں تھا۔ لیکن جو مزاحمت اس نے کی اس کا خمیازہ اس کے گھرانے کو اٹھانا پڑا' باپ کو نہیں۔

مہاویر اور اوّت نرائن کے برخلاف سب سے بڑے بیٹے کولیشور اور تیسرے بیٹے عجائب لال (پریم چند کے باپ) کے کردار حالات نے اس طرح تشکیل کیے تھے کہ ان کے حصے میں بردباری آئی جو ظلم کو دیکھنے اور اس پر خاموش رہنے کا دوسرا نام تھا۔ وہ دونوں خود بھی باپ کے سامنے خاموش رہنے کو سعادت مندی سمجھتے ہوں گے اور کمی والے بھی۔ باپ کی بے شرمی کی حرکات سے پیدا ہونے والی شرمندگی کے خلاف یہ دونوں کا ایک طرح کا نفسیاتی دفاع تھا۔ اس کے ادا دیکھا جائے تو کولیشور لال کا کردار ویسا ہی دبّو اور ادعائیت سے عاری تھی جیسا اکثر سخت مزاج ماں یا باپ کے پہلے بچے کا ہوتا ہے۔

شرابی باپ کے اخلاقی ضبط سے آزاد اور کھلے بندوں بے شرمی کی حرکات نے منشی عجائب لال کی شخصیت میں نہ بے ادعائیت کے بیج بوئے' نہ اکھڑ پنے کے اور نہ ہی جرم کے۔ ان کا جائزہ لاکھ ان الفاظ میں لیا گیا ہو کہ وہ دل اور جسم کے کمزور آدمی تھے لیکن اکثر جسم و جان سے کمزور انسانوں کی طرح ان کی شخصیت میں اصول پر ڈٹے رہنے کی طاقت تھی۔ ان کے اندر خوش خلقی' نرم مزاجی اور صلح جوئی اگر ماں کی طرف سے براہِ راست آئی تھی تو قناعت' مکر و فریب سے دوری' نظریں نیچی رکھ کر راہ چلنا' فیصلہ کرنے کے معاملات میں غیر جانبداری برتنا اور ناداروں کی مدد یہ سب گن ان میں باپ کے کردار کے ردِّعمل سے پیدا کیے تھے۔ ان کے کردار میں وہ سب جواہر ذاتی تھے جن سے ان کے باپ قلاش تھے اور باپ کے پاس جو حسن دولت تھا وہ ان کے حصے میں نہ آیا۔ کم گوئی اعلا کردار' مناسب تعلیم اور گورنمنٹ ملازمت نے انھیں اس سماج میں ایک توقیر بخشی تھی جو ان کے بھائیوں میں سے کسی کے حصے میں نہیں آئی۔

ایک بار ڈاک منشی بن جانے کے بعد منشی عجائب لال ہمیشہ اپنی نوکری سے مطمئن رہے۔ ان میں زیادہ کی تمنا نہیں تھی۔۔ نہ پٹواری بن کر زیادہ کمانے کی نہ زمینداری کی۔ وہ دس روپے ماہانہ پر بھرتی ہوئے تھے اور چالیس پر ریٹائر ہوئے۔ اس محدود آمدنی میں انھوں نے اپنے گھرانے کی بیواؤں کی مالی امداد بھی پابندی سے کی اور ان کی یتیم بچیوں کی شادیاں بھی کرائیں۔ رشتے داروں کو انھوں نے چٹھی رساں بھی بنوایا۔ وہ کنجوس آدمی یقیناً نہیں تھے۔

منشی عجائب لال تا عمر ایک وقف بکار کلرک رہے ۔ آخر عمر میں جب ان کے اعضا جواب دیتے جا رہے تھے اور کام بڑھ گیا تھا اور گورمنٹ انھیں ان کے بار بار درخواست دینے کے باوجود کوئی ایک اسسٹنٹ نہیں دے رہی تھی تو وہ اوقات کار کے علاوہ بھی کھانے پینے سے فارغ ہو کر دفتر میں جا کر کام کرنے بیٹھ جاتے تھے۔

عجائب لال کی پہلی شادی کس عمر میں ہوئی تھی یہ ہمیں نہیں معلوم لیکن اتنا معلوم ہے کہ اپنے باپ کی طرح انھوں نے کبھی اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور جب وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں اور جہاں جہاں انھیں تبادلوں کی وجہ سے رہنا پڑتا تھا وہاں کوئی ان کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہوا تو قیاس یہی کیا جا سکتا ہے کہ تنہائی کی وجہ سے انھوں نے پہلی بیوی کے انتقال کے دو سال بعد شادی کر لی۔ پریم چند کی عمر اس وقت دس سال تھی۔

عجائب لال نے اردو بخوبی پڑھی تھی فارسی تھوڑی بہت اور انگریزی کام چلاؤ۔ انھوں نے گیتا اور شاستر بھی پڑھے تھے لیکن بتایا یہی جاتا ہے مذہبی رسوم میں انھیں زیادہ اعتقاد نہیں تھا کہ ان میں ڈھونگ زیادہ ہے حقیقت اور عقیدت کم۔ وہ دھرم کا نام اخلاق سمجھتے تھے جس کے لیے وہ خود سماج میں پہچانے جاتے تھے۔

عجائب لال سڑیل شخص تھے۔ بیوی کی طرح سنگرہنی۔۔ اسہال۔۔۔ ان کی جان کو بھی تا عمر لگی رہی۔ اسہال سے غالباً مراد پیچش، ڈسنٹری ہے۔ جس کا اس زمانے میں کامیاب علاج نہ تھا اور جو تھا وہ جگر پر اثر انداز ہوتا تھا۔ یہی مرض ان کے بیٹے پریم چند کے حصے میں آیا۔ مائیں جو اپنی اولاد کے بارے میں ضرورت سے زیادہ فکرمند رہتی ہیں خاص طور سے وہ جن کے بچے نہ بچتے ہوں اور ایک ہی موت سے بچ پایا ہو اکثر اسے اپنی مسلسل فکر سے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں کہ اس کا سینہ یا پیٹ کمزور ہے اور اسے فلاں فلاں چیز ہضم نہیں ہوتی ہے یا اس کے سینے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پریم چند بھی لگتا ہے ایسا ہی کمزور پیٹ لیے بڑے ہوئے تھے جو یہ اور وہ ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ ماں اور باپ کے خود پیٹ کے مریض ہونے نے ان کی اپنے بارے میں اس تشخیص کو لگتا ہے

تقویت بخشی تھی۔ باقی کام امیبک انفیکشن کا تھا جو ممکن ہے ماں یا گھر کے کسی اور فرد سے لگا ہو۔ اس کا قوی امکان ہے کہ آخیر میں اس بیماری سے ان کا جگر بھی متاثر ہوا تھا۔

منشی عجائب لال جس سماج کے فرد تھے اس میں پی کر ہوش وحواس کھو بیٹھنا معیوب سہی تو ازن سے پینا معیوب فعل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد وہ باقاعدگی سے کام ختم ہو جانے پر روز شام کو پینے بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن پیتے ایک انداز سے تھے اور ایک انداز سے ہر کام کرنا یہی ان کی فطرت تھی۔ شاید زندگی کے آخری دور کی تنہائی اور مایوسی کا اس پینے میں بڑا دخل تھا۔

پریم چند کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے زیادہ زور اس کی تشکیل میں ان کی ماں کے کردار پر دیا گیا ہے اور اس کی کچھ ذمے داری پریم چند پر بھی آتی ہے۔ جو ماں کا ذکر براہ راست بھی تمام تر محبت اور عقیدت کے الفاظ میں کرتے ہیں اور وہی زبان ان کے ناولوں اور افسانوں میں ان کے کردار استعمال کرتے ہیں۔ ان کی بیوی کو اگر کسی ایسی عورت سے واسطہ پڑتا تھا جس کا شوہر یا بیٹا اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو تو اس کے بارے میں ان کی عدالت اس کا یک طرفہ فیصلہ کرتی تھی کہ سخت احسان ناشناس تھا۔

باپ کا جائزہ پریم چند نے ان الفاظ میں لیا ہے کہ میرے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا اور اس کی کمی وہ پیسہ دے کر پوری کرتے تھے۔ میں ان کے سامنے جاتا ہوا ڈرتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ خاموش طبع عجائب لال بیٹے کے لیے اپنی محبت کا اظہار الفاظ میں نہ کرتے ہوں گے۔ وہ کم الفاظ کے آدمی تھے اور پریم چند کی شخصیت کی تشکیل میں ان کی خاموش اثر اندازی پر کم توجہ دی گئی ہے۔ پریم چند نے اگر کبھی اپنی پہلی بیوی پر بھی ہاتھ نہیں اٹھایا جس کی کوئی ادا انھیں نہیں بھاتی تھی تو یہ وصف ان میں باپ سے آیا تھا۔ اخلاق کے معاملے میں دونوں ہی ایک جیسے تھے۔ دولت کی طمع، بے حیائی کے کاموں، خود سری اور لوگوں سے راز لیتے پھرنے سے باپ بیٹے دونوں ہی کو نفرت تھی۔ غیر ذمہ دار شخص کا خواہ وہ اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو پریم چند کو برداشت نہیں تھی۔ منشی عجائب لال نظم وضبط کے آدمی تھے۔ انھوں نے اگر کسی کی مدد کی تو اپنی آمدنی کی حدود میں رہ کر۔ لوگوں کی مدد کرنے کی خوبی پریم چند میں بھی آئی تھی۔ لیکن منشی عجائب لال ادیب نہیں تھے۔ پریم چند ادیب تھے۔ ایک بار اگر کسی کی مدد کرنے پر آجاتے تو یہ جذبہ انھیں بہا کر بھی لے جا سکتا تھا چاہے مدد کا طلب گار بہروپیا ہی کیوں نہ ہو۔

پریم چند کی والدہ مذہبی عورت تھیں اور حالات نے انھیں توہم پرست بھی بنا دیا تھا۔ وہ بیٹے کی نظر بھی اتروانی رہتی تھیں اور اس کے تین لڑکیوں کی پیٹھ پر پیدا ہونے کے برے اثرات سے خود بچنے

اور شوہر کو بچانے کے لیے پوجا پاٹھ بھی کراتی ہوں گی۔ اور دان دکشنا سے بھی کام لیتی ہوں گی۔ کم عمری میں ماں کے گزر جانے کی وجہ سے پریم چند کو ماں سے نہ ورثے میں مذہبی لگاؤ ملا نہ مذہبیت۔ ان کا اعتقاد بھی باپ کی طرح مذہبی رسومات میں نہ تھا۔

پریم چند اگر آخیر وقت تک مذہب کے بارے میں متذبذب رہے تو اس کی بڑی وجہ ان کا عہد ہے جس میں ایک طرف قدیم ہندومت تھا اور دوسری طرف پے بہ پے ابھرنے والی نئی مذہبی تحریکیں۔

> "مغربی فکر اور تہذیب کے اثرات بھارت میں واضح طور سے رونما ہونے کے بعد جو اولین مذہبی تحریکیں وہاں ابھریں وہ عقائد اور رسوم میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی شدید خواہش پر مبنی تھیں اور جو بیک وقت مذہبی اور سماجی سدھار کی صدق دل سے طالب تھیں۔ بعد میں جو تنظیمیں ان تحریکوں سے ابھریں ان میں بھی یہی روح کارفرما تھی۔ مورتیوں اور متفرق دیوتاؤں کی پوجا اور ذات پات کی تقسیم کے خلاف جہاد ان تحریکوں یا تنظیموں کی اقدار مشترک تھیں اور ان میں سے کسی بھی تنظیم کے لیڈر نے دیا گیا تسلیم نہیں کی۔"

Modern Religious Movements In India "J N Farquhar "The Macmillan Company"1915Newyork

منشی عجائب لال کی پیدائش غالباً ۱۸۴۰ء کی تھی اور انھوں نے ۵۶ سال عمر پائی۔ پریم چند کا دور ۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء ہے۔ اتفاق تھا انھوں نے بھی اتنی ہی عمر پائی جتنی ان کے باپ کی تھی۔ پُرزور مذہبی اور سماجی اصلاحات کا دور اندازاً ۱۸۲۸ء سے ۱۹۱۳ء تک پھیلا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کا دوسرا نصف دھرم اور سماج میں مثبت تبدیلیاں لانے کی کوششوں کا دور ہے۔ وہ جو پڑھے لکھے تھے اور جو اپنے سماج کا مقابلہ مغربی دنیا سے کر سکتے تھے انھیں اپنے سماج اور دھرم کی مروجہ برائیوں کا احساس ہو چلا تھا اور ان کوششوں سے بالآخر اعتقادات رسوم رواج اور عبادت کے طریقوں میں تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ ان اصلاح کی تحریکوں نے تین رخ اختیار کیے۔ (۱) وہ جو مغربی خیالات سے متاثر تھے اور مکمل تبدیلی چاہتے تھے۔ (۲) اس گروہ کے خیالات کے ردعمل میں پیدا ہونے والے گروہ جو ماضی کی رسومات (اور توہمات) کے نہ صرف گرویدہ تھے بلکہ شدت سے اس کے پرچارک بھی تھے۔ پرانے مستند مذاہب کی جڑیں ہندوستان میں مضبوط تھیں اور اس کی بنا پر یہ لوگ اپنی رجعت پرستی میں انتہا پسند تھے۔ اور نمبر ۳۔ ان دو کے درمیان جو میانہ رو تھے ان سے بھی نئی تحریکیں ابھریں۔ ایک خدا میں اعتقاد کی تنظیم کی بنیاد راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۸ء میں ڈالی تھی

اور یہ وہ آواز تھی جو غالباً اس دور کے پڑھے لکھے بیدار مغز لوگوں کے حلقے میں پہلے سے ہی گونج رہی تھی۔ جو عمارت اس تنظیم (برہما سماج) کی عبادت کے لیے وقف کی گئی تھی اس میں تمام انسان ایک ایشور کی پوجا کے لیے جمع ہو سکتے تھے لیکن شبیہ اور مورتیوں کے لیے اس میں جگہ نہیں تھی نہ ہی رسومات کی ادائیگی کے لیے۔ یہ گروپ کسی قسم کی فرقہ بندی کو تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن اس کو کیا کہیے کہ راجہ رام موہن رائے خود کو صرف ہندو سمجھتے رہے کہ انہوں نے کسی نئے مذہبی فرقہ کی بنیاد نہیں ڈالی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ اس عبادت گھر میں صرف راسخ العقیدہ برہمن وید پڑھتے تھے اور غیر برہمنوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اور بوالعجبی یہ تھی کہ ذات پات سے مبرّی اس تحریک کے روحِ رواں راجہ صاحب نے تا عمر برہمنوں کے زنار کو گلے سے جدا نہیں کیا۔

رام موہن رائے کے بعد مذہبی فکر نے کتنی ہی شکلیں بدلیں۔ مثلاً یہ کہ وید آسمانی صحیفے ہیں اور ان پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہ استدلال سے کام لے کر ویدوں کے متن کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے۔ ایک موقع پر ویدوں کی تعلیم کے مقابلے میں The Ism کو اپنایا گیا یعنی ایک دیوتا کے ہونے میں اعتقاد (ایشور) جس کا انکشاف انسان کو فطری قوتوں سے بالاتر طریقوں سے ہوتا ہے اور جو (ایشور) اپنی تمام مخلوق سے ذاتی تعلق رکھتا ہے۔ بعد میں وہ تحریک بھی ابھری جو بھارت ورش کے ماضی اور اس کے صحیفوں سے فیضان کی طالب تھی اور اس کے دستور العمل کا نعرہ تھا ویدوں کی تعلیم کی طرف لوٹ چلو۔ سوسائٹی کو ویدوں کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالو ویدوں کے بعد کی تمام اصلاحات غلط ہیں۔ ویدوں کے بارے میں ایک تصور یہ بھی تھا کہ ہر موڈرن تھیوری کو ویدوں میں ڈھونڈا جا سکتا ہے اور استدلال سے دور گروپ کے حامیوں کا یہی دعویٰ تھا کہ اس کے رہبر نے سچائی کو جس طرح بیان کیا ہے وہ اسی طرح ویدوں میں موجود ہے۔

یہ تمام ادوار اس لحاظ سے دلچسپ ہیں کہ ایک نظریے کو لے کر ایک نیا گروپ ابھرتا تھا اپنے معتقدین کو فکری آزادی کا مژدہ سناتا تھا اور جب معتقدین اس نئی فکر کے تحت عوام میں بیداری پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے نظر آتے تھے تو پورے گروہ کے روشن خیالی کی طرف چل پڑتے تھے یا ابھرتے ہوئے داعی کو اپنی تحریک سے خارج کر دیتے تھے۔

لیکن ان تمام فکری گروہوں میں جو باتیں مشترک تھیں وہ تھیں ایک ایشور میں اعتقاد، مورتی پوجا اور دیوتاؤں کی بہتات کے لیے عقیدے میں گنجائش کا نہ ہونا، پجاریوں اور تاسف اور عبادت پر زور لیکن کسی بھی گروہ کے معتقد خود کو ہندو مت سے باہر نہیں سمجھتے تھے نہ ہی اپنی تحریک کو ہندو مت سے علیحدہ کوئی چیز۔ ان میں سے جو ترقی پسند تحریکیں تھیں انھوں نے سدا مذہبی اعتقادات کو عقل کی

کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی اور مذہبی رسومات سے بیزاری کا اظہار کیا۔ ترقی پسند تحریکوں کی واضح کامیابیوں میں بیواؤں کی شادی، لڑکیوں کی کمسنی میں شادی پر پابندی، ایک مرد کی کئی کئی شادیوں پر بندش، پردے کا خاتمہ، عورتوں کی تعلیم، عورتوں کو بھی تحریک کا ممبر بنانے کی اجازت، ذات پات کی سختی میں کمی، ان کے افراد کا ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا، مختلف ذات والوں کے درمیان شادیاں، اعلیٰ تعلیم پر زور اور اعتقاد میں یہ کہ بغیر ذات کھوئے سمندر پار کا سفر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ تمام کامیابیاں اصلاح پسندوں کے ہاتھ ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے نہیں آئیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ تحریک جب اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتی نظر آتی تھی تو اس کے بانی کو احساس ہونے لگتا تھا کہ وہ اپنے خیالات اور عمل کی رو میں بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اتنی آزاد خیالی کے وہ دل سے قائل نہیں تھے یا انہیں بہت بعد میں پتہ چلتا تھا۔ اس وقت انہیں اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے ایک حد تک قائل تھے۔ ان کے کالج یونیورسٹی جانے کے حق میں نہیں تھے اور نہ ہی لڑکیوں کی آزادی سے ملنے جلنے کے۔ حقیقت میں وہ دل سے پردے کے مکمل طور سے ختم ہو جانے کے حق میں بھی نہیں تھے۔

پریم چند کے پتا کے دور ہی میں وہ تحریک ابھری تھی جس کے ممبر سوسائٹی کو ویدوں کی تعلیم کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے اور ان کے پروگرام میں ہندوستان کو قوم اور مذہب کے اعتبار سے ایک بنانا تھا۔ اس تحریک کا زیادہ زور موجودہ اتر پردیش اور پنجاب کے علاقوں میں تھا۔ یہ تحریک مغربی خیالات اور استدلال سے دور تھی اس لیے عوام میں اسے غیر معمولی مقبولیت بھی ملی جس کی اکثریت تعلیم سے محروم اور اوہام پرست تھی اور جسے غور و فکر کرنے سے دور رہنے کی تلقین صدیوں سے کی گئی تھی کہ ان سے انسان دھرم سے بھٹکتا ہے۔

یہ تمام تحریکیں اپنے ارتقا میں اپنے پیچھے سماج میں مثبت قدریں بھی چھوڑ جاتی تھیں اور تشدد پسند گروہ بھی۔ ان کے افکار ایک ساتھ سماج میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتے تھے۔ تحریک کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی وہ مٹ نہیں جاتے تھے بلکہ وقفے وقفے سے اکثر بدلی ہوئی شکل میں سر ابھارتے رہتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں وہ فکر (رام کرشنا پرم ہنس ۱۸۸۶_۱۸۳۶ء) ابھر رہی تھی جو سماج کی بہبودی اور مذہبی عقائد کی درستگی کے لیے قدیم مشرقی اور جدید مغربی افکار سے اتصال کو اہمیت دے رہی تھی اور جو تمام مذاہب کے اندر صداقت موجود ہے کی قائل تھی اور عبادت کے طریقوں میں بھی انھوں نے ہندومت، اسلام اور عیسائیت کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا۔ شاید یہی تحریک

سب سے روشن خیال تھی۔ یہی دور غشی جو اب اس کی ذہنی پرواز کا تھا اور ان ہی (کیلا اینڈ سانپ) بدلتے ہوئے مذہبی رجحانات نے شاید انھیں مذہبی رسومات سے بیزار کیا تھا اور ان ہی تغیر پذیر رجحانات نے پریم چند کے ذہن کی آبیاری کی تھی۔ ان کے انداز فکر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ اگر ماں کا ساتھ انھیں جوان ہونے تک میسر رہا ہوتا تو وہ نظر کا ٹیکہ، جھاڑ پھونک اور اپنے مقصد کے لیے بھگوان کو راضی کرنے کی دنیا سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔

یہ حقیقت ہے کہ ان تمام تحریکوں کی شدت قدروں کا پریم چند پر اثر ہوا تھا لیکن کسی ایک تحریک نے بھی اپنا تنہا نشان ان پر نہیں چھوڑا کیونکہ گھر کے ماحول سے لڑکپن ہی میں کٹ جانے کے بعد اور تعلیمی دنیا میں پہنچ کر خود تلاش کرنے نے انھیں بیدار مغز بنا دیا تھا۔ وہ تمام مذاہب کی عظمت کے بھی قائل تھے اور اس کے لیے ذہنی کشادگی اور تعصب سے دوری کو ضروری سمجھتے تھے۔ ذہنی تحریکوں کا اوپر ذکر ہوا ہے ان کی بوقلمونیت میں ان کے نزدیک ایک ہی حقیقت روشن تھی کہ اصل چیز ہے انسان کا اس طور سے سدھار کہ وہ اپنی ذات پر غربت کی وجہ سے تمام عمر ظلم جھیلتے نہ گزارے اور ہندوستان کے بارے میں ان کا یہ یقین کہ اگر اس میں بسنے والوں کی تعلیم سے کایا پلٹ ہو جائے تو ان کے پاس ماضی کی تہذیب اور تمدن کا وہ ورثہ ہے جس کی مدد سے وہ دوسرے والوں کو بھی روحانی بالیدگی کی راہ دکھا سکتے ہیں اور اسی یقین میں ہو یہ ان کی نظر ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھی ان کو اپنے ملک اور اس کے عوام سے محبت نظر آتی ہے۔ اور چونکہ عوام کی بڑی تعداد کسانوں اور غریبوں پر مشتمل تھی اور وہ خود ان ہی کے درمیان پل کر بڑے ہوئے تھے اس لیے آبادی کا یہی حصہ ان کے پیدا کیے ہوئے ادب کے بڑے حصے کو محیط کیے ہوئے ہے۔

پریم چند کے بارے میں یہ کہنا کہ کسانوں سے ان کی محبت جذباتیت پر مبنی تھی اور دیہاتی زندگی سے ان کو واسطہ کم ہی تھا غیر ضروری تنقید کرنے والوں کی ان کی زندگی سے ناواقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موسموں کے بدلنے کا بیان اور ان کے ساتھ ابھرتی لہلہاتی کھیتیوں کا ذکر جن سے کسانوں کی امیدیں اور خوشیاں وابستہ ہوتی ہیں اور پھر کٹنے کے بعد فصلوں کا اپنے بونے والوں سے آنکھیں چرا کر ان سے چھننا جنھوں نے ان کے لیے پسینہ بہایا تھا اور جو اپنے ہاتھوں جیسے ان میں اگے پیدا کیے تھے۔ ان پیچیدہ بنتے بگڑتے جذبات کا اظہار صرف جب ہی ممکن تھا جب کسی نے آنکھیں ہی کھیتی باڑی کے ماحول میں کھولی ہوں، اسکول اور شہر کو راستہ بجائے سڑکوں کے کھیتوں کے بیچ کی پگڈنڈیوں سے چنا ہو، تازہ توڑے ہوئے مٹر اور بوٹ (کچے چنے) کو چکھا ہو، دیہات کی عورتوں کے گیت بچپن سے لے کر بڑھاپے تک سنے ہوں اور ان میں تصنع سے عاری سچے کی باتوں کو بوجھا ہو جو بڑی سے بڑی شاعری میں بھی ڈھونڈے نہیں ملتیں۔ وہ بھی کو گھر کہتے

تھے اور بنارس ان کے لیے شہر تھا جیسے سب اور شہر ہوتے ہیں۔ لمہی میں انھوں نے گھر کے دروازے پر بیٹھ کر کسانوں اور دیہاتیوں سے دائمی قرض، غربت اور وطن کی آزادی کے مسائل پر گفتگو کی تھی اور اکثر ان کی گھریلو مشکلات کو بھی سلجھایا تھا۔ وہ اسکول ماسٹر تھے اور اسکول ماسٹری چھوڑ کر یہی ماحول ان کا اصلی اسکول بن گیا تھا جہاں وہ کسانوں سے کچھ سیکھتے تھے، کچھ انھیں سکھاتے تھے اور جب ۱۹۲۲ میں گاندھی جی نے اپنے انقلابی پروگرام کی ناکامی کے بعد گرام سدھار کے اصلاحی کام کا نعرہ بلند کیا جس میں چرخے سے سوت کاتنا اور اپنے تن کے لیے خود کھادی بنانا تھا نہ کہ غیر ملکی کپڑے سے تن ڈھانپنا تو پریم چند بھی اس چرخے کی مہم میں دیہات والوں کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔ وہ لمہی کو گھر کہتے تھے جہاں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ بنارس جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی نوکری کی تھی پریس کھولا تھا اور آخری بیماری کی گھڑیاں گزاری تھیں ان کے لیے شہر تھا۔ وہ آخری دنوں میں بھی بیوی سے یہی کہتے رہے۔ "گھر چلو۔ دیہات کی سب چل رہی ہو" جیسے ایک بچہ بیمار پڑ جانے پر اپنی ماں کی گود کے لیے بلک رہا ہو۔ کھیتوں کی وہ فضا آخری دم تک انھیں اپنے پاس بلاتی رہی۔

عملی طور سے پریم چند کبھی مذہب کو نہیں چھوڑ سکے۔ ہاں ان کے یہاں وہ اپنی قرار یافتہ شکلوں میں سے کسی ایک میں نظر نہیں آتا۔ پریم چند کا دھرم انسان کا دکھ پہچاننا اور اسے دور کرنے کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کرنا تھا جو جائز ہو۔ اس میں دھرم کا وہ انبہ بھی شامل ہے جو ان سے پوچھتا تھا بھگوان کہاں ہے؟ یقین نہیں آتا کہ اگر ہے تو اسے انسان کو تکلیف دینے میں کیا مزہ آتا ہے؟ اور دھرم کو اپنے ظاہر کرنے کی وہ شکل بھی جس کا کام سیاسی شعور اور عمل سے سماج کو انسان کے لیے بہتر بناتا ہے۔ ایشور کی کھوج ان میں کبھی کبھی ابھرتی تھی اور آخیر تک قائم رہی۔ غریب اور حقوق سے محروم انسان کو ظلم سے نجات دلانے کی جنگ میں ساری زندگی باز رہ بلکہ شریک رہے۔ صرف ان کا قلم ان کے لیے ان کا تیر تھا جسے انھوں نے خود سے کبھی جدا نہیں کیا۔

پریم چند کے سیاسی خیالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو مجموعی تاثر وہی مرتب ہوگا جو ان کے مذہبی عقیدے کے بارے میں بنتا ہے۔ اس میدان میں بھی تا عمر ایک ہی عقیدے کی عائد کردہ پابندیاں سہنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ کسی خاص مربوط تکنیک سے عاری نظامِ فکر (ازم) نے انھیں اس طرح گرفتار نہیں کیا کہ چاہے اس کے اثرات بعد میں غلط ثابت ہو رہے ہوں لیکن وہ اس سے چپکے رہتے۔ یوں پریم چند کو بڑا اچھا زمانہ ملا تھا کہ وہ جس ملک میں رہ رہے تھے اس کی بڑی آبادی کے سامنے جینے کا ایک مقصد تھا اور حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ تعلیم کو عام کرنے اور غریبی کو دور کرنے جیسے مقاصد کی فہرست میں آزادی کا حصول سب سے اوپر تھا۔ پریم چند نے خود

کو اس مقصد سے سدا وابستہ رکھا۔ جس سوسائٹی میں صرف مالی آسودگی اور تن آسانی ہو اور انھی کے لیے ساری جدو جہد اس کے ادیب بسا اوقات اپنی فکر میں وہ خصوصیت پیدا کر لیتے ہیں جو ایک بڑی تصویر کا کل انھیں دیکھنے نہیں دیتی اور ان کی نظر اس بڑی زندگی کے ایک غیر اہم نکتے پر ان کی فکر کو مرکوز کر دیتی ہے یہ ایک طرح کی مریض ذہنیت Schizoid ہوتی ہے۔ پریم چند کو زندگی کی کُل تصویر میں دلچسپی تھی اور وہ غیر اہم نکتہ جس پر ان کی فکر مرکوز ہوتی ان کے لیے خود ان کی ذات بھی نہ بن سکی۔

انگریزوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں آزادی کی تحریکیں کسی نہ کسی شکل میں اٹھارویں صدی کے آخیر ہی میں رونما ہونے لگی تھیں۔ آزادی سے محبت ان تحریکوں کی قدر مشترک تھی۔ اس دور کے پڑھے لکھے باشعور ہندوستانیوں کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنا گھر چلانا وہ بھی جانتے ہیں صرف گوری اقوام والے ہی نہیں۔ ان کے سامنے برطانوی حکمرانوں کا لایا ہوا زمین کا وہ بندوبست بھی تھا جس سے زمینداروں کی دولت بڑھ گئی تھی لیکن کسانوں کی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ دیکھا جائے تو بعد میں ظاہر ہونے والی تمام سیاسی تحریکیں سماجی سدھار تحریکوں سے ابھری تھیں۔

پریم چند کی پیدائش ۱۸۸۰ کی تھی۔ ۱۸۸۵ وہ سال ہے جس میں چاہے ایلن اوکیٹوین ہیوم (بانی کانگریس) کی نیت کچھ بھی رہی ہو اس کی اور اس کے ہم خیالوں کی کوششوں سے انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی تھی جو شروع میں ہر لحاظ سے مراعات یافتہ اور امیر لوگوں کی انجمن تھی اور جس کا مقصد نوجوانوں کے ایک ایسے تعلیم یافتہ طبقے کو تیار کرنا تھا جو ملک کی اخلاقی، سماجی، سیاسی اور ذہنی حالت کو سنوارنے کا کام کرے۔ حقیقت میں برطانوی راج کو یہ احساس ۱۵ سال پہلے (۱۸۷۰ کا ایکٹ) سے ہو چکا تھا کہ اس کی سپیریئر سول سروس میں مقامی لوگوں کی شمولیت بہت کم ہے اور حکومت ہندوستانیوں کی ضرورتوں اور اندیشوں سے ناآگاہ ہے۔ ان کے خیال میں برطانوی حکومت جس ملک میں پہنچی تھی تا ابد قائم ہو گئی تھی اور کام صرف مقامی لوگوں کو اپنی مشینری کا ایک حصہ بنانے کا تھا ورنہ وہ سلطنت اتنی بڑی تھی کہ اگر صرف برطانیہ سے محدود مدت کے لیے آنے والے سول سروسز پر انحصار کیا جاتا تو سول سروس افسروں کے قحط کا شکار ہو جاتی۔

لیکن کانگریس میں بہت جلد ایسے بن بلائے مہمان بھی داخل ہو گئے جو سماجی مسائل سے آگاہ بھی تھے اور ان کے ذہن میں کچھ کچھ انہیں حل کرنے کا نقشہ بھی تھا۔

جب پریم چند کی عمر پچیس سال تھی اس وقت ۱۹۰۵ میں ہندوستانیوں پر یہ عقدہ کھلا کہ مغربی قوتیں جنھیں وہ ناقابل تسخیر سمجھتے تھے شرقی قوموں سے بھی شکست کھا سکتی ہیں۔ یہ سال روس پر جاپان

کی فتح کا تھا۔ اسی سال برٹش گورمنٹ سے تقسیم بنگال کی وہ فاش غلطی بھی ہوئی جس نے ہندوستان کی آزادی کی تمام تحریکوں کو یکجا کر دیا۔ کانگریس کے پیش نظر اس وقت اس کی توقعات کی شکست کے بیس سال تھے جن میں (کانگریس کی) ان تمام تجاویز کو حکومت نظر انداز کرتی رہی تھی جن کا مقصد نہ صرف سماج سدھار تھا بلکہ ہندوستانیوں کو ان کے جائز حقوق دلوانا بھی تھا۔ نتیجہ عوام کو برطانوی بیوروکریسی (دفتری حکومت) سے نفرت پیدا ہو نے لگی۔

دوسرا اہم دور پریم چند کی زندگی میں حکومت برطانیہ کا وہ تھا جب اسے پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ـ۱۹۱۸) کا سامنا کرنا پڑا اور اسی دوران دو اور تاریخی سانحا ت سہنے پڑے۔ پہلا ۱۹۱۶ء میں ترکوں سے جنگ کا تھا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو شدت سے مشتعل اور ہندو مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا اور دوسرا روس میں شہنشاہیت کا خاتمہ (۱۹۱۷ء) بعد میں سویت روس سے آنے والی پہلی خبروں میں ہندوستان کے ترقی یافتہ لوگوں نے دلچسپی لی اور یہ دلچسپی نہ صرف اکتوبر انقلاب کے قومی آزادی کے رول سے تھی۔ بلکہ اس کو ایسے نئے نظام کے پیامبر کی حیثیت سے خاص اہمیت دی گئی جو ہر طرح کے استحصال اور آدمی پر آدمی کے جبر و تشدد کو ختم کر دے گا۔ ۱۹۱۸ء میں رابندر ناتھ ٹیگور نے انقلابی روس کو " نئے دور کی سحر کی خبر دینے والا ستارۂ صبح " کہا تھا۔

روس میں اکتوبر کا انقلاب ہندوستان کے باشندوں کے لیے ایک نیا ذہنی انکشاف تھا کہ نہ صرف یہ کہ شہنشاہیت کا کہیں خاتمہ ہو سکتا ہے بلکہ اس کے جلو میں جیسا کہ اس وقت سمجھا جاتا تھا مزدوروں کسانوں کی حکومت بھی آ سکتی ہے۔

خود جنگ عظیم برطانوی حکمرانوں کے لیے باوجود فتح یابی کے ایک ناگوار تجربہ تھا۔ انھوں جنگ سے لوٹے والے ہندوستانی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے کہ یورپی ممالک میں کسان اور مزدور حکومت اور امراء کے غلام نہیں تھے۔ سماج میں ان کی بھی عزت تھی اور وہ اپنے کام کی اہمیت کے لحاظ سے پہچانے جاتے تھے۔ افریقہ سے لوٹنے والے ہندوستانی سپاہیوں اور غیر سپاہیوں نے وہاں بھی عوام کے گلوں میں جور اور استبداد کے طوق دیکھے تھے اور فاقہ اور محرومی۔ ان کی یہ بیداری حکومت کے لیے فال بد تھی۔

اگر ایک خاص مقصد کے لیے کانگریس ۱۸۸۵ء میں وجود میں آئی تھی اور وہ بعد میں ارتقا کی منازل سے گزر کر ہندوستان کی آزادی کی تحریک بن گئی تو ایک اور بے نام تحریک اسی زمانے میں اس سے ایک سال پہلے (۱۸۸۴ء) عالم وجود میں آ چکی تھی جس کا آغاز ن۔م۔لوکھنڈے نے بمبئی فیکٹری مزدوروں کی انجمن بنا کر کیا تھا۔ بعد میں اس کا ذکر شری پت امرت ڈانگے نے اپنی تصنیف

''ہندوستان میں ٹریڈ یونین تحریک کا آغاز'' میں یوں کیا ہے ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۸ء میں تلک اور ان کے پیرووں نے مغربی طرف کی ٹریڈ یونیوں کی تنظیم شروع کرنے اور ان کے مستقل کام کرنے کی ضمانت دینے کی اپیل کی تھی۔

کانگریس کا مطمحِ نظر ۱۸۸۵ء سے (۱۹۴۷ء تک) مسلسل وقت کے ساتھ بدلتا رہا اور یہی حال ان تمام تحریکوں کا تھا جو اس سے پھوٹیں۔ کانگریس سے متعدد بار جدا ہو جانے والے گروپ کبھی اعتدال پسند ہوتے تھے اور کبھی وہ جو تشدد کے طریقے آزمانا چاہتے تھے۔ خود کانگریس کسی مربوط سیاسی نظریے سے وابستہ نہیں تھی۔ اس کے کارکن اپنی پالیسی کو وقت کے مطابق بناتے تھے کہ کس کا ساتھ دینا ہے کس کا نہیں اور دنیا کے کسی بھی مسئلہ پر جس کا تعلق ہندوستان سے ہو کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔ تحریک خلافت کا ساتھ بھی اسی پالیسی کی غماز ہے جو شدید جذباتیت پر مبنی تھا۔ برٹش چیزوں (تیار شدہ مال) کا بائیکاٹ، سودیشی تحریک یعنی دیسی سامان استعمال کرو اور قومی تعلیم پر زور برطانوی حکومت کے خلاف وہ پہلے ہتھیار تھے جو کانگریس نے استعمال کیے تھے اور ان کا ذکر پریم چند کی تحریروں میں بار بار آیا ہے۔ سلطنت برطانیہ میں رہتے ہوئے آزادی کا نعرہ کتنے ہی مراحل سے گزر کر بالآخر مکمل آزادی کا نعرہ بنا۔ سوراج ملنے پر کیسی حکومت بنے گی شاید کانگریس کے کرتا دھرتاؤں کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہیں کلبلایا تھا۔

پریم چند کا اپنی سرشت اور ذہنی الجھاؤ کی بنا پر کسی ایسی تنظیم سے وابستہ ہونا جس کا منشور بالتخصیص مذہب ذات پات اور نسل کسانوں اور مزدوروں کی بہبود کے سوا اور کچھ ہونا ممکن تھا۔ ان کے اندر انسان بالخصوص ہندوستان کے انسان کے لیے ایک منشور تو۔ جو تنظیم جو سیاسی آواز ان کے اس منشور کو پورا کرنے میں مدد ہو سکتی تھی وہ اس کے گرویدہ ہو جاتے تھے اور جب وہ ان کی ڈگر سے انہیں ہٹتی نظر آتی تھی تو وہ اس پر نکتہ چینی بھی اسی فراخدلی سے کرتے تھے جیسے اس کی توصیف۔

ان سالوں میں جب آزادی کی تحریک فعال ہوئی پریم چند کی فکر اور شخصیت کا تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہونا لابد تھا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی طرح تواتر سے اپنی فکر کو بدلتے جاتے تھے جس طرح کانگریس کی عوام کے کانوں میں پڑنے والی آواز بدلتی جاتی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز پر انھوں نے برطانوی حکومت کا ساتھ بھی نہیں دیا۔ لیکن اس موقع پر وہ تشدد پسند گروہ کے بھی حامی نہ تھے۔ ان کی شخصیت اشتعال سے اس حد تک عاری تھی جتنی ایک عام سلجھے ہوئے دماغ کے آدمی کی ہو سکتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر بدلتے جانے والے انسان نہیں تھے۔

کانگریس تحریک کی سب سے اہم شخصیت یقیناً مہاتما گاندھی تھے جنھوں نے قومی تحریک کو ستیہ گرہ (سچائی کو مضبوطی سے تھامے رکھو) کی مہم پہلی بار اگست ۱۹۲۰ء میں چلائی تھی۔ یہ ان کا ناانصافی کے خلاف عدم تشدد اور عدم تعاون کا طریقۂ پیکار تھا۔

کانگریس کے شروع کا کردار مراعات یافتہ قوموں اور سرمایہ داروں کے مفادات کی حفاظت کرنے والی جماعت کا تھا کیونکہ وہی اس کے لیے سرمایہ بھی فراہم کرتے تھے۔ بعد میں جب گاندھی جی نے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لیا تو کانگریس کا یہ کردار بدلنے لگا۔ اب عوامی حیثیت سے کسان اور مزدور بھی برائے نام چندہ دے کر اس کے ممبر بننے لگے۔ اور انھوں نے اس کی عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریکوں میں حصہ لیا جیسا کہ نمک کے قانون کو توڑنے کے پیدل مارچ میں ہوا جب ان کے آشرم سے ان کے ساتھ ۸۰ مرد و عورت روانہ ہوئے تھے اور سمندر کے کنارے پہنچتے پہنچتے یہ قافلہ ہزاروں کا ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں مزدوروں کی تحریک کے آثار ۱۹۱۲ء سے نمودار ہونا شروع ہوئے تھے اور روس میں انقلاب کے بعد یہ تحریک دیگر ملکوں میں بھی نمایاں طور سے چلی کیونکہ ایک ملک میں اگر یہ تحریک شہنشاہیت کا تختہ الٹ کر حکومت مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں میں منتقل کر سکتی تھی تو یہ توقع بجا تھی کہ اس سے وہی کام ہندوستان میں بھی لیا جا سکتا ہے۔

ان دونوں تحریکوں سے پریم چند کا متاثر ہونا لازمی امر تھا لیکن یہ اثر بس اتنا ہی تھا جتنا ایک حقیقت پسند ادیب کا ہو سکتا ہے۔ ادب کی تاریخ میں کتنے ہی موقعوں پر یہ بارہا ہوا ہے کہ ایک ادیب نے کسی عوامی تحریک کا ساتھ نہ صرف ادیب کی حیثیت سے دیا ہے بلکہ اس کو اپنا کر بھی اور بعد میں کامیابی سے ہمکنار ہو کر جب وہ تحریک عوام کی تحریک نہ رہی تو اس سے کنارہ کشی بھی کر لی ہے۔ پریم چند کے نزدیک نہ کانگریس سے وابستگی حتمی تھی نہ کمیونسٹ تحریک سے۔ گاندھی جی سے انھیں عقیدت بھی رہی کیونکہ وہ پسماندہ طبقے کے بہترین رہنما بن کر ہندوستان کے سیاسی افق پر نمودار ہوئے تھے اور کسان ان میں اور خود میں نیم برہنگی اور پوست و استخوان کی ایک مماثلت دیکھتے تھے۔ ان کی اس عقیدت کا ذکر شیورانی دیوی نے بھی انھی کے الفاظ میں کیا ہے۔ لیکن وہ کس حد تک گاندھی مت کے پیرو تھے اس کا اندازہ پریم چند کی اپنی زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے گاندھی جی کی زندگی کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے کیونکہ عقیدت کسی شخص میں اپنی شخصیت کا عکس دیکھ کر بھی ہو سکتی ہے اور اس میں ان تمام آرزوؤں کی تکمیل دیکھ کر بھی جو وہ خود پوری نہ کر پایا ہو۔ یہ عقیدت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ آدرشی کردار ہماری توقعات پر پورا اترتا ہے۔ جب پورا نہ

اتر سے تو اس کی حیثیت اپنی جگہ سے نہ ہلنے والے بت کی رہ جاتی ہے اور ہم جانتے ہیں پریم چند
اپنی زندگی میں ایک سچے بت پرست کبھی نہیں رہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو کاٹھیاواڑ کے قصبے پور بندر کے ایک کھاتے پیتے
گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے دادا پور بندر کے وزیر اعظم رہ چکے تھے اور انھوں نے یہ
عہدہ اپنے بیٹے کرم چند کو سونپا تھا۔ موہن داس کے پتا کا ایک مکان پور بندر میں تھا، دوسرا راج
کوٹ میں اور تیسرا کتیانہ میں اور وہ گلے میں سونے کا ہار پہنتے تھے۔ موہن داس کے ایک بھائی کے
پاس خالص سونے کا بازو بند تھا۔ ان کی ماں پتلی بائی بغیر پوجا کیے ایک نوالہ منہ تک نہیں لے جاتی
تھیں۔ موہن داس نے بارہ سال کی عمر میں چھپ کر سگریٹ پینا سیکھ لیا تھا اور اپنی اس لت کو پورا
کرنے کے لیے وہ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے پیسے بھی چرایا کرتے تھے۔ لڑکپن میں ایک بار
خودکشی کی بھی کوشش کی تھی اور دوسرے لڑکوں جیسا طاقتور اور بڑے ڈیل ڈول والا بننے کی انھیں
شدید خواہش تھی جو بعد میں سیاسی طور سے بڑا اونچا ڈیل ڈول والا بننے کی شکل میں پوری ہوئی۔ ۱۳ سال
کی عمر میں ان کی شادی ۱۳ ہی سالہ کستوربائی سے کر دی گئی۔ انھوں نے لکھا ہے "مجھے میری بھابھی
نے سب کچھ بتا دیا تھا کہ شادی کی رات کو مجھے کس طرح کا برتاؤ کرنا ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ اسے
(کستوربائی کو) کس نے یہ سب کچھ سکھا دیا تھا۔"

بہت جلد موہن داس نے اپنی بیوی سے اپنے شوہر ہونے کا رعب جمانا شروع کر دیا مثلاً یہ کہ وہ ان
کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جا سکتی تھیں اور رات کو باہر جا کر گلی میں کھیلنے کی تو ہرگز ہی بالکل
اجازت نہیں تھی۔ اس میں خلل موہن داس کے اپنے گلی کے لڑکے لڑکیوں میں شامل نہ ہو سکنے کا بھی
تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رات کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کستوربائی کا حکم عدولی پر
دونوں میں کئی کئی دن بات چیت بند رہتی تھی۔ سوائے چھپ کر سگریٹ پینے کے یہاں تک پریم
چند اور موہن داس کرم چند گاندھی کی زندگی میں مماثلت کا پتہ لگانا دشوار ہے اور ان میں کہیں بھی وہ
علامتیں نہیں ملتی ہیں جن کی بنا پر ان سے دس سال چھوٹے پریم چند نے بعد میں انھیں اپنا مثالی کردار
بنایا ہو یا خود کو ان سے (Identify) شناخت کی ہو کہ ہاں میری عمر میں وہ بھی مجھ جیسے تھے۔
قد و قامت اور شکل و صورت کے لحاظ سے بھی دونوں میں قطبین کا فرق تھا۔ گاندھی جی اندھیرے
چوروں اور بھوتوں سے ڈرتے تھے۔ کمزوری کی یہ کمزوریاں ایک دیہاتی لڑکے میں جسے کھیتوں اور
باغوں میں گھومنے کی عادت ہو کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ہاں تھوڑا بڑا ہونے پر اگر کوئی چیز
گاندھی جی میں ۔۔۔ جنھیں پریم چند کا ہیرو سمجھا جاتا ہے ۔۔ اور پریم چند میں مشترک تھی تو وہ
دونوں کا ریاضی میں کمزور ہونا تھا۔ کس چیز نے پریم چند کو گاندھی جی کا گرویدہ بنایا اور کس بنا پر وہ

ان سے برگشتہ ہوتے اس کا ذکر اس بیان میں تھوڑی مہلت مانگتا ہے۔

موہن داس گاندھی قانون کی تعلیم کے لیے لندن ۱۸۸۸ میں (عمر ۱۹ سال) گئے تھے۔ وہاں ان کی وضع قطع ایک انگلش جنٹل مین کی تھی۔ انھوں نے ناچنا سیکھنا چاہا اس میں ان کے قدم پیانو کے ساتھ نہ دے سکے موسیقی سیکھنی چاہی لیکن یہ ان کے بس کا کام نہیں تھا اور انھوں نے جلد ہی وائلن کو بیچ دیا۔ کچھ عرصہ انھوں نے بے دینی میں گزارے۔ گوشت سے بچنے کے لیے بے مرچ مصالحے کی ترکاریاں پکانی سیکھیں اور ایک بائبل بیچنے والے کے اصرار پر بائبل پڑھنا شروع کی۔ ایسا لگتا ہے اس میں عہد عتیق کی (Ecclesiastes) (معلم) جسے حضرت سلیمانؑ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور عہد جدید کی کتابوں نے انھیں اس حد تک متاثر کیا کہ وہ زندگی میں پہلی بار بھگود گیتا (آسمانی گیت یا خدا کا گیت) پڑھنے پر آمادہ ہو گئے۔ جو بعد کے جیون میں ہمیشہ ان کی غم خوار رہی۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ایکلیسیا سٹیس میں ہوش مندی محنت اور خدا سے ڈرتے رہنے پر زور دیا گیا ہے۔ کتاب کی مجموعی فضا قنوطیت کی ہے اور انسان زندگی کی لایعنیت سے نقشے بھی اس میں کھینچے گئے ہیں۔

"غصے میں آ جانے کی جلد بازی مت کرو کیوں کہ بے وقوفوں کا سینہ غصے کی آرام گاہ ہے"۔

(معلم۔ باب ۷ آیت ۔ رواں ترجمہ)

یہ حیرت کی بات ہے کہ بائبل کا مطالعہ انھیں بھگودگی طرف لے گیا اور کردار میں انھوں نے بائبل سے مطابقت پیدا کر لی۔ بھگودگیتا کے لیے انسانی ہے زندگی کو رزم گاہ سمجھتی ہے اور جنگ کے موقع پر اسے ارجن نے شری کرشنا کے منہ سے سنا تھا۔ بائبل اور بدھ مت کی تعلیمات پر سکون دور کی تعلیمات ہیں اور رزم کی جگہ تسلیم اور فروتنی کا سبق سکھاتی ہے۔

بعد کے دنوں میں لندن میں قیام کے دوران وہ ہندو عقیدے کے تصور اہنسا۔ کسی کو تکلیف نہ دینا کسی پر ظلم نہ کرنا پر غور و فکر کرتے رہے جس کا مفہوم بالآخر ان کے ذہن میں عدم تشدد بن گیا۔ مغربی دنیا کے نزدیک یہ چیز Passive Resistance تھی۔ اور کے بغیر دوسرے کی جارحیت کو روکنا ہے۔ گاندھی جی نے ناانصافی کے خلاف اس تصور کو ستیہ گرہ کا نام دے کر ایک ہتھیار بنایا یا دوسرے لفظوں میں Truth Force یعنی سچائی کی طاقت۔ ستیہ گرہ کا مفہوم ہے سچائی کے ساتھ اپنے مقصد کے لیے ڈٹے رہو اور عملاً اس کا مطلب ہے اپنے دشمن و ہمدردی صبر اور آپ تکالیف اٹھا کر زیر کرو۔ عیسائی دنیا چاہے تھپڑ کھانے پر ایک گال کے بعد دوسرا پیش کرنے کو

انسانی اخلاق اور برداشت کا معراج سمجھتی ہو لیکن حقیقت میں اس کی ترقی کا راز جارحانہ مقابلہ
ہے۔ کیا تجارت، کیا ملکوں پر قبضہ، غریب ممالک میں عیسائیت کا فروغ اور جنگیں شدید جارحیت
کی مثالیں ہیں۔ مغرب دنیا کے اس معطل عقیدے کا جواب گاندھی جی کے پاس دشمن کی عملاً
عزت اور اس کے لیے محبت کے الفاظ تھے۔ ایسا لگتا ہے انھیں عیسائی دنیا نے خود کو ڈھونڈ لیا تھا۔
اور یہی مغرب میں گاندھی جی کی کامیابی کا راز تھا۔ پریم چند کے یہاں بھاگو دیتا اور بنگال کی فہم کی
یہ پراگندگی نہیں ہے۔ وہ عمل کے آدمی تھے۔ جارحیت ان کے یہاں صحت مند شکل میں ملتی ہے
... انھوں نے کبھی بھی اہنسا میں تبدیلی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تشدد ان کی زندگی میں کہیں نظر
نہیں آتا۔

ہندوستان سے واپسی کے بعد (۱۸۹۱ء) وکالت میں ناکام ہو کر گاندھی جی کو پوربندر کی ایک مسلم
فرم کے لیے جنوبی افریقہ میں کام کرنے کا موقع ملا اور ۱۹۰۲ سے ۱۹۱۴ تک انھوں نے جنوبی افریقہ
میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت کو بہت قریب سے دیکھا جو کسی بھی مہذب سوسائٹی کے
لیے شرمناک ہوتی۔ وہاں پہلی بار گاندھی جی کو اپنے نئے آلہ پیکار کو ظلم اور ناانصافی کے خلاف
آزمانے کا موقع ملا جب ان کی لیڈرشپ میں بھوک ہڑتالیں ہوئیں۔ پبلک مظاہرے ہوئے۔
کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے ہڑتال کی اور آخرکار ان کی تحریک کو اس لحاظ سے فتح
ہوئی کہ آخر قانونی ناانصافیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۵ سال تھی اور ان کی فتح یابی کی
خبریں ہندوستان میں بھی پہنچ رہی تھیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اسی زمانے میں انھیں مہاتما کا لقب
دیا تھا جو جنتا کے ہونٹوں پر جا کر مہاتما جی بن گیا۔

گاندھی جی کے ذہن کے ارتقا پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور سے ان کی شخصیت
جارحیت Aggression کی حامل تھی جس کا ایک ثبوت اس رات کے واقعے سے ملتا ہے جب
اس غصہ اور جتنا غصہ آیا بدمستی میں وہ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے گیٹ تک لے گئے تھے اور
دھکا دے کر باہر نکال دینا چاہتے تھے اور اس کے منہ سے نکلا تھا: "کیا تم میں بالکل شرم نہیں بچی
ہے۔ نہ میرے ماں باپ یہاں ہیں نہ رشتے دار کہ کس کے پاس جاؤں۔ ایشور کے لیے ہوش میں آؤ
اور گیٹ بند کر دو۔ آپ اور میرا تماشہ مت بناؤ۔"

جنوبی افریقہ کے مزدوروں کی تحریک میں ظلم کو خاموشی سے سہنا اس جارحیت کے چڑھتے ہوئے
دریا کے رخ کو سکون کی ندیوں میں پھیر دینا تھا۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی دفاعی عمل تھا۔ ویسے بھی
اہنسا اور بطور جسمانی طور سے کمزور آدمی کا دشمن کے خلاف بہترین حربہ ہوتا ہے۔ یہ دبایا ہوا

ایگریشن (جارحیت) ان کی سیاسی زندگی میں کم سے کم تین بڑی عدم تشدد/ عدم تعاون کی تحریکوں کی صورت میں رونما ہوا جب عوام ان کی آواز پر برطانوی حکومت کے ہر ادارے اور برطانوی مال کے بائیکاٹ پر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور گاندھی جی ان کے اندر چھپے ہوئے ایگریشن کو نہیں دیکھ پاتے تھے وہ سمجھ لیتے تھے عوام کی ذہنی تربیت ان کے درسِ اخلاق سے بدل چکی ہے۔ لیکن جب عوام کی جبلت گاندھی جی کے سطحی درس کے کپڑے اتار پھینکتی تھی اور وہ قتل و غارت گری اور آتش زنی پر اتر آتے تھے تو گاندھی جی کو جیسے تعجب ہوتا تھا عوام میں یہ درندگی کہاں سے آگئی۔ اس وقت گرجتی ہوئی کی آواز ان کے لاشعور سے اٹھ کر انھیں گیٹ بند کر کے گھر میں واپس چلنے کو کہتی ہوگی اور وہ بپھرتے ہوئے عوام کی تحریک کو لبوں کی ایک جنبش سے روک کر گیان دھیان کے لیے اپنے آشرم میں لوٹ جاتے تھے۔

گاندھی جی کی جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپسی براستہ انگلستان ہوئی اور وہ وہاں برطانیہ کے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کے دو دن بعد پہنچے تھے (۱۹۱۴ء) جب وہ مزدوروں کے حق میں جنوبی افریقہ میں اپنی عدم تشدد/ عدم تعاون کی جنگ لڑ رہے تھے وائسرائے ہند نے مدراس میں ان کی تحریک کے حق میں تقریر کی تھی جس نے لندن کی سیاسی دنیا میں طوفان اٹھایا تھا اور جس کے نتیجے میں کہا جا سکتا ہے مزدوروں کے خلاف ناانصافیوں کا خاتمہ ہوا تھا۔ غالباً یہ اسی احسان کا بدلہ تھا کہ لندن پہنچتے ہی انھوں نے تمام ہندوستانیوں سے برطانوی سلطنت کی مدد کی اپیل کی تھی۔ یہ عمل سیاسی مصلحت سے زیادہ جذباتیت پر مبنی تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک طرح سے دشمن ملک کی کمک میں تھا۔ برطانیہ کے لیے ان کا یہ کام بیزار ہو کر اپنے ملک واپس لوٹ آنے پر بھی جاری رہا۔ اس دور میں ہند میں حکومت کے خلاف ہر قسم کی سازش پر وہ نکتہ چینی کرتے رہے اور ان کی حکومت برطانیہ سے یہ رفاقت اس حد تک تھی کہ کبھی کبھی وائسرائے بھی ان سے مشورہ طلب ہوتے تھے۔ قیصر ہند گولڈ میڈل انھیں انہی خدمات کے صلے میں ملا تھا۔

۱۹۱۵ء میں گاندھی جی نے اپنا آشرم احمد آباد کے نزدیک قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد تھا ہندوستان کے عوام تک اپنے خیالات کو پہنچانا اور جہاں وہ غور و فکر کے لیے سیاست کے ہنگاموں اور عدم تشدد کے معرکوں کے تشدد میں بدل جانے پر لوٹ جایا کرتے تھے۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۰ء میں صرف چار سال کا وقفہ ہے۔ ان چار سالوں میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے حکومت برطانیہ نے تشدد اور دباؤ کے ہر ممکن طریقے کو ہندوستان پر روا رکھا تھا۔ انڈین پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء میں اخبارات، کتابوں اور ایسی تمام دستاویزات پر پابندی عائد کر دی گئی تھی جو حکومت کی نظر میں مفسدانہ تھے۔ اس ایکٹ کے عائد کیے جانے سے دو سال پہلے پریم چند کی کتاب 'سوزِ وطن' جون یا

جولائی ۱۹۰۸ء میں میں ضبط کر لی گئی تھی اور اس پر نظر ڈالتے ہوئے انگریز مجسٹریٹ نے وہی لفظ استعمال کیے تھے جو ایسی تمام تحریروں کے لیے استعمال کیے جارہے تھے ''تمھیں معلوم ہے جو تم نے لکھا ہے مفسدانہ ہے۔۔۔۔؟'' ان حالات میں گاندھی جی کا یہ استدلال (۱۹۱۴) کہ ہندوستان کے باشندوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے (حکومت) کی بے لوث خدمت اور اس سے محبت ہی بہترین طریقۂ کار ہے یقیناً بیشتر ہندوستانیوں اور پریم چند کی سمجھ سے باہر رہا ہوگا۔

پریم چند کا گاندھی جی کے حکومت برطانیہ کے حق میں بیانات دینے کا منفی اثر شاید اس وقت مثبت اثر میں بدلا ہوگا جب شمالی بہار کے نیل کے کسانوں کے کاشت کاروں کے ہاتھوں استحصال اور گجرات کے ایک ضلع میں کسانوں کی تباہ حالی نے مہاتما جی کو مجبور کیا کہ وہ وہاں کے کسانوں کو حکومت کے خلاف بغیر ٹکراؤ کے مزاحمت کے طریقے کو Passive Resistance اپنا کر منظم کریں۔ ایک طرح سے یہ گاندھی جی کا ہندوستان کی سیاست میں سب سے بڑا حصہ تھا۔ اس سے پہلے کانگریس نے نہ کسانوں کے مسائل میں دلچسپی لی تھی نہ انھیں خود میں ضم کرنے کی کوشش کی تھی۔

گاندھی جی کی اس کے بعد کی کامیابیاں بھی ان کے اسی ہتھیار کی بدولت تھیں کیونکہ ستیہ گرہ کی تلوار کے سر پر گرنے کا خطرہ ہمیشہ مدمقابل پر رہتا تھا۔ پریس گاندھی جی کے ساتھ تھا اور ہندوستانی عوام پورے جوش و خروش سے ان کے ساتھ ہوتے گئے۔

گاندھی جی باقاعدہ طور سے ہندوستانی سیاست میں ۱۹۱۹ء میں داخل ہوئے اور یہ اس ایکٹ کے خلاف تھا جو جنگ کے دوران بنایا گیا تھا جس کے تحت کسی فرد کو بھی مقدمہ چلائے بغیر جیل میں ڈالا جا سکتا تھا اور جو جنگ کے بعد بھی آزادی کی تحریک کے خلاف استعمال کیا جارہا تھا۔ گاندھی جی کا موقف تھا کہ اگر اس ایکٹ کو قانون کا درجہ دیا گیا تو ہم مہذب طریقے سے اسے ماننے سے انکار کریں گے اور اس مہم میں ہم (عوام) سچائی اور عدم تشدد سے کام لیں گے۔ لیکن عوام سے مراد غالباً وہ چند افراد تھے جو ان کے آشرم سے وابستہ تھے اور پڑھے لکھے تھے۔ عوام تک نہ تعلیم پہنچی تھی نہ سچائی جیسے مبہم تصورات۔ ایک عام انسان کے ذہن میں بالخصوص جو تعلیم سے بے بہرہ ہو سچائی کا بس اتنا تصور ہوتا ہے۔ جو بات اپنے مذہب کی کتاب ہاتھ میں لے کر کہی جا سکے وہ سچ ہے۔ عوام کا ردعمل کس نعرے کے جواب میں کیا ہوگا یہ حقیقت گاندھی جی کی فہم سے ہمیشہ دور رہی۔ انھوں نے انسانی سرشت میں (جارحیت جس کا نکاس نہ ہوا ہو) کا مطالعہ کیا تھا نہ اس حقیقت کا مشاہدہ کہ کس آسانی سے انسانی تخیل صبر اور محبت کا سبق فرد اور افراد کو بھلا کر انھیں دوسروں کا گلا گھونٹنے میں مبتلا کر دیتی ہے۔

گاندھی جی نے ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو سب کام چھوڑ کرا پواس (فاقے) اور عبادت کا دن مقرر کیا تھا۔ اس دن ستیہ گرہ کا ملی انعقاد ہونا تھا۔ بعد میں یہ تاریخ بڑھا کر ۶ اپریل کردی گئی۔ ہڑتال کے ملتوی ہونے کا اعلان دلی بروقت نہ پہنچا۔ ہڑتال ۳۰ مارچ کو ہوئی لیکن عدم تشدد کی نہ رہی اور اس نے اگلے دو ہفتوں میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں فسادات کی شکل اختیار کرلی۔ اس خوں ریزی کے ڈرامے کا کلائمکس جلیاں والے باغ کا سانحہ تھا۔ عوام کا یہ ذہنی رخ گاندھی جی نے نہیں دیکھا تھا ان کا ردعمل شوک (غم) کا تھا اور اس کا مطلب ان کے ذہن میں ایک ہی تھا کہ ابھی عوام کی نہ ستیہ گرہ کے لیے تعلیم مکمل ہوئی ہے نہ تربیت۔ بالآخر انھوں نے passive Resistance بغیر کمزور کے مزاحمت کی تحریک کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ اپریل کے آخر تک پنجاب کی آگ بجھائے ہوئے کوئلوں کی سی رہ گئی تھی جو ذرا کھجانے سے جانے پر پھر سے بھڑک اٹھتی۔ یہی حال باقی ہندوستان کا تھا۔ فسادات سے پرُ اس ہڑتال نے عوام کے اندر بھرے ہوئے غصے کے لیے Catharsis اخراج جذبات کا کام کیا تھا کیونکہ جنگ صرف گورمنٹ کے ایک ایکٹ کے خلاف ہی نہیں تھی۔ عوام کے بہت سے دوسرے مسائل بھی تھے جن کی طرف نہ حکومت توجہ دے رہی تھی نہ بڑی سیاسی تنظیمیں۔ ۶ اپریل کی ہڑتال نے عوام کے پابندیوں کے بوائلر میں بند غصہ اور نفرت کی بھاپ کو بوائلر کو پھاڑ کر باہر نکل آنے کا موقع دیا تھا اور وہ وقتی طور پر شانت ہوگئے تھے۔ ان کا نعرہ اس کے بعد گاندھی جی کی جے بن گیا۔ انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کیا خریدنے گھر سے نکلے تھے اور کیا لے کر گھر جا رہے تھے۔ لیکن اس عدم تشدد سے اٹھنے والے خون خرابے کو غور و فکر کرنے والوں اور ادیبوں نے بھی اس زاویہ نظر سے دیکھا ہوگا یہ امر توجہ طلب ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے شروع ہی میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے اس جنگ میں تعاون کے عوض جنگ کے بعد سیاسی اصلاحات کی پیش کش کی تھی جس میں ماتحت ملکوں کو حق خود اختیاری دینے کا وعدہ بھی شامل تھا لیکن جنگ کے بعد دی جانے والی اصلاحات ناکافی اور مایوس کن تھیں اور حق خود اختیاری میں ہندوستان کے باشندوں کو جو پیش کیا جا رہا تھا اس کی حیثیت اس بچے ہوئے کھانے کی سی تھی جو مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد گھر کے نوکروں کے ہاتھ آتا ہے۔ لیکن آخر ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی ان اصلاحات کو جنھیں پہلے ناکافی اور مایوس کن سمجھا گیا تھا آزمانے کے حق میں ہو گئے تھے۔

ہندوستان کی پوری فضا اس وقت مختلف النوع مسائل سے پرُ تھی اور اقتصادی مشکلات ان مسائل کے سیاہ بادلوں میں چمکنے والی بجلی تھی جو کہیں بھی کبھی بھی کسی کے سر پر بھی گرنے کو تیار تھی۔ حکومت کا امرتسر کے اصل مجرموں کو چھوڑ دینا اور تحریک خلافت کو کچلنے کی کوشش نے گاندھی جی کو

ایک ہی سال میں اپنا موقف بدلنے پر مجبور کر دیا (ستمبر ۱۹۲۰ء)اس باران کا نعرہ تھا'' ایشور کی راہ میں مرنا شیطان کی راہ میں جینے سے بہتر ہے'' یہ نعرہ اپنے بطن میں جو اگریشن چھپائے تھا اسے صرف گہری سوجھ بوجھ رکھنے والوں ہی نے دیکھا ہوگا۔

ملکی پیمانے پر دوسری بار عدم تعاون عدم تشدد کی مہم شروع کرتے وقت گاندھی جی کے ذہن میں صرف تحریک خلافت کے خلاف ظلم اور اپنی حکومت (سوراج) ہی نہیں تھے۔ان کی مہم اپنے طریقۂ زیست کو عام کرنے کی ملک گیر کوشش بھی تھی۔ان کے نزدیک مغربی تہذیب سائنس اور صنعت کی ترقی کی وجہ سے روح کو فنا کرنے والی تہذیب تھی۔ان کے الفاظ میں ہندوستان کی نجات اس میں تھی کہ جو کچھ اس نے پچھلے پچاس سال میں سیکھا تھا اسے بھلادے۔ ریلوے ، بجلی مراف ، ہسپتال ، وکیلوں ، ڈاکٹروں اور ان جیسوں کو (ہماری زندگی سے) نکل جانا چاہیے۔اور اعلیٰ طبقے والوں کو۔۔۔۔۔ کسانوں کی سیدھی سادی زندگی کو لوٹ جانا چاہیے۔'' جب بھی میں ریلوے کمپارٹمنٹ یا بس میں بیٹھتا ہوں مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنی صداقت کے شعور کے ساتھ تشدد برت رہا ہوں''۔

پریم چند برطانوی کپڑے کا بائیکاٹ کر کے چرخا چلا سکتے تھے لیکن ان کے دماغ میں ٹرینوں اور بسوں میں بیٹھنے اور بیماری میں ہسپتال کی طرف رجوع کرنے کے بارے میں وسوسے کبھی پیدا نہ ہو سکے کیونکہ بنیادی طور سے وہ ترقی پسند تھے اور ہر ادیب کو جو مستقبل میں بہتری کا خواب دیکھنے والا ہو ترقی پسند ہی سمجھتے تھے۔ یہ سمجھ لینا کہ اگر وہ برطانوی کپڑے کا بائیکاٹ کر کے جو وہاں کی ملوں کا بنا ہوتا تو خود اپنے دیش کی ملوں کا بھی خاتمہ چاہتے تھے ان کی پوری زندگی سے ناواقفیت کی بنا پر ہی ممکن ہے۔ کسی بھی حقیقت پسند کی نظر میں چرخا آزادی کی سیڑھی کا پہلا ڈنڈا تو ہو سکتا تھا لیکن آزادی کی چھت سے جڑا ہوا آخری ڈنڈا نہیں۔

تاریخ پر ہموار گرفت رکھنے کے لیے یہاں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس نے اپنی میٹنگ بمبئی میں کی تھی۔کسان سبھاؤں اور کئی ہی مزدور تحریکوں نے اس دور میں جنم لیا۔۱۹۲۰ کو ہڑتالوں کا سال کہنا نا درست نہ ہوگا جب اس کے پہلے نصف میں دو سو سے زیادہ ہڑتالیں ہوئیں۔ادھر دسمبر ۱۹۲۰ کی سالانہ میٹنگ میں کانگریس کے لیے گاندھی جی نے اپنا نیا منشور پیش کیا جس میں یہ عہد بھی شامل تھا کہ عدم تعاون اور عدم تشدد کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایک سال کے اندر اندر یعنی ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ء سے پہلے وہ سوراج حاصل کر لیں گے۔ یہ پورا دور ہر قسم کی سرگرمیوں سے پر تھا۔لوگ اپنی ضرورت خود پوری کرنے کے جوش میں چرخے چلا کر سوت

کات رہے تھے۔ طلبا کو اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے دور رکھا جا رہا تھا۔ شراب کو بھی غربت کا ذمے دار ٹھہرایا جا رہا تھا۔ کستوربا ئی نے خود شراب کی دکانوں پر دھرنا دیا اور عورتوں کی یہ مہم بھی ملک بھر میں پھیل گئی کہ کلال خانوں میں ہم اپنے مردوں کو نہیں جانے دیں گے جو وہاں پا کر نہ صرف دن بھر کی کمائی گنوا آتے ہیں بلکہ نشے میں گھر آ کر بیوی بچوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ بدیسی کپڑا جلانے میں ہر قسم کی ہنگامہ آرائی ہوئی اور خلافت تحریک جو کانگریس کی ہم رکاب تھی بدلے ہوئے حالات میں قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ ملک میں مذہبی فسادات بھی ہوئے لیکن جب ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ بھی گزر گیا اور سوراج کا سورج طلوع نہیں ہوا تو لوگوں میں بد دلی پھیلنی شروع ہوئی۔ اس بد دلی کو دور کرنے کے لیے گاندھی جی نے کہا ''جہاں عوام انسانی سطح پر سول نافرمانی کا راج آ جاتا ہے وہاں (پنچایتی) حکومت کا مرکز چھوڑ دیتی ہے۔ پولیس اسٹیشن، عدالتیں، دفاتر حکومت کی تحویل سے نکل جاتے ہیں اور ان کا نظم عوام سنبھال لیتے ہیں''۔

ان کے پروگرام کے تحت سوراج کو سب سے پہلے بردولی ضلع گجرات میں آنا تھا جہاں مکمل سول نافرمانی بطور تجربہ آزمائی جاتی۔ ان کی آخری تنبیہ کے بعد جسے حکومت نے رد کر دیا تھا عوام کے لیے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ اگر حکومت وقت ہمارے سامنے نہیں جھکتی ہے تو ہم عدالتوں، گورنمنٹ دفاتر اور پولیس اسٹیشنوں پر قبضہ کر لیں گے۔ یعنی عدم تشدد یہ ہر گز خود کو تشدد میں بدلنے کے لیے تیار تھا۔

یوں گاندھی جی اپنی سیاسی زندگی کی سب سے بڑی محارب مہم کو چلانے کے منتظر تھے کہ گورکھپور اتر پردیش کے نزدیک کے ایک گاؤں چوراچوری سے بڑے پیمانے پر اپنی قربانی دینے اور بائیس ہندوستانی کونسٹبل کے ایک پولیس ہیڈ کوارٹر میں قتل کی خبر آئی۔

گاندھی جی کا ردعمل اس موقع پر سب کو چونکا دینے والا تھا۔ بجائے مہم کی رہبری کرنے کے وہ برت رکھنے اور گیان دھیان کے لیے میدان کارزار سے مراجعت کر گئے۔ انھوں نے کہا

''ایشور نے تیسری دفعہ مجھے متنبہ کیا ہے کہ ابھی تک ہندوستان میں وہ غیر متشدد اور راست بازی سے پُر ماحول نہیں بن سکا ہے جو تنہا عوامی پیمانے پر نافرمانی کے عمل کو بجا ثابت کر سکے، جسے مہذب کہا جا سکے۔ جس کے معنی ہیں شریفانہ راستی سے پُر عاجزی سے مملو اور جو ہرگز بھی نفرت پر مبنی نہ ہو''

اپنی جیل کی کوٹھریوں میں ہزاروں کم عمر محب وطن ہندوستانیوں نے حیرت اور سراسیمگی سے گاندھی جی کے فیصلے کو سنا۔ ان حیرت زدگان میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی تھے اور گاندھی جی کے اس فیصلے پر سخت برہم تھے اور یقیناً سیاسی شعور رکھنے والے وہ ادیب بھی ہوں گے جنھوں نے خود کو آزادی کی

مہم کے اس نئے جارحانہ Aggressive پہلو سے ہم آہنگ کرلیا ہوگا اور اب انھیں ایک بار پھر سول نافرمانی سے پہلے کے دور کو لوٹ جانے کے لیے کہا جارہا تھا۔ یہ عمل ایسا ہی تھا جیسے تیز رفتار سے چلتی موٹر کار کو اچانک بریک لگا دیا جائے۔ سیاسی بصیرت رکھنے والوں کے سامنے گاندھی جی اس وقت ایک ایسے سینا پتی تھے جو اپنے لشکر کی ہلاک کرنے کی صلاحیت سے ناواقف تھا۔ دشمن کے خلاف ہر تحریک خواہ وہ انوشٹ برت رکھ کر شروع کی جائے' پٹ کر بالآخر انسان کی جبلت کو للکارتی ہے اور وہ ہے اپنا دفاع۔ کتنی ہی تربیت انسان سے تو کیا کسی بھی جاندار سے اس کی جبلت نہیں چھین سکتی۔ گاندھی جی نے یہ حقیقت نہ پہلے عدم تشدد کی مہم (دلی اور پنجاب) سے سیکھی تھی نہ چورا چوری سے۔ ابھی وہ اسے پھر آزمانے والے تھے۔

چورا چوری کے سانحہ کے وقت پریم چند کی عمر ۴۴ سال تھی اور وہ گورکھپور میں ۱۹۱۸ سے تعینات تھے جو چورا چوری سے نزدیک ہے۔ اس مہم کی چورا چوری سے پہلے کی تمام فضا پریم چند کی اس دور کی تحریروں میں موجود ہے۔ لوگوں کا جوش و خروش جس سے وہ خود کو اتنا نزدیک پاتے تھے ان میں بھی در آیا تھا اور گاندھی جی کے پروگرام سے ان کا متفق ہونا لابد تھا۔ ستیہ گرہ کی تحریک کے سلسلہ میں گاندھی جی ۸/فروری ۱۹۲۱ کو گورکھپور سے گزرے تھے جہاں پریم چند بسلسلہ ملازمت موجود تھے۔ گاندھی جی کی تقریر کے بعد ۱۵ جنوری کو پریم چند نے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ بردولی میں گاندھی جی کی غیر متوقع مراجعت کے بعد (۱۹۲۲) عوام کی طرح ان کے دل میں گاندھی جی سے اتنی ہی عقیدت رہی ہوگی جو پہلے تھی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ وہ حساس آدمی تھے۔ اور عمل کے وقت ان کے ہیرو کے دبدھے میں پڑ جانا کشت و خون ہوگا ان کے لیے بھی مایوسی کا باعث ہوا ہوگا۔ انھیں بھی گاندھی جی کے عمل اور گیتا کی تعلیم میں تضاد نظر آیا ہوگا۔
''ارجن کیا یہ لڑائی کی گھڑی پس و پیش اور خود بینی کا وقت ہے؟ کیا وہ تمھیں سزاوار ہو۔۔۔؟ یہ کیسی کمزوری ہے؟''

بردولی میں یکا یک سول نافرمانی کی تحریک کو روکنے کی جو تاویلات پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں دخل کانگریس کے بانی مددگاروں کا بھی تھا جن میں بڑے بڑے زمیندار اور کارخانوں کے مالک بھی تھے اور ان کا جذبۂ آزادی اس کا متحمل نہیں ہوتا کہ وہ وقت جلد آجائے جب آزاد ہندوستان کی حکومت ان سے ان کی مراعات چھین لے۔ سیاست کا نظروں سے اوجھل یہ پہلو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ پریم چند سے چھپا ہوا نہیں ہوسکتا تھا۔

رابندرناتھ ٹیگور نے جنھوں نے گاندھی جی کو مہاتما کا لقب دیا تھا اور جو قومی تحریک سے وابستگی میں اپنا سر کا خطاب سلطنت برطانیہ کو واپس کر چکے تھے۔ اس تحریک کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا

اظہار کچھ ایسے لفظوں میں کیا تھا کہ عدم تعاون کا تصور سیاسی تیاگ کا ہے۔ ہمارے طلبا جنھیں کالجوں سے دور رکھا جا رہا ہے یہ قربانی کس لیے دے رہے ہیں؟ اس سے وہ بہتر تعلیم کی طرف نہیں بلکہ نا تعلیمی کی طرف جا رہے ہیں۔ (عدم تعاون) کی پشت پر مٹا دینے کی شدید خواہش کار فرما ہے جو اپنے اچھے روپ میں تیاگ نظر آتی ہے اور بدترین شکل میں یہ دیوتاؤں کی عبادت کا وہ وحشی اور شوریدہ سری ہے جس میں انسانی فطرت کو ایک بے مقصد تباہی کی خوشی ملتی ہے۔ اس حکومت کے کھوکھلے پن میں مجھے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔

اس عدم تشدد میں بدل جانے والی مہم سے کنارہ کشی کے بعد گاندھی جی کی دلچسپی ہلچل کی سیاسی تحریک میں کم رہی۔ انھوں نے دیہاتوں میں سوشل رفاہی کاموں کی اہمیت پر زور دینا شروع کیا اور ایک بار پھر چرخہ چلا کر سوت کاتنے اور کھدر کا کپڑا تیار کر کے اپنا تن ڈھانپنے کو اپنا پروگرام بنایا۔ انھیں امید تھی اس طرح ہندوستان کے عوام کو ضبط نفس کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ سیاسی طوفان کے تھم جانے کے بعد وہ جن کے سامنے آزادی حاصل کرنے کی دوسری راہ نہ تھی انھوں نے پھر سے گاندھی جی کے اصولوں میں دلچسپی لینی شروع کی ہوگی۔

لیکن اس زمانے میں تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے آزادی حاصل کرنے اور سماج سے انتہائی غربت اور ناانصافیوں دور کرنے کی ایک اور راہ بھی تھی۔ وہ راہ کمیونزم کی تھی جو تیسری بین الاقوامی اشتراکیت Comintern اور ہندوستان میں اس کے نمائندے مانبیندر ناتھ رائے کی کوششوں سے ہندوستان میں ظہور میں آ رہی تھی۔ بالشویک انقلاب (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۱۷ء) اور لینن کی فتح یابی کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا اور ان گنت پڑھے لکھے ہندوستانیوں کے دل کو یہ بات لگی کہ حقیقی جدوجہد اور تند انقلاب گاندھی جی کی ان تبدیلیوں سے بہتر ہیں جو تشدد کو اپنائے بغیر لائی جا سکتی ہیں۔ لینن کا اس بات میں پختہ یقین تھا کہ صرف طاقت ہی واضح قسم کی سوشل تبدیلی لا سکتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تاریخ میں حقیقی جدوجہد کا ایک بھی مسئلہ بغیر تشدد کو کام میں لائے حل نہیں ہوا ہے اور طاقت سے تقریباً ہر ایک پسندیدگی کی تبدیلی کو لانا ممکن ہے۔

''۱۹۲۰ء میں مہاراشٹر کے ایک برہمن کمیونسٹ لیڈر شری پت امرت ڈانگے نے اپنا کتابچہ گاندھی اور لینن پر شائع کیا جس میں اس نے استدلال سے ثابت کیا تھا کہ مؤخر الذکر پچھلے انسانوں کے گاندھی جی کی نسبت کہیں بڑا رہنما تھا اور سچا انقلابی۔''

پریم چند اس تحریک سے متاثر ہوئے تھے اور آخر تک کسی نہ کسی طرح متاثر رہے۔ اسے ایک اتفاق سے زیادہ سمجھنے میں کچھ حرج نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے پہلے بیٹے کا نام شری پت رکھا تھا اور

دوسرے کا امرت۔ جو دانگے کے حق ادا تیب پہلے دو نام تھے۔ مسلمانوں میں کمال اتاترک اور اقبال کے بعد کمال مصطفیٰ کمال، اقبال حق کے جاوید اقبال کے ناموں کی بہت تھوڑی سی پسندیدگی کی غماض ہے۔ پتہ نہیں تیسرے بیٹے منو کا جو چیچک سے مر گیا تو انھوں نے کیا نام رکھا تھا لیکن یہ بھی ممکن ہے شری پت اور امرت کا ایک ہی گھر میں ایک کے بعد دوسرے کا نمودار ہونا محض اتفاق ہو کیونکہ دانگے کی پیدائش ۱۸۹۹ کی تھی اور وہ عمر میں پریم چند سے انیس سال چھوٹے تھے۔

بہرحال پریم چند روسی انقلاب سے بہت متاثر تھے کہ ایسا ہی انقلاب ایک دن ہندوستان میں بھی آئے گا اور ہمیں اس کی ضرورت ہے لیکن وہ جذباتیت کے شکار نہیں تھے کہ جو عوام کے شعور کی بیداری اور آزادی کی یہ جنگ روس لڑے گا۔ وہ حقیقت پسند تھے کہ یہ انقلاب لانے کے لیے خود یہاں کے عوام کو میدان عمل میں اترنا پڑے گا تب جا کر جہالت مذہب کے ہاتھوں عوام کا استحصال اور اپنے دیش کے دھنوانوں اور غیر ملکیوں کے تسلط سے نجات ہوگی۔ اور زمین اور کارخانوں کے مالک وہ بن سکیں گے۔ جو کھیت جوتتے اور مشین چلاتے ہیں اور تب ہی دولت چند ہاتھوں سے نکل کر سب کی ضرورت کے مطابق پورے ملک میں بچھ سکے گی۔

ہندوستان ایک بار پھر گاندھی وادی فضا میں بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی طرح گونج کر گم ہو گیا تو وہ آزادی کی بات نہیں رہی تھی۔

۱۹۲۲ میں گاندھی جی کو ۶ سال کی جیل ہوئی۔ دو سال بعد انھیں پونے کے ایک ہسپتال میں اپنڈیسائٹس کے آپریشن کے لیے (غالباً) ان کی خود پر عائد کردہ پابندیوں کے خلاف لے جایا گیا کیونکہ ہسپتال بھی ان کی فکری دنیا میں غیر ضروری تھا۔ لوگ اب بھی ان کے معتقد تھے۔ دانشور بھی متوسط طبقے والے بھی اور کسان بھی۔ لیکن اس وقت بھی نہ کانگریس کے ذہن میں دھندلا سا خاکہ بھی اس حکومت کا تھا جو برطانیہ والوں کو ہٹا کر ہندوستان میں آئے گی۔ دیہاتوں کے زمانے کی یہ موجودہ ایجادات سے دور ہے قدرے پہلے کی یہ موجودہ دور کی۔ نہ ہی گاندھی جی نے اس طرف توجہ دی تھی۔ عام آدمی کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا 'کھدی چونی چاندی کی جے بولو گاندھی کی' گاندھی جی کی سیاست عوام کی مذہبی عقیدت بھری محدود فکر اور اس سے بھی کم تعلیم سے گہری مطابقت رکھتی تھی۔ ایسے ذہن تک کمیونزم کی پہنچ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔

یرودہ جیل سے اور آپریشن کی مشکلات میں رہا ہونے کے بعد گاندھی جی کو عملی سیاست میں دلچسپی نہیں رہی۔ ان کے ذہن میں اس وقت بس تین پروگرام تھے۔ اچھوتوں کے سدھار کا کام، ہندو مسلمانوں میں ایکتا اور چرخا اور کھادی پر زور۔

جہاں تک ہندو مسلمانوں میں ایکتا پیدا کرنے کا سوال ہے یہ حقیقت گاندھی جی پر اور اکثر لیڈروں

پر آشکارا نہ ہو سکی کہ مجمع کا ذہن بھی افراد کے ذہنوں کی طرح بعض حالات میں بیمار حقائق کے تابع ہوتا ہے۔ جس طرح بری گھڑی دو مخالف لیکن نیوروسس زدہ neurotic اشخاص کو ایک دوسرے کے نزدیک لے آتی ہے جب وہ ایک دوسرے کے خلاف بے وجہ کی مخالفتوں کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ پبلک کی مختلف بڑی آبادیاں بھی ایسے رویے کے اظہار سے مبرّا نہیں ہوتی ہیں۔ بری گھڑی کے ٹلتے ہی افراد کا نیوروٹک طرز عمل بھی دوبارہ عود کر آتا ہے اور گروہوں کا بھی۔ نظر انداز کی ہوئی ایک دوسرے کی برائیاں انھیں پھر سے اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے کا خطرہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اور گاندھی جی کا یہ استدلال کہ اس گھڑی میں مسلمانوں کا ساتھ دینے سے ان کی تحریک کا ہاتھ مضبوط ہو سکتا ہے ان دونوں بڑی آبادیوں کو ایک دوسرے سے نزدیک لے آیا تھا لیکن تھا غیر منطقی مصالحت پر مبنی۔ ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کی عالیشان عمارت کے ڈھے جانے پر ان دو بڑی آبادیوں کو ایک دوسرے کے نزدیک رکھنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اصل مسئلہ تھا اس بیمار ذہنیت سے دور کیے جانے کا جو صرف تعلیم کے ذریعے ممکن تھا جس کی ضرورت عوام سے زیادہ عوام کے ہر نوع کے لیڈروں کو تھی۔ پریم چند کے ہندو مسلمان کردار خود اس کی طرح تمام حالات میں ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک رہتے تھے کیونکہ ان کا جنم ایک ہی جگہ ہوا تھا اور ایک ہی ماحول میں انھوں نے زندگی بسر کی تھی۔ وہ نہ ہنگامی حالات کے تحت یکجا نہیں ہوئے تھے نہ ہی ان ہنگامی حالات کے ختم ہونے پر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے تھے۔

اس دور میں صرف اوپر کے اور سرمایہ دار طبقوں تک محدود نہ رہ کر سیاست میں مزدوروں اور کسانوں کے حقوق سے آگہی کا رنگ بھی آتا جا رہا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مزدوروں اور کسانوں کی کل ہند کانفرنس کلکتہ میں ہوئی۔ کمیونسٹ پارٹی میں بھی سیاست کے اس نئے رخ سے نئی روح پیدا ہو گئی۔ لیکن اس سے قبل کہ کمیونسٹ پارٹی اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہوتی حکومت نے اس کے ۳۱ کارکنوں کو گرفتار کر لیا اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ ملک معظم کو ان کی شہنشاہیت سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اس لیے سازشی ہیں۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں انھیں میرٹھ لے جایا گیا اور چار سال سے زیادہ بغیر جیوری کے ان پر مقدمہ چلا۔ یہ اشخاص جب ۱۹۳۳ء کے اواخر میں وافر ثبوت جرم نہ ہونے کی وجہ سے جیل سے رہا ہوئے تو انھیں عوام الناس نے ہیرو کا رتبہ دیا اور پارٹی کی رکنیت بھی بے انتہا بڑھ گئی۔ ۱۹۳۳ء ہی وہ سال ہے جب کہا جاتا ہے پریم چند کانگریس سے بددل ہو گئے تھے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں گاندھی جی پھر عملی سیاست میں داخل ہوئے اس کی وجہ کانگریس کا ٹولیوں میں بٹا ہونا تھا اور انھیں یکجا کرنے کے لیے گاندھی جی کے پاس جو پروگرام تھا اس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ نہرو رپورٹ کو تسلیم کرے جس کے تحت ملک کو مکمل داری (ڈومینین اسٹیٹس) کا درجہ

تھا۔ یہ رپورٹ مونٹیگو کے اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان پر مبنی تھی۔ خود حکومت برطانیہ اس حقیقت کو تسلیم کر رہی تھی کہ اصل معاملہ ڈومینین اسٹیٹس کا حصول ہے۔ لیکن کانگریس کے مطالبات جن میں سے چند یہ تھے کہ حکومت اپنی خلوص نیت کا اظہار تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر کے کرے، فوجی بجٹ میں ۵۰ فیصدی کمی کا اعلان کرے، اعلیٰ افسروں کی تنخواہوں میں تخفیف ہو، حکومت کے لیے ناقابل قبول تھے۔

گاندھی جی پہلے ہی ان مطالبات کے منظور نہ کیے جانے کی صورت میں عدم تعاون عدم تشدد کی مہم کو شروع کرنے کا اعلان کر چکے تھے اور فضا ایک بار پھر جارحیت سے بھری ہوئی تھی۔ نتیجے میں دھماکے ہوئے، وائسرائے کی ٹرین کو بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی۔ کانگریس کا جو اجلاس لاہور میں ہوا اس میں پورن سوراج (مکمل آزادی) کا نعرہ بلند کیا گیا۔ ایک بار پھر گاندھی جی کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید پر سول نافرمانی کی تحریک چلائیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے نمک کے ٹیکس کو اپنی مہم کا آغاز بنایا۔ سول نافرمانی کی تحریک ۱۲ مارچ کو شروع ہوئی اور ۲۴۰ میل کے پیدل سفر کے بعد ۶ اپریل کو سمندر کے کنارے گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں نے نمک بنایا اور انھوں نے اعلان کیا کہ انھوں نے نمک کے قانون کو توڑا ہے اور ہندوستان کے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنے لیے خود نمک حاصل کریں۔ یہ کھلم کھلا حکومت کے خلاف اعلان جنگ تھا۔

ملک بھر میں لوگوں نے اپنے باپو مہاتما کی ہدایت پر عمل کیا اور تحریک ایک بار پھر اپنا عدم تشدد کا کردار کھو بیٹھی۔ دہشت پھیلانے کی وارداتیں ملک بھر میں ہوئیں جن میں سب سے اہم چٹاگانگ کے اسلحہ خانے پر حملہ تھا (اپریل ۱۹۳۰ء) جس میں ۶ گورنمنٹ ملازمین ہلاک ہوئے۔ کتنے ہی بڑے شہروں میں فسادات ہوئے۔ کئی جگہ متوازی حکومتیں قائم ہوئیں۔ ایک بار پھر مشتعل عوام کو کچلنے کے لیے حکومت کی مشینری حرکت میں آئی اور ایک اندازے کے مطابق ۲۹ بار گولی چلائی گئی جس میں ۱۰۳ افراد مرے ۴۲۰ زخمی ہوئے اور ۶۰,۰۰۰ سے زیادہ ایک سال میں گرفتار ہوئے۔ لیکن اس سب کے باوجود حکومت عوام کے اشتعال کو سرد کرنے میں ناکام رہی۔

حکومت کے خلاف اس تیسرے بڑے معرکے سے حکومت گفت و شنید پر مجبور ہوگئی اور یہ ایک طرح سے عوام اور ان کے لیڈر کی فتح تھی لیکن لیڈر کا اندازہ ایک بار پھر غلط نکلا تھا کہ کوئی بھی عوامی تحریک جو حکومت کو خواہ کتنے ہی سلامتی کے الفاظ میں دعوت مبارزت دے رہی ہو نہ صرف عدم تعاون کی تحریک رہ سکتی ہے نہ عدم تشدد کی۔ یہاں لینن کا کلیہ زیادہ درست محسوس ہوتا ہے کہ صرف طاقت ہی کے استعمال سے کوئی سماجی تبدیلی ممکن ہے۔ گاندھی جی نے اپنی تین عدم تشدد کی مہمات

بے دانستہ طور سے عوام کی بند طاقت کا راستہ کھول دیا اور جس طرح ایک ندی کے بند میں شگاف پیدا کرنے والا پھر اس شگاف کو پانی کے ریلے کے سامنے نہیں رک سکتا ہے وہ بھی عوام کی جارحیت اور تشدد کے ریلے کو روکنے میں ناکام رہے اور آخر کار غیر ملکی استبداد کے خلاف فتح عوام کی طاقت وہوئی۔ یوں بھی دیکھا جائے تو سیلاب عمر قہر خدا نہیں ہے۔ اس کی تباہ کاریاں اپنی جگہ پر لیکن وہ اپنے ساتھ کوڑا کرکٹ کو بھی بہا لے جاتا ہے اور جاتے ہوئے کھیتوں کوئی جاندار مٹی بھی دے جاتا ہے یہ وہ کام ہے جو سال بھر کوڑے کو جھاڑوں سے ادھر سے ادھر کرنے سے نہیں ہوتا نہ ہی کھیتوں کو مرقسم کی کھاد سالوں دیتے رہنے سے ہوتا ہے۔

یہ مان لینے میں دشواری ہوتی ہے کہ پریم چند جو ایک دنیوی آدمی تھے اور تقریباً لامذہب گاندھی جی کے اس اعتقاد سے متفق ہوئے ہوں گے جو ہندوستان میں پچاس سال پہلے کے دور کو لانے کا متمنی تھا جب نہ بسیں تھیں نہ ٹرینیں نہ ملیں نہ ہسپتال حتی کہ بائیسکل تک بھی نہیں۔ اور اگر یہ الزام ہے تو یہ گاندھی جی کے کتنے ہی معتقدوں پر آئے گا جو سیاست میں ان کی لیڈری کے قائل تھے لیکن انھیں نہ موٹر کار میں بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی نہ کیمرے سے تصویر کھنچواتے ہوئے۔ پریم چند نے فلمی دنیا کے کاشی بمبئی کا رخ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اس نیت سے کیا تھا کہ ان کے خیالات جو کتابوں اور رسالوں کے ذریعے ان پڑھ عوام تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اس آرٹ فورم سے ہر اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں ایک فلم پروجیکٹر ہوگا یہ پہنچے گا اور ایک سفید کپڑے کا ٹکڑا جس پر کہانیاں الفاظ کی جگہ تصویروں میں لکھی عوام کو نظر آئیں گی۔ انھوں نے جو سائیکل اپنے ہونے والے داماد کو دی تھی وہ اس سے ان کے پیار کو ظاہر کرتی ہے۔ ہاں یہ مان لینے میں کچھ حرج نہیں ہے کہ وہ بھی گاندھی جی کو کسانوں اور مزدوروں کو آزادی کی جنگ میں اپنے جلو میں لے کر چلتے ہوئے دیکھتے تھے اور گاندھی جی کے دیہات سدھار کے کام پر جب ان کی نظر پڑتی تھی تو وہ اسے سراہتے تھے۔

۱۹۳۳ تک عوام میں یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ گاندھی جی عملی سیاست کے میدان میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ان کا ہریجنوں کی حمایت میں نعرہ ایک بار بھی عدم تشدد وعدم تعاون کی مہم کی شکل اختیار نہیں کر سکا تھا اور یہ اچھا ہی تھا کیونکہ اس کے نتائج اور بھی زیادہ ہلاکت خیز ہوتے۔ خود پریم چند نجات (دکھی چمار) جیسی کہانیاں لکھ کر اپنا جو کام تھا مکمل پورا کر رہے تھے۔

گاندھی جی (باپو) نے پریم چند کے ذہن میں تو قیر کی جگہ جنوبی افریقہ کے مزدوروں اور بعد میں بہار اور گجرات کے کسانوں کی حمایت میں لڑی ہوئی جنگ سے بنائی تھی وہ ان کے پے بہ پے عدم

تشدد کی تین تحریکوں کو حکومت پر چھوڑ دینے سے جن میں سے ہر ایک میں ہندوستانی عوام کا خون ہوا تھا Serially Invalidate سلسلے وار باطل ہوتی گئی۔ جیسے ایک بچے اور اس کے ماں باپ کے درمیان ہوسکتا ہے کہ ایک دوسرے کے ایک ایک عمل یا برتاوے پر اپنے نظروں سے گراتا جاتا ہے۔ پریم چند اپنے حقیقی باپ کو بے وجہ غیر شعوری طور سے رد کرتے گئے تھے پھر باپو مہاتما جی کو منطقی بنیادوں پر رد کرنے میں کیا چیز مانع ہوسکتی تھی۔

لیکن وہ زیادہ دیر مارکسزم کے بھی ہوکر نہیں رہ سکتے تھے۔ بہت پہلے انھوں نے دیا نرائن نگم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ انھوں نے تقریباً بولشوازم کے اصول قبول کر لیے ہیں اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ مستقبل کی اس پارٹی کے رکن ہیں جس کا مقصد کچلے ہوئے عوام کو سیاسی تعلیم دینا ہوگا (پرکاش چندر گپت کی کتاب سے اقتباس) یہ بات شاید ۱۹۱۹ میں کہی گئی تھی جب لینن کی قیادت میں روس میں بالشویک پارٹی کو اقتدار میں آئے ہوئے دو سال ہوگئے تھے اور ملک شہنشاہیت کے دور سے نکل کر ایک ایسی سوسائٹی میں داخل ہو رہا تھا جہاں نہ امیر بہت زیادہ امیر تھے اور نہ غریب بہت زیادہ غریب۔ اس کے ساتھ ہی لینن کا نعرۂ انقلاب کو دنیا بھر میں پہنچانا تھا۔

لیکن ۱۹۲۴ء میں انتقال سے چند سال پہلے لینن نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ وہ اسٹالن کو پارٹی کی سیکریٹریٹ سے نکال دیں کیونکہ وہ تہذیب سے عاری تھا اور اس کے اطوار بتاتے تھے کہ اس میں طاقت کو غلط طور سے استعمال کرنے کی کمزوری ہے۔ اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ لینن کا انداز درست تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۲ء جرمنی میں کمیونزم کی شکست کے بعد ہی کمیونزم کے دنیا بھر میں پھیلنے کا خواب ٹوٹ گیا تھا۔ لینن کی بیماری کے دوران ہی انقلابی حکومت، لیڈرشپ کس کے ہاتھ آتی ہے کے بحران کا شکار ہوگئی تھی۔ ان تمام پارٹیوں پر پابندی لگا دی گئی تھی جو بالشویک نہیں تھیں اور اگر تھوڑی بہت آزادیٔ اظہار رائے تھی تو صرف بالشویک اعلا صفوں میں۔ اسٹالن کے برسر اقتدار آنے کے بعد بچا کھچا اظہار رائے بھی ختم ہوگیا۔ اسٹالن نے لینن کے عالمی سوشلزم (Leninist International Ism) کی جگہ ایک ملک میں سوشلزم کے نظریے کو پیش کیا جس کا مطلب تھا روسی انقلاب اپنے ملک کے لیے کافی تھا اور روس کو کسی دوسرے ملک کی اعانت کی ضرورت نہیں تھی۔ بعد کے دور میں جس برق رفتاری اور بے دردی سے اسٹالن نے سوویت یونین کو انڈسٹریلائز اور زراعت کو Collectivize (اجتماعی ملکیت) کرنا شروع کیا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں تھی۔ انڈسٹری کو فروغ دینے کے لیے ڈھائی کروڑ کسانوں کو گھر سے بے گھر شہروں میں لا بسایا گیا اور جن خوشحال کسانوں نے حکم عدولی کی انھیں جبری محنت کش کے کیمپوں میں بند کر دیا گیا۔

انسان کا کہنا تھا کہ ہم ترقی یافتہ ملکوں سے پچاس بلکہ سو سال پیچھے ہیں اور دس سال میں ہمیں انھیں دوڑ میں آلینا ہے۔ اور حقیقت ہے ان دس سالوں میں سوویت یونین ایک بڑی صنعتی طاقت بن گیا۔ لیکن اس دور میں زراعت کہیں پیچھے رہ گئی تھی اور عوام کی ضرورت کی کیا چیزیں ہوتی ہیں ترقی کے اس رخ کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ملک میں اور پارٹی میں جہاں بے اطمینانی ابھرتی تھی اسے انتہائی سفاکی سے کچل دیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں تراسکی جیسے پرانے کامریڈ کو ملک بدر کیا جا چکا تھا۔ اور جب اپنی زندگی کے آخری سال میں پریم چند گورکی کی موت (۱۹۳۶) پر ترقی پسند جلسے میں اپنا خطبہ پڑھ رہے تھے سوویت یونین میں بڑے پیمانے پر پرانے بالشویکوں اور مزدور کی عہدے داروں پر مقدمے چلائے جا رہے تھے جن میں ان سے ملک کے خلاف کام کرنے کا اقرار جرم کروایا جاتا ہے جیسے کنفیشن دے کر اعتراف کرائی جاتی ہے۔ اور مقدموں کا مقصد تو پارٹی کو ان عناصر سے خالی کرنا ہوتا ہے جو استالن کی راہ میں حائل ہو سکتے تھے۔ گورکی کی موت بھی پراسرار حالات میں ہوئی تھی۔

اگر گاندھی جی کی زندگی کی شروع کی کسان مزدور دوستی نے پریم چند کو ان کا گرویدہ کر دیا تھا تو بالشوازم نے بھی اپنے شروع کے دور میں مزدوروں کسانوں کی جمہوریت کے نعرے سے ان پر گہرا اثر کیا۔ بعد میں جس سرعت سے اور انسانی جان کی جس قیمت پر سوویت یونین نے ترقی کی وہ اسے سراہ نہ سکے۔ وہ مذہب کے معاملے میں بھی غیر مقلد Non conformist تھے اور سیاسی عقیدے میں بھی غیر مقلد۔

پریم چند کی زندگی ماں کے انتقال سے لے کر چھپن سال کی عمر میں اپنے انتقال تک کم و بیش تنگی ترشی کی زندگی تھی۔ لیکن حالات نے نہ انھیں موقع پرست بنایا جس کے کتنے ہی مواقع انھیں تھے نہ حسن دولت کا پجاری۔ ان کی خودداری اور اعلیٰ حوصلگی نے انھیں کسی رجواڑے سے وابستہ ہونے دیا نہ انھوں نے حکومت برطانیہ کا پیش کیا ہوا خطاب قبول کیا۔ ان کی زندگی بڑی ہموار زندگی تھی۔ یہ نہیں کہ کبھی غیر ملکی حکمرانوں کی مدح میں ناول یا اسکرین پلے لکھے ہیں اور نہ کبھی ایسی کہانیاں جن کا مقصد حکمرانوں کی جگہ ان کی قوم سے نفرت پیدا کرنا ہو۔ انھوں نے جہاں بھی انھیں برطانوی لوگوں میں کوئی خوبی نظر آئی اس کی کھل کر تعریف کی ہے اور جہاں اپنوں میں برائی دیکھی اسے بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وقت کے ساتھ نہ ان کی طرز پوشش بدلی نہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ۔ نمائش نہ ان کی ذات میں تھی نہ تحریر میں۔ پریم چند کا زندگی بسر کرنے کا طریقہ کسی سے اخذ کیا ہوا نہیں تھا۔ دیہاتی زندگی کا عطیہ تھا۔ وہ نوکروں تک سے خدمت لینے کے خلاف تھے چہ جائیکہ بیوی کو نوکرانی سمجھنا۔

پریم چند نہ بچپن میں ضدی تھے نہ بڑے ہو کر تند مزاج نکلے۔ یہ کہنا کہ وہ آخر عمر میں تشدد کے قائل

ہو گئے تھے غلط ہے اور اس کا پتہ نہ ان کی زندگی کے مطالعے سے چلتا ہے نہ ان کی تحریروں سے۔ حتی کے منگل سوتر سے بھی نہیں جو تکمیل کو نہ پہنچ سکنے کی بنا پر ناقدین کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے کیونکہ اس کے کردار آگے چل کر کیا کرتے کیا بن جاتے ہر ایک کے لیے پرواز تخیل کا بڑا امکان رکھتے ہیں۔

اگر مشاہدہ تخیل اور سچائی کو کسی بھی فن پارے کے ضروری اجزا سمجھا جائے تو پریم چند کی تحریریں اس کلیے کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کا مشاہدہ فطرت کو بھی محیط کیے ہوئے ہے اور انسانی فطرت کو بھی۔ اور چونکہ ان کی سوچ میں الجھے نہیں تھے ان کا مشاہدہ سچائی پر مبنی رہتا تھا۔ اسے بنانے سنوارنے یا چھپانے کی انھیں ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ مشاہدہ اور سچائی کا یہ امتزاج ان کے تخیل کی راہ میں حائل نہیں ہوتا تھا۔

پریم چند کی زبان وہ تھی جو ان کے دور کے فکشن نویسوں کی نہیں تھی اور جو بعد میں تھوڑی بہت تبدیلی سے بیشتر حقیقت کے ہوکاس مصنفوں کی زبان بن گئی۔

پریم چند ہندوستانی تاریخ کے بڑے دلچسپ دور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے یہاں اور ان کی ذات میں ہمیں ترقی کرتا ہوا ہندوستان بھی نظر آتا ہے اور پرانی قدریں بھی۔ جہاں وہ عورتوں کے حقوق کے زبردست حامی اور مبلغ تھے اور ان کی تعلیم کے بھی وہاں انھیں بنارس یونی ورسٹی کیمپس میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کا آپس میں آزادی سے ملنا بھی نہیں بھایا تھا۔ ایسا لگتا ہے انھوں نے اپنی بیٹی کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا تھا۔ شاید وہ عورتوں کو اتنی ہی گھر بیٹھے تعلیم کے قائل تھے جتنی شورانی دیوی کی تھی۔

زندگی کے بارے میں پریم چند نے اپنا نظریہ خود تعمیر کیا تھا۔ نہ وہ کامیابی کی صورت میں آپے سے باہر ہو جانے کو اچھا سمجھتے تھے نہ ذرا سی بار پر رو دینے کو۔ ان کی تحریر میں بس وہی آ سکتا تھا جو وہ خود تھے۔ بیٹی کی کمسنی کی موت پر جو بات انھوں نے شورانی دیوی سے کہی تھی تقریباً وہی بات منی کی موت میں منی کی ماں مصنف سے کہتی ہے کہ جس سے محبت تھی اس کے لیے جو ہو سکتا تھا ہم نے کیا۔ جب وہی نہیں رہا تو اس کی مٹی کے پاس بیٹھ کر رونے سے فائدہ؟ یہ نظریہ انھیں کڑی خود ساختہ زندگی نے بخشا تھا۔

حسرت موہانی اور پریم چند جیسے ریاست پاک انسان ادب میں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ پریم چند کے ادبی مقام کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن زندگی کو جس سچائی اور سادگی سے انھوں نے بسر کیا مصلحت کوشی سے دوری برتی اور کسی سے بھی اس کی کھال کی رنگت زبان مذہب اور ذات کی بنا پر بغض نہیں رکھا اس کے بارے میں دو رائیں ممکن نہیں ہیں۔ اس معاملے میں وہ

سے پیش رو نہ پریم چند رچنا ؤں تک سے متاثر نہیں ہو سکے جس کا پریم چند کی مقبولیت کی بنا پر قوی امکان تھا۔ لیکن پریم چند مقبولیت کی راہ پر چلنے والے ادیب نہیں تھے۔

استفادہ

اس مضمون کی تیاری میں جن کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں سے چند کے نام نیچے لکھے جا رہے ہیں۔

امرت رائے : پریم چند قلم کا سپاہی

ایڈیکوماروف : ہندوستان لینن کی نظر میں

پرکاش چندر گپت : پریم چند

چوہدری : جلد ۸٦ شمارہ ۸

جنرل ربر : پریم چند

شمس الحق عثمانی : محب وطن پریم چند

شورانی دیوی : پریم چند گھر میں (ہندی۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۴ء)

عتیق احمد : مضامین پریم چند

قمر رئیس : پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار

مانک ٹالا : پریم چند اور تصانیف پریم چند

: پریم چند حیات نو

: پریم چند چھوٹے مباحث

مدن گوپال : پریم چند کے خطوط

BIBLE 'The Holy (B F B S)

Encyclopaedia Britannica 1923 Edition

Farquhar .Jn Modren Religious Movements in India

Fischer.Louis : Ganghi

Gita.Bhagvad Tr by Swami prabhavananda and
Christopher Isher wood

Lorenz Konrad On Aggression

Madan Indar nath : Modren Hindi Literature

Majumdar R d. Raychaudhuri HC & datta
kakikinkar An Advanced History of India

Prasad .Ishwari A new History of India

Wallbank .T.Walter A short History of India and
pakistan

Wolpert, Stanley A new History of India

بچپن

آپ کا جنم بنارس سے چار میل دور لمہی گاؤں میں سنیچر کے دن چاند کے اندھیرے نصف مہینے میں ساون ۱۰ سمت ۱۹۳۷ یعنی عیسوی ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۸۰ کو ہوا تھا۔ پتا کا نام عجائب رائے تھا۔ ماتا کا نام آنندی دیوی۔ آپ کائستھ اور سری واستو تھے۔ آپ کے تین بہنیں تھیں۔ ان میں دو تو مر گئیں۔ تیسری بہت دنوں زندہ رہیں۔ اس بہن سے آپ آٹھ برس چھوٹے تھے۔ تین لڑکیوں کی پیٹھ پر ہونے سے آپ تیتر کہلاتے تھے۔ ماتا ہمیشہ کی مریض تھیں۔ آپ کے دو نام اور تھے۔ پتا کا رکھا ہوا نام منشی دھنپت رائے۔ چچا کا رکھا ہوا نام منشی نواب رائے۔ ماتا پتا دونوں کو سنگرہنی (آنتوں) کی بیماری تھی۔ پیدا ہونے کے دو تین سال بعد آپ کو ضلع باندا جانا پڑا۔ آپ کی پڑھائی پانچویں برس شروع ہوئی۔ پہلے مولوی صاحب سے اردو پڑھتے تھے۔ ان مولوی صاحب کے دروازے پر سب لڑکوں کے ساتھ پڑھنے جاتے تھے۔ آپ پڑھنے میں بہت تیز تھے۔ لڑکپن میں آپ بہت کمزور تھے۔ آپ کے کھیل کود سے عشق کا تعارف لڑکپن ہی میں ہو جاتا ہے۔ ایک بار کی بات ہے کئی لڑکے مل کر نائی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ نے ایک لڑکے کی حجامت بناتے ہوئے بانس کی کمانی سے اس کا کان ہی کاٹ دیا۔ اس لڑکے کی ماں جھلائی ہوئی ان کی ماتا سے شکایت کرنے آئی۔ آپ نے جیسے ہی اس کی آواز سنی کھڑکی کے پاس جا کر دبک گئے۔ ماں نے دیکھتے ہوئے انھیں دیکھ لیا تھا۔ پکڑ کر چار چھانپڑ دیے۔

''اس لڑکے کے کان تو نے کیوں کاٹے؟'' ماں نے کہا۔

''میں نے اس کے کان نہیں کاٹے بلکہ بال بنائے ہیں۔''

''اس کے کان سے تو خون بہہ رہا ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ میں نے بال بنائے۔''

''سب ہی تو اسی طرح کھیل رہے تھے۔''

''اب ایسے نہ کھیلنا۔''

''اب کبھی نہیں کھیلوں گا۔''

ایک اور واقعہ ہے۔ چچا نے سن بیچا اور اکے روپے لاکر انھوں نے طاق پر رکھ دئے۔ آپ نے اپنے چچیرے بھائی سے صلاح کی جو عمر میں آپ سے بڑے تھے۔ دونوں نے مل کر ایک روپیہ لے لیا۔ ایک روپیہ اٹھا تو لائے مگر اسے خرچ کرنا نہیں آتا تھا۔ چچیرے بھائی نے اس روپے کو بھنا کر بارہ آنے مولوی صاحب کی فیس دی اور باقی چار آنوں میں سے امرود، ریوڑی وغیرہ لے کر دونوں بھائیوں نے کھائی۔

چچا صاحب ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچے اور بولے "تم لوگ روپیہ چرا کر لائے ہو؟"

آپ کے چچیرے بھائی نے کہا "ہاں ایک روپیہ بھیا لائے ہیں۔"

چچا صاحب گرجے "وہ روپیہ کہاں ہے؟"

"مولوی صاحب کی فیس دی۔"

چچا صاحب دونوں لڑکوں کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچے اور بولے "ان لڑکوں نے آپ کو فیس دی ہے؟"

"ہاں بارہ آنے دیے ہیں۔"

"انھیں مجھے دے دیجیے۔"

چچا صاحب نے ان سے پھر پوچھا "چار آنے کہاں ہیں؟"

"اس کے امرود لیے۔"

اس بات کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن انھوں نے اپنے بچپن کے بارے میں خود سنایا تھا چچا اپنے لڑکے کو پیٹتے ہوئے گھر لائے۔ میری شکل عجیب ہوگئی تھی۔ میں ڈرتا ہوا گھر آیا۔ ماں ایک لڑکے کو پٹتا دیکھ کر مجھے بھی پیٹنے لگیں۔ چچی نے دوڑ کر مجھے چھڑایا۔ اپنے بچے کو کیوں نہیں چھڑایا میں نہیں جان سکا۔ شاید انھیں میری کمزوری اور شکست خوردگی پر ترس آ گیا ہو۔

اندھرا کے پل کا چمرودھا جوتا میں نے بہت دنوں تک پہنا ہے۔ جب تک میرے پتاجی زندہ رہے تب تک میں نے بارہ آنے سے زیادہ کا جوتا کبھی نہیں پہنا اور چار آنے گز سے زیادہ کا کپڑا کبھی نہیں خریدا۔ میں مشترک خاندان میں تھا اس لیے میں اپنے کو الگ نہیں سمجھتا تھا۔ اپنے چچیرے بھائیوں کو ملا کر میں پانچواں بھائی تھا۔ جب مجھ سے کوئی پوچھتا تو میں یہی بتاتا ہم پانچ بھائی ہیں۔ میں گلی ڈنڈا بہت کھیلتا تھا۔

جب میں آٹھ سال کا تھا تب ہی میری ماں بیمار پڑیں۔ چھ مہینے تک وہ بیمار رہیں۔ میں ان کے

سرہانے بیٹھا پنکھا جھلتا تھا۔ میرے چچیرے بھائی جو مجھ سے بڑے تھے دوا کے انتظام میں رہتے تھے۔ میری بہن سسرال میں تھیں۔ ان کا گونا ہوگیا تھا۔ ماں کے سرہانے ایک بوتل شکر سے بھری رکھی رہتی تھی۔ ماں کے سو جانے پر میں اس میں سے کھالیتا تھا۔ ماں کے مرنے کے آٹھ دس روز پہلے بہن آئیں۔ گھر سے میری دادی بھی آئیں۔ جب میری ماں مرنے لگیں تو میرا میری بہن کا اور بڑے بھائی کا ہاتھ میرے پتا کے ہاتھ میں دے کر بولیں "یہ تینوں بچے تمہارے ہیں"۔

بہن پتا اور بڑے بھائی سب رو رہے تھے پر میں کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ماں کے مرنے کے کچھ دن بعد بہن اپنے گھر چلی گئیں۔ دادی بھیا اور پتا جی رہ گئے۔ دو تین مہینے بعد دادی بھی بیمار ہوکر گھر چلی آئیں۔ میں اور بھیا رہ گئے۔ بھیا دودھ میں شکر ڈال کر مجھے خوب کھلاتے تھے پر ماں کا وہ پیار کہاں! میں تنہائی میں بیٹھ کر خوب روتا تھا۔

پانچ چھ مہینے کے بعد میرے پتا بھی بیمار پڑے۔ وہ گھر آئے۔ میں بھی آیا میرا کام۔ مولوی صاحب کے یہاں پڑھنا گلی ڈنڈا کھیلنا کھیتوں کر چوسنا اور مٹر کی پھلیاں توڑ کر کھانا۔ چلنے لگا۔

پتا جی جب بہن کے یہاں جاتے تو اپنے ساتھ مجھے ضرور لے جاتے۔ میں اپنی دادی سے کہانیاں خوب سنتا۔ دادی اور بھیا میں جھگڑا بھی ہو جاتا۔ میں دادی سے اپنی طرف منہ کرنے کو کہتا بھیا اپنی طرف۔ دادی مجھے زیادہ مانتی تھیں۔

پھر میرے پتا کی بدلی جون پور ہوئی۔ وہاں پتا جی کے ساتھ میں میری دادی گئی۔ بھیا اندور گئے۔

کچھ دنوں کے بعد چچی آئیں۔ یہ شادی دادی کو اچھی نہیں لگی۔ چاچی کے ساتھ ان کے بھائی وجے بہادر بھی آئے۔

چاچی آتے ہی مالکن بنیں۔ چاچی وجے بہادر کو زیادہ مانتی تھیں مجھے کم۔ پتا جی ڈاکخانے سے واپس آتے ہوئے جو بھی چیز کھانے کے لیے لاتے چاچی کی خواہش رہتی کہ وہ اسے خود کھائیں۔ وہ ان کی لائی ہوئی چیزوں کو پتا جی کے سامنے رکھتیں تو پتا جی بولتے "میں یہ چیزیں بچوں کے لیے لاتا ہوں۔ جب چاچی نہ مانتیں تو جھلا کر باہر چلے جاتے۔

کسی طرح ایک سال بیتا بہن اپنے گھر گئیں۔ دادی بھی گھر آئیں اور مر گئیں۔

پتا جی نے جو مکان لے رکھا تھا اس کا کرایہ ڈیڑھ روپیہ تھا۔ نہایت گندہ مکان تھا۔ اس کے دروازے پر ایک کوٹھری تھی۔ وہی مجھے سونے کے لیے ملی۔ میں کھیل کے لیے بغل میں ایک تمباکو والے کے مکان جایا کرتا۔ میری عمر اس وقت ۱۲ سال کی تھی۔

گورکھپور کے لڑکی

پتا جی کا تبادلہ گورکھپور کا ہوا۔ مکان یہاں بھی اسی طرح کا تھا۔ اس میں بھی وہی دروازے کی کوٹھری تھی۔ گورکھپور جب میں آیا تو میری عمر تیرہ سال کی تھی۔ مشن ہائی اسکول میں چھٹے درجے میں میرا نام لکھایا گیا۔ چاچی ساتھ تھیں۔ دادی تو مر چکی تھیں۔

مجھے پتنگ اڑانے کا شوق تھا' مگر پیسے پاس نہ تھے۔ دجنے بہادر مجھ سے عمر میں کم تھے۔ وہ ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں بھی تمباکو والے کی دکان مجھے مل گئی اور مجھے جب چھٹی ملتی تمباکو والے کی دکان پر چلا جاتا کیونکہ گھر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دہیں مجھے لکھنے لکھانے کا بھی شوق ہوا۔ میں لکھتا اور پھاڑتا' لکھتا اور پھاڑتا۔ کبھی کبھی میرے پتا جی حقہ پیتے پیتے میری کوٹھری میں بھی آ جاتے تھے۔ جو کچھ میں لکھ کر رکھتا وہ دیکھ لیتے اور پوچھتے "نواب کچھ لکھ رہے ہو؟" میں شرما کر گڑھ جاتا۔ مگر اس شعبے میں پتا جی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی کیوں کہ ایک تو انھیں کام کے مارے چھٹی نہیں ملتی تھی دوسرے اس میدان کے وہ جانکار بھی نہیں تھے۔ میں رات کو چاہے جہاں رہوں انھیں اس سے کوئی بحث نہیں تھی۔ میں باہر رہتا تھا وہ اندر۔ شاید پہلے کے لوگ اسے اپنی ڈیوٹی نہیں سمجھتے تھے کہ لڑکوں پر نظر رکھیں۔

میرے پڑوس میں رام لیلا ہوتی تھی رام لیلا کے رام لکشمن سیتا مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ میرے پاس اس وقت جو بھی چیز ہو میں رام کے لیے لے کر دوڑتا۔ پیسے بھی جو ہوتے انھیں کو دے آتا۔ اگر مجھ سے بات کرتے تو میں تو ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا۔ بڑی خوشی ہوتی تھی۔ میں بھی کیسا بھوندو تھا۔ آج کل کے بچے مجھ سے زیادہ چالاک ہوتے ہیں۔

پیسوں کی دقت تو مجھے ہمیشہ رہتی تھی۔ مجھے بارہ آنے مہینے میں فیس کے ملتے تھے۔ ان بارہ آنوں میں سے میں ایک آدھ آنہ ہر مہینہ کھا جاتا تھا۔ جس محلے میں تھا اس میں چھوٹی ذات کے لوگ تھے۔ وہ لوگ مجھ سے لے کر دو چار پیسے کھا لیتے تھے اس لیے فیس دینے میں مجھے بڑی دقت ہوتی تھی۔ گھر میں ماں تو تھی نہیں چاچی ہی سے مانگتا۔ وہ بری طرح جھلاتیں۔ پتا جی سے کہنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے اپنی ماتا کی یاد مجھے بار بار ستاتی تھی۔ سچ کہتا ہوں' جھوٹ بولنا بھی ایک فن ہے۔ سچ کہنے ہی کے کارن میں مارا جاتا۔ جس گھر میں میں تھا وہ ایک اہیرن کا تھا۔ وہ بیوہ تھی۔ ان میں اور میری چاچی میں کافی ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ میں بھی سنتا مجھے ان کے ہنسی مذاق میں مزہ آتا۔ مجھے تیرہ سال کی عمر میں ان باتوں کا علم ہو گیا تھا جو بچوں کے لیے قاتل ہیں۔

پتا جی کا تبادلہ ہو گیا۔ میں بھی ساتھ گیا۔ وہاں جو ہرکارہ تھا وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ مجھے کندھے پر لے کر دوڑتا۔ میں اس کے آنے کی راہ دیکھا کرتا۔ وہ باہر سے کیلا امرود گاجر میرے لیے لاتا۔ اسی وجہ سے وہ مجھے بہت پسند تھا۔ ایک دفعہ پتا جی نے اسے نکال دیا۔ جب دوسرے دن نہیں آیا تو میں نے چاچی سے پوچھا۔

''آج ہرکارہ کیوں نہیں آیا چاچی۔''

''مجھے کیا معلوم کیوں نہیں آیا۔''

خیر میں خاموش تھا۔ اندر سے میرا جی ڈر رہا تھا۔ جب پتا جی رات کو آئے ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا ''بابو جی ہرکارہ کہاں گیا؟''

''پاجی نکال دیا گیا۔''

''میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''بابو جی آدمی بڑا اچھا ہے''۔

پتا جی بولے ''گدھا تھا۔''

میں خاموش ہو گیا۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں سوچتا رہا بے چارہ کتنا بھلا آدمی ہے۔ میں بڑا ہونے پر ایسے آدمی کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔

میں صبح صبح اس کے یہاں دوڑا گیا اور بلا لایا۔ چپکے سے بھنڈارے میں سے جا کر آٹا، دال، چاول نکال لایا۔

چاچی نے بھی اسے رکھنے کے لیے سفارش کی اور میرے ہاتھ سے سب سامان لے کر تھوڑا تھوڑا دینے کو کہا۔

اس سال میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔

(پہلی قسط ختم)

بڑے بابو

ایک روز میرے پتا کے دوست بڑے بابو نے مجھے بلایا۔ میں گیا میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

''تو دبلا کیوں ہو گیا ہے؟ کیا دودھ گھی تجھے نہیں ملتا؟ تیری ماں نہیں دیتی؟ تم دودھ خوب پیا کرو۔ گھی بھی خوب کھایا کرو۔''

''ان کے ان لفظوں کو سن کر میں رو پڑا۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا کہا ''بیٹا رو مت۔''

''دوسرے روز میں نے دیکھا کہ چاچی نے میری دال میں کچا گھی ڈال دیا۔ میں نے کہا۔

''میری دال میں کچا گھی کیوں ڈال دیا؟''

''کیا نہیں پکا ہے۔''

میں نے کہا ''دال میں گھی ڈالا ہی کیوں؟''

''تم ہی تو گھر گھر روتے ہو کہ مجھے کچھ نہیں ملتا۔''

''میں نے کس سے کہا؟''

''بڑے بابو سے کہا ہے کہ میری چاچی گھی دودھ نہیں دیتی۔ اور کس سے کہے گا۔''

''میں نے نہیں کہا؟''

''تو نے نہیں کہا تو وہ ویسے ہی شکایت کرتے تھے؟ خود کھاتا نہیں مجھے بدنام کرتا ہے۔''

''میں نے کچھ نہیں کہا۔''

''جھوٹا مکار۔''

'مجھے رونا آ گیا۔

میں بولی ''جب آپ کو کھانا نہیں تھا تو رونے کیوں لگے؟''

وہ بولے ''اب تم مجھے کیسے کھلاتی ہو۔ عورت میں نسوانیت ہی نہیں ممتا بھی ہونی چاہیے۔ جب تک وہ جذبہ نہ ہو تب تک پیار اور پالنا پوسنا ممکن نہیں خواہ وہ کسی طرح کا ہو۔''

میں بولی ''اچھا اگر یہ بات تھی تو آپ کیسے کھانا چاہتے تھے؟''

وہ بولے ''مجھے گھی شکر کے ساتھ اچھا لگتا ہے ویسے نہیں۔ دال میں مجھے پسند نہیں۔''

میں نے کہا ''اب کیسے آپ کھاتے ہیں؟''

''اس طرح کے غرض پڑی تھی کہ مجھے کھلاتا۔ اسی وجہ سے میں کھاتا بھی نہیں تھا۔ پہلے بچوں کو وہ یہ پالنا ضروری بھی نہیں تھا۔ نہ کسی اور کے لیے ضروری تھا۔''

میں نے کہا ''یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ بچوں کو ضروری نہ تھا۔ میرے یہاں تو سب ہی دودھ پیتے تھے''۔

''تم زمیندار کی لڑکی ہو۔''

''پھر اسی طرح رہیے صاحب جس طرح رہتے تھے۔''

پانچ روپے کا گڑ۔

ایک سال کے بعد مجھے بنارس آنا پڑا۔ اس وقت میں پندرہویں سال میں تھا اور نویں میں پڑھتا تھا۔

پتا جی نے پوچھا ''دھپت تجھے کتنا خرچ چاہیے۔''

میں نے کہا ''پانچ روپے دے دیا کیجیے۔''

'پتا جی نے سمجھا سستے میں بالکل اور میں بنارس جب آیا تب میں نے سمجھا کہ دو روپے تو فیس ہی میں نکل جائیں گے۔ باقی بچے تین روپے۔ ایک روپے کا دودھ۔ یہ سب ملا کر پورا خرچ نہیں بیٹھتا۔ میں نے سوچا پرائیویٹ پڑھوں۔ دن بھر میں شہر میں رہتا۔ صبح چاچی گڑ اپنے پاس سے دے دیتی تھیں۔ دن بھر بنارس میں رہتا اور پڑھتا۔ گھر سے کسی طرح کی امداد ملنے کی امید نہ تھی کیونکہ غریبی کا گھر تھا۔ ایک کوٹھی کے سامنے رات کو ٹاٹ بچھا کر اس پر بیٹھ کر پڑھتا۔

جب امتحان قریب آیا تو مجھے پتا جی کا حکم ملا کہ پانچ روپے کا گڑ خرید کر اپنے پاس رکھ لوں کیونکہ میری شادی ہونے والی تھی۔ خیر گڑ تو میں نے خرید لیا لیکن ہم نے یعنی میں نے میرے چچیرے بھائی اور گاؤں کے کئی دوستوں نے اس گڑ کو باری باری کھانا شروع کیا۔ روز ہی سیر دو سیر گڑ نکلنے لگا۔ جب میں دیکھتا کہ گڑ کا صندوق خالی ہوتا جا رہا ہے تو میں سوچتا اب اسے نہیں چھوؤں گا۔ مگر گڑ کھانے کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ اس عہد کو نباہ نہ پاتا۔ ایک روز میں نے صندوق کی چابی کو دروازے کی دراز میں ڈال دیا۔ سوچ کر اب نہیں کھا سکوں گا' نہ رہے گا بانس نہ اب بجے گی بانسری۔ پھر بھی جب ٹولی اکٹھی ہوئی تو میں گڑ نہ کھانے کے عہد پر قائم نہ رہ سکا۔ عہد توڑنا ہی پڑا اور دراز میں سے کنجی نکالی گئی اور پھر گڑ کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب وہ آدھا رہ گیا تو میں نے صندوق کی چابی کنویں میں ڈال دی۔ پھر جب پتا جی گھر آئے اور چاچی نے گڑ مانگا تو صندوق کا تالہ توڑنا پڑا۔

'چاچی گڑ دیکھ کر بہت جھلائیں۔

میری شادی ہوئی۔ میں اپنی شادی میں بڑا خوش تھا۔ منڈپ چھانے کے لیے بانس میں نے خود کاٹا تھا۔

بیاہ

میرا بیاہ بستی ضلع کے مہنداول تحصیل کے رام پور گاؤں میں طے ہوا۔ وہ لوگ بڑے گھر کے زمیندار تھے۔ کچھ پورب کی رسومات ایسی ہیں کہ جب لوگوں نے مجھے گھر میں بلایا تو گھر میں سیکڑوں عورتیں تھیں۔ ہنسی مذاق کا بازار گرم تھا۔ مردوں میں سے تو میں وہاں ایک ہی تھا۔ مجھے ہنسی مذاق اچھا بھی لگتا تھا۔ سب مجھ سے ہنسی مذاق کرتی تھیں۔ میں اکیلا ان سے پریشان تو۔ اونٹ گاڑی سے آنا پڑا۔ جب ہم اونٹ گاڑی سے اترے تو میری بیوی نے میرا ہاتھ پکڑ کر چلنا شروع کیا۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑی تھیں تب میں نے ان کی صورت دیکھی تو میرا خون سوکھ گیا۔

میں بولی ''ٹھیک تو تھیں۔ تم بے پردی کو سیدھی پر مرا پنے کو کچھ سمجھنے لگے۔''

''نہیں جی۔ بے شرمی مجھے پسند نہیں تھی۔ جو جتنی دور رہتا ہے اسے اتنا ہی دیکھنے کے لیے اشتیاق ہوتا ہے۔''

اس پر میں کہتی ''اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ عورتیں ہمیشہ مردوں سے آگے رہتی ہیں۔ یہ تو اچھی ہی۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔ بڑے سے دبنا چھوٹے کو دبانا۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔''

''اجی تمہارے ساتھ پہلے سے میری شادی ہوئی ہوتی تو میری زندگی اس سے بہتر ہوتی۔''

''جب تک انسان اندھیری رات نہ دیکھے تب تک روشنی کی وقعت اسے کیسے معلوم ہو۔ تم اپنی چاچی کے ساتھ میری بھی مٹی پلید کر دیتے۔ پھر تم ہی نے کون سی میری مدد کی۔ مجھے خود اس گھر میں اپنی جگہ بنانی پڑی۔ صرف اپنے لیے نہیں آپ کے لیے بھی۔ اگر آپ میری بیوی ہوتے تو میں بتاتی کہ عورتوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہیے۔

''اچھا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں رہنا نہیں جانتا تھا؟''

''مرد کا کام یہ ہے کہ جسے بیاہ کر لائے اس کا مالک بنے۔''

وہ ہنس کر بولے ''میں نے تو آپ کو مالک بنا دیا۔''

میں بولی "مجھے مالک بنادیں۔ ایک کی مٹی پلید کردی اس کی خلش مجھے ہمیشہ رہتی ہے۔ جسے میں برا سمجھتی ہوں وہ ہمارے ہی یہاں ہو اور ہمارے ہی ہاتھوں ہو۔ میں خود تکلیف سہنے کو تیار ہوں لیکن عورت ذات کی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا کفارہ شاید مجھے بھی ادا کرنا پڑے گا۔ حالانکہ میں بے گناہ ہوں۔ میرے پتا کو معلوم ہوتا تو آپ کے ساتھ میری شادی وہ ہرگز نہ کرتے"۔

آپ بولے "وہ بدصورت تو تھیں ہی اس کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی میٹھی نہ تھیں اور یہ چیز انسان کو اور بھی دور کردیتی ہے۔"

میں نے کہا "آپ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا اپنا برتاؤ اچھا تھا؟ بس خاموش رہیے۔ جب آدمی خود ویسا نہ ہو تو دوسرے سے اس کی امید رکھنا بیکار ہے۔"

"میں نے ان کو ان کے گھر پہنچا دیا اور خود اپنے یہاں رہ گیا۔ اس میں میری کیا زیادتی ہے؟"

"آپ مرد تھے آپ مجھے بیاہ لائے وہ تو گھر میں بیٹھی ہیں۔ کیا عورتوں کے ساتھ یہ انصاف نہیں ہے؟ میں بھی بدصورت ہوتی تو آپ مجھے بھی چھوڑ دیتے۔ اگر میرا بس ہوتا تو میں سب جگہ ڈھنڈورا پٹواتی کہ کوئی بھی آپ کے ساتھ شادی نہ کرے۔

"اسی لیے تو تمہیں معلوم نہیں ہوا۔ پہلے قصہ بھی تو سنو پیچھے گرم ہولینا۔ میری بارات آئی۔ میرے پتا کو معلوم ہوا کہ میری بیوی بہت بدصورت ہے۔ بے حیائی کی حرکت انھوں نے باہر ہی دیکھ لی تھی۔ میری شادی چاچی کے پتا نے طے کی تھی۔ پتا جی چاچی سے بولے "لالہ جی نے میرے لڑکے کو کنویں میں ڈھکیل دیا۔ افسوس میرا گلاب سا لڑکا اور اس کی بیوی ایسی بیوی۔ میں تو اس کی دوسری شادی کروں گا۔ چاچی نے کہا "دیکھا جائے گا"۔

"جب میری چاچی چھدیا جانے لگیں تو میری بیوی کو بھی ساتھ لیتی گئیں۔ چھ مہینے بھی پتا جی وہاں نہیں رہنے پائے کہ ان کا تبادلہ لکھنو ہوگیا۔ میں ان دنوں نویں میں پڑھتا تھا۔ پتا جی لکھنو جاتے وقت سب کو مڑھواں پہنچا گئے۔ میں تو پہلے ہی سے وہاں تھا۔ اب یہ سب بال میرے سر پڑی۔ چاچی میری بیوی پر حکومت کرتی تھیں۔ اس کی شکایت بھی چاچی اکیلے میں مجھ سے کیا کرتی تھیں۔ وہ بھی اپنی قسمت کو روتی تھیں۔ بیچ میں میری مرن تھی۔ اگر چاچی بیچ میں نہ ہوتیں تو شاید میری ان کی زندگی ایک ساتھ بیت بھی جاتی۔"

میں بولی "اس کا مطلب ہے یہ کہ آپ بالکل بھوندو تھے۔"

آپ بولے "کہہ تو دیا کہ میں سچ مچ میں بھوندو تھا۔ میں کسی پر حکومت نہیں کرسکتا تھا۔"

"تب ہی تو اس کی زندگی مٹی میں ملادی۔ افسوس"۔

اپنے پتا کے مرنے کے بعد کی اپنی زندگی کا حال خود انھوں نے لکھا ہے۔ اس کے ساتھ میں اسے بھی یہاں شامل کیے دیتی ہوں۔

چنار گڑھ

''میں جاڑے کے دنوں میں چنار گڑھ سے گھر آیا تھا اور میرے ساتھ وجے بہادر بھی تھے۔ جو میری ان ماتا کے بھائی تھے۔ ان کے پتا زندہ تو تھے لیکن انھوں نے اپنے لڑکے کو بھی میرے سر پر رکھ دیا۔ میں وہاں پانچ روپے کا ٹیوشن بھی کرتا تھا۔ کھانے والے کا انتظام وجے بہادر ہی کیا کرتے تھے۔ پیسے جو ملتے تھے وہ تو پہلے ہی خرچ ہو جاتے تھے۔ پھر ادھار پر چلتا تھا۔ میوہ اگر ایک روپے کا آتا تو چار چھ روز ہی میں ختم ہو جاتا۔ پھر معاملہ ادھار پر چلتا تھا۔ روٹیاں ادھار پر چلتی تھیں۔ بورڈنگ ہاؤس کا بنیا تو اسی سے لیتا تھا۔ ایک بڑی بات ہے، میں گھر آیا چار پانچ دن گھر رہا۔ جس روز مجھے جانا تھا چاچی سے روپے مانگے۔ بولیں، روپے خرچ ہو گئے۔ گاؤں میں کس سے ادھار لیتا۔ گاڑی سے بہت پہلے میں اور وجے بہادر چل دیے۔ میں نے اپنا گرم کوٹ شہر میں دو روپے میں بیچا۔ وہ کوٹ ایک سال پہلے میں نے بڑی مشکلوں سے بنوایا تھا۔ جاڑوں کے دن تھے، گرم کوٹ تھا مگر سوتی پہن کر میں نے اسے بڑے جتن سے رکھ رکھا تھا۔ اسے بیچ کر میں وجے بہادر کے ساتھ چنار گڑھ پہنچا''۔

الہ آباد

جب میں الہ آباد گیا تو مجھے دس روپے ملتے تھے۔ دس روپے میں سات روپے گھر بھیجتا تھا۔ پانچ روپے کی ٹیوشن کر کے آٹھ روپے میں اپنا گزر کرتا تھا۔ صبح اٹھ کر منہ دھو کر روٹی پکاتا، روٹیاں سینک کر اسکول جاتا۔ انھی دنوں میں نے کرشنا کا ایک چھوٹا سا ناول لکھا تھا اور انڈین پریس میں چھپوایا تھا۔ یہ دو سال نے دن ادھار کھاتے میں بیتے۔ سنہ ۱۹۰۴ میں میں پاس ہوا۔ چھٹیوں کے دن تھے میں گھر آیا تو انھی دنوں مجھ میں اور میری بیوی میں جھگڑا ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چاچی نے کافی شکایت بھی ان کی کی تھی۔ غصے میں آ کر میں نے ان کو ڈانٹا۔ وہ بھی جھلا گئیں مجھ پر۔ میں نے کہا ''اس سے بہتر ہو گا تم اپنے گھر جاؤ۔'' میں نے وجے بہادر سے کہا ''انھیں پہنچا آؤ۔'' میرا کہنا تھا کہ وہ انھیں پہنچا آئے۔

اس کے ایک سال پہلے میری چاچی اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ میری بیوی تھی اور میں تھا۔ گھر میں

میری چچی اور پھپیری بھابھی تھیں۔ خیر ان دنوں ان کے پیر میں تکلیف تھی۔ کبھی کبھی وہ بھوت پریت کی طرح آؤ باؤ بکتی تھیں۔ ایک پنڈت اوجھائی کا کام کرتے تھے۔ وید کا بھی کام کرتے تھے۔ میری چچی نے کہا انھیں بلاؤ۔ میں انھیں بلا لایا۔ پنڈت جی آئے اور اوجھوں کی طرح انھوں نے کچھ الا بلا ئے کیا۔ میں بھی دوپہر تک بیٹھا بیٹھا انھیں کے ساتھ ہوں کرتا رہا۔ انھوں نے پیر میں مالش کرنے کو تیل بتایا۔ میں نے انھیں سے تیل بنوایا۔ ان کے پیروں کی مالش کرنے کے لیے ایک نائین لگائی۔ جب وہ اچھی ہوئیں تو مجھ سے بہن کو بلانے کو کہا۔ میں نے یہ بھی کیا۔ اس پر جب چاچی گھر آئیں تو روپیوں کا حساب انھوں نے پوچھا۔ میں نے بتا دیا کہ روپے اس اس طرح خرچ ہو گئے۔ سارا حساب انھیں دے دیا۔ اس وقت چاچی کی نظر میں میں نے یہ دو بڑی غلطیاں کیں۔ تب ہی سے ان میں اور بھابھی میں پٹتی نہ تھی۔ میری بہن کو بھی انھوں نے کافی تکلیف دی۔ جھگڑا آئے دن ہوا کرتا تھا۔

"بہن کو میں نے بدا کر دیا۔ وہ اپنے گھر گئی۔ ہاں ان کی یہ خواہش رہی کہ میں انھیں ہمیشہ ساتھ رکھوں۔ مگر میں کیا کرتا میرے حالات ہی اور تھے۔ اس کے بعد میں کانپور تیس روپے پر ماسٹر ہو کر چلا آیا۔

"دسمبر میں میں پھپیرے بھائی اور وجے بہادر کو لے کر کانپور آیا۔ دس روپے کا ٹیوشن بھی کر لیا۔ وہیں سنہ ۱۹۰۵ میں میری شادی ہوئی۔

شورانی

میری پہلی شادی گیارہویں سال میں ہوئی تھی۔ وہ شادی کب ہوئی اس کی مجھے خبر نہیں۔ کب میں بیوہ ہوئی اس کی مجھے خبر نہیں۔ بیاہ کے تین چار مہینے کے بعد ہی میں بیوہ ہو گئی۔ اس لیے مجھے بیوہ کہنا میرے ساتھ ناانصافی ہوگا جو بات میں جانتی ہی نہیں اسے میرے متھے چپیٹنا ٹھیک نہیں۔

میرے پتا کا نام منشی دیوی پرشاد تھا۔ فتح پور ضلع سیلم پور؛ اکھانہ کنوار میرے پتا مجھے اس حالت میں دیکھ کر خوش نہ تھے۔ وہ اپنے کو منا کر مجھے سکھی دیکھنا چاہتے تھے۔ پہلے تو انھوں نے پنڈتوں سے صلاح لی پھر انھوں نے اشتہار نکلوایا۔ اشتہار آپ نے بھی پڑھا۔ اس کے بعد کئی جگہ لڑکے طے ہوئے۔ مگر میرے پتا کو لڑکے پسند نہ آتے۔ انھی دنوں آپ نے انھیں خط بھیجا۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے یہاں تک پڑھا ہے اور میری اتنی آمدنی ہے۔ میرے پتا نے لکھا "آپ فتح پور آیئے میں وہاں ملوں گا۔ بابو جی فتح پور گئے۔ آپ میرے پتا کو پسند آئے انھوں نے

آپ کو بڑ چھا اور کرانے کے روپے دیے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میری شادی کہاں ہو رہی ہے۔ میری شادی میں آپ کی چاچی وغیرہ کسی کی رائے نہیں تھی صرف آپ کی دلیری تھی۔ آپ سماج کا بندھن توڑنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنے گھر والوں کو بھی شادی کی خبر نہیں دی۔ میری شادی ہوئی۔ شادی میں ہی میں گھر آئی اور چودہ روز رہی۔ میری طبیعت لگتی نہیں تھی کیوں کہ میری ماں مر چکی تھیں۔ ایک میرا بھائی پانچ برس کا تھا۔ اس کو میں اس طرح پیار کرتی تھی جیسے ماں اپنے بچے کو کرتی ہے۔ میرے جب چودہ سال پورے ہوئے تھے تب ہی ماں مر چکی تھیں۔ میرا بھائی تب تین برس کا تھا۔ اسی زمانے سے مجھے اپنی ذمے داریوں کا احساس ہوا۔ تب سے میں آج تک اپنی ذمے داری نباہ رہی ہوں۔ بعد کو کیا ہوگا اسے مستقبل جانے۔ میں نہیں جانتی۔

پھاگن میں میری شادی ہوئی' چیت میں آپ سب ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے۔ میں مہینے بھر یہاں رہتی تھی تو دس مہینے اپنے گھر۔ مجھے یہاں اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ روزانہ جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔

کانپور کا جیون

آپ صبح چار بجے اٹھتے تھے۔ حقہ پی کر بیت الخلاء جاتے۔ ہاتھ منہ دھوتے اور جو کچھ ہوتا اس کا ناشتہ کرتے۔ چستی کے ساتھ بیٹھ کر لکھتے۔ قلم مزدوروں کے پھاوڑے کی طرح تیزی سے چلتا تھا۔ اس کے بعد بیت الخلاء جانا' پھر کھانا کھانا۔ دورے پر بھی ادب کا کام انھوں نے نہیں چھوڑا۔ جب معائنہ کرنا ہوتا تو اس کام کو مدرسوں کو سونپ دیتے۔ وہ کہتے "کیا کروں' میں جب معائنہ کرتا ہوں تو مدرس لوگ لڑکوں کے سامنے پرچہ چھوڑ آتے ہیں۔ اس واسطے اس کام کو میں انھی پر چھوڑ دیتا ہوں جس سے کم سے کم یہ تکلیف تو انھیں نہ اٹھانی پڑے۔ وہ بے چارے خوش بھی رہتے ہیں۔ اچھا معائنہ ہو جانے پر ان کی ترقیاں بھی ہوتی ہیں"۔

میں بولی "تو آپ کو رکھنے کی ضرورت گورمنٹ کو کیا تھی؟"

"اپنا کام کرنا اس کا کام ہے میرا کام کرنا اپنا۔ کیا یہ بڑے بڑے افسر دیوتا ہی ہیں!"

"کچھ ہوا اپنا سب کام اپنے کو کرنا چاہئے۔"

"کرتا تو ہوں' کہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ اگر میرے کام سے کچھ فائدہ ہو تو کیا برا ہے۔ دنیا کے سب کام اسی طرح چلتے رہتے ہیں"۔

''آپ کو اپنے افسروں کی ہمدردی تو نہیں ملی ہاں ماتحتوں کے ساتھ آپ نے بھائی چارہ ہمیشہ رکھا کیوں کہ افسری کرنا آپ کو پسند نہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''افسر بن کر انسان انسان نہیں رہتا۔ ایشور مجھے اس سے ہمیشہ دور رکھے۔''

وہ جس حالت میں رہتے ہمیشہ خوش رہتے تھے۔ ان کو دنیوی چیزوں کا رنج نہ تھا۔ ہاں ماں کی محبت ان میں بہت تھی ابھی تک ان کی آنکھیں ہمیشہ ڈھونڈا کرتی تھیں۔ جس کو وہ اپنی ماں سے پیار کرتے ہوئے نہ دیکھتے تھے اس پر انھیں غصہ آتا تھا۔ جو لڑکا اپنی ماں سے پیار نہ کرتا اسے وہ انسانی جذبات سے عاری سمجھتے تھے کہ کیا کہا جائے۔

ایک دن میں نے کہا ''آپ نے اپنی بہن کو پندرہ سال بعد کیوں بلایا؟ کتنی پیاری شکل ہے؟ ہاں ماں کے لیے آپ البتہ روتے تھے انھیں تو میں نے نہیں دیکھا ہے۔''

''تم نے اس کی وجہ پوچھی تھی تب ہی ایسا کہتی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری چاچی کے بھائی سے ان کا جھگڑا ہوتا تھا۔ ان کا گھر تھا رہنے کے لیے۔ آپ ہوتیں تو کہاں جاتیں؟ اگر میں ان کو اپنے ساتھ رکھتا تو وہ کہتیں تم نے ایک عورت اور ایک بچے کو بھی نکال دیا۔''

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اب آپ کی وہ خوشامد نہیں کر رہی ہیں۔''

''نہیں جی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔''

مجھے ان سے کوئی آٹھ سال تک نہیں پٹی کیونکہ گھر میں چخ چخ بہت تھی۔ میں چخ چخ کی عادی نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اپنے لیے خود جگہ پیدا کروں ان کی بیوی ہونے کے ناتے گھر کی مالکن بن کر بیٹھوں۔ اور میں سوچتی تھی کہ میں یہ جھنجھٹ کیوں مول لوں میں بھی دیکھو دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی ساس سے سن چکی تھی کہ وہ کیسا برتاؤ میری سوت سے کر رہی تھیں اور یہ بھی یہ چپ نہیں ہوتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ کل میرے کام پر مجھ سے بھی ناراض ہوں۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ میں حکومت کرتی۔ میں بھی اپنے میکے میں چین سے رہتی تھی۔ ایک دفعہ میرے پتا کا خط آیا۔ انھوں نے مجھے بلایا تھا۔ اس کا جواب آپ نے دیا کہ میں نہیں بھیجا کروں گا۔ یہ انکار کرنا مجھے پیچھے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ میں اس پر جھلائی۔ آپ کمرے میں آئے۔ میں اٹھ کر باہر جانا چاہتی تھی۔ آپ بولے ''کہاں جا رہی ہو؟''

''باہر جا رہی ہوں۔''

''جاؤ گی کہاں آخر کار۔''

''اچھا نہیں جاؤں گی۔ آپ ہی یہاں سے جائیے۔''

"تب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"ہاں تو میں بھی مجبور ہوں" میں نے کہا۔

انہی دنوں میرے خلاف ان کی چاچی نے ان سے کئی باتیں کہی تھیں۔ وہ مجھ سے ناراض تھے۔ سوچتے تھے یہ مجھے منائیں تو میں اپنے دل کی باتیں بتاؤں۔ مگر میں ایسی اڑیل تھی کہ مجھے اس کا کوئی غم نہ تھا۔ کئی روز کے بعد خود میرے پاس آئے اور بولے "مجھے تم ایسا کیوں کہتی تھیں؟"

"میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔" میں نے کہا۔

"نہیں تم نے کہا ہوگا تب ہی تو چاچی کہتی تھیں۔"

میں بولی "اگر آپ کو میری باتوں کا وشواس ہو تو یقین کیجیے میں نے کہا۔ اگر آپ کو وشواس نہیں ہے تو میں کیا کروں"۔ ان کو وشواس ہو گیا کہ میں نے نہیں کہا۔ بولے "دیکھو یہ چاچی کی بڑی خراب عادت ہے اسی طرح پہلے بھی وہ کہا کرتی تھیں اور یہ اسی طرح بہت باتیں کہا کرتی ہیں۔ غالباً تم سے میری خلاف کہتی ہوں گی۔ تب ہی میں دیکھتا ہوں تمہارے غصے کا پارہ چڑھا ہی رہتا ہے"

"اگر میرا پارہ چڑھ جائے تو کیا؟ آپ کا پارہ کیوں چڑھ گیا۔ آپ تو سمجھدار ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں تم سے کہتا ہوں پردہ کیوں نہیں چھوڑتیں؟ کوئی لونڈے کی بیوی نہیں ہو۔ میں دس سال تک کافی پردہ کرا چکا۔ پھر میری ماں بھابھی بھی نہیں ہیں۔ دس برس کے بعد چاچی کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

مجھ سے بے حیائی نہیں ہوتی۔"

"اگر تم سے بے حیائی نہیں ہوتی تو روزانہ ایک نہ ایک پنچ شاخا کرے گا۔"

"آپ بھلا تو جگ بھلا۔ جب آپ لونڈے نہیں تو اس طرح کی باتیں سنتے ہی کیوں ہیں؟ اور اگر سنتے ہیں تو اس پر دھیان کیوں دیتے ہیں؟ اگر آپ دھیان دیتے ہیں تو میں مجبور ہوں۔ انسان اپنے کو تو ٹھیک کر نہیں پاتا دوسرے کو کہاں تک ٹھیک کرے گا۔

"تم کچھ نہ کرو میرے متھے تو سب پڑتا ہے۔"

"آپ کی پالی ہوئی بلا بھی تو ہے۔ پہلے ہی سے آپ ٹھیک رہتے تو ایسی حالت کیوں ہوتی۔"

"میں کیا کہوں میری قسمت ہی ایسی ہے۔"

''ہاں صاحب جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھگتتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''سچ کہتا ہوں تم بڑی ظالم ہو۔ تم کو بھی میرے اوپر ترس نہیں آتا۔''

''ارے بھائی ترس آنے کی کوئی بات ہو تو میں سنوں۔'' میں نے کہا۔

''جو کہتا ہوں اسے سنو۔ سنا یہی ہے کہ تم پردے کو چھوڑ دو۔''

میں بولی ''ہماری جو بات ہے وہ اپنے ساتھ ہے۔''

''تو گھر کیسے چلے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

''جیسے چل رہا ہے بہت ٹھیک ہے۔ میں اس بات کو نہیں ماننا چاہتی۔ پھر آپ کو تو کافی پیار کرتی ہیں۔ میری بات چھوڑ دیجئے۔ میں بھی جس حالت میں ہوں اس حالت میں رہ لوں گی۔ میں بھی مست آدمی ہوں'' میں نے کہا۔

''ہاں اس میں مست رہتی ہو کہ آرام سے بیٹھی رہتی ہو۔ جس کو تم پیار سمجھتی ہو وہ پیار نہیں ہے۔ اپنی ماں کا پیار سب غرض ہوتا ہے جب وہی مجھے نصیب نہیں ہوا تو میں اس کے پیچھے کہاں تک دوڑوں۔'' یہ بات کہتے کہتے ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس روز سے مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ اسی دن سے میں ان میں ملنا چاہنے لگی۔ جب وہ اٹھنے لگے تو مجھ سے بولے ''سچ مانو میں نے اپنے کو تمہیں سونپ دیا۔''

تب سے میں واقعی ان پر حکومت کرنے لگی۔ تب ہی سے میں ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی۔

مہوبا

اس کے بعد آپ مہوبا گئے۔ میرے پتا نے مجھے پہلے ہی بلا لیا تھا۔ اب مجھے بھی بلایا۔ انھیں بھی۔ اس کو وہ مان بھی گئے۔ جس روز میرے جانے کا وقت ہوا اور تانگہ دروازے پر آیا تو ان کی چاچی چلا کر بولیں ''خبردار اگر ان کو بھیجا اپنے تو جا رہے ہیں مہوبا انھیں بھی بھیج رہے ہیں اپنے گھر!''

''ان کو آپ کیوں نہیں دیتیں؟!''

''ان کو گھر پہنچا دو گے تو ٹھیک نہ ہوگا۔ تانگہ واپس کر دو۔''

میں بولی ''میں رہوں گی ہی نہیں یہاں۔''

''میں کیا کروں، بولو؟''

''میں یہ نہیں سننا چاہتی۔''

آپ میرے سامنے ہنستے ہوئے بولے ''ان کو منالینا کٹھن ہے، تمھیں نہیں۔ تم ایک ہفتہ یہاں رہو۔ بعد میں تمھیں مہوبا لے چلوں گا۔ تم کو اگر پہنچایا تو بڑھیا مجھے زندہ نہ چھوڑے گی۔''

خیر میں راضی ہوگئی۔ وہ چلے گئے۔ وہاں جا کر چارج لیا۔ وہاں سے گیارہویں دن آپ آئے۔

جب وہاں چلنے کے لیے تیار ہوئے تو چاچی بولیں میں نہیں جاؤں گی۔ کیونکہ ان کے دونوں بھائی کانپور میں ہی ہمارے ساتھ تھے اور بڑے بھائی وہاں ۲۴/ ماہوار پر نوکر بھی ہو گئے تھے۔ انھیں کے پاس وہ رہنا چاہتی تھیں۔

وہ بولے ''چاہے تم جاؤ یا نہ جاؤ میں انھیں لے کر جاؤں گا''۔

چاچی بولیں ''ہاں تم ان کو لے جاؤ۔''

اس کے بعد بڑے بھائی نے کہا کہ تم ان کے ساتھ جاؤ۔ نہیں جاؤ گی تو ہمیشہ پچھتاؤ گی۔ نواب پہلے نہیں ہیں کہ پیچھے پڑے رہیں گے۔''

چاچی بھی راضی ہوگئیں۔ وہ بھی مہوبا گئیں۔ تین مہینے کے بعد پھر ان کی چاچی اپنے لڑکے کے ساتھ کانپور لوٹ گئیں۔

مہوبا کی زندگی تھی۔ صبح اٹھنا، کچھ حاؤ کر ادب کی سیوا کرنا۔ ہاں، میں نے انھیں ان کے صاحب کو پیار کرتے پایا۔ ماتحتوں کو وہ دوست بنانا چاہتے تھے۔ ماتحتوں میں جو بڑا ہوتا تھا اس کی عزت بزرگ کی طرح کرتے تھے۔ وہیں میرے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ کملا وہیں پیدا ہوئی۔ میں اکیلی مہوبے میں دس مہینے رہی۔ ان دنوں وہ دورہ کرنے جاتے تو ڈیڑھ دو مہینے میں آتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ میں بھی دورے پر چلوں۔ میں اکیلی مہوبے میں رہتی تھی، یہ انھیں پسند نہ تھا۔ مگر یہ دورے کا جیون مجھے بالکل پسند نہ تھا اس لیے میں مہوبے میں ہی رہتی تھی۔

مہوبے میں بیگار میں دودھ، گھی، برتن سب ملتے تھے، مگر کھانے کا سامان وہ اپنے پاس سے منگاتے تھے۔ دودھ تو اتنا ملتا تھا کہ نوکر لوگ کھویا بنا کر کھاتے تھے۔ پہلے تو بیگار لینے سے انھوں نے انکار کیا پھر وہاں کے رئیسوں نے کہا کہ یہ دستور ہے۔ آپ یہ دستور ہٹا دیں گے تو یہ کبھی کسی کو بیگار وغیرہ دیں گے ہی نہیں۔ تب اس پر انھوں نے کہا کہ میں تو نہیں کھاؤں گا میرے نوکر کھائیں گے۔

ان لوگوں نے کہا" آپ نہ کھائیں آپ کے نوکر ہی سہی"۔

وہاں ایک رواج یہ ہے کہ کسی بھی افسر کے ماتھے پر تلک لگا کر وہ روپیہ دیتے ہیں۔ ان سے آپ دہی۔ اکشت (چاول کا ثابت دانا) تک تو لگوا لیتے تھے۔ بس پان اٹھا کر منھ میں ڈالا اور گلے ملے۔ روپے کے لیے آپ کہتے تھے" مجھے معاف کیجیے"۔

اس نے اگر کہا کہ یہاں کا رواج ہے تو بڑے ہی میٹھے لہجے میں کہتے تھے" نہیں صاحب' یہ میرا اصول نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ مجھے معاف فرمائیں"۔

چپراسی وغیرہ کو جو ملتا تھا تو اسے وہ منع نہیں کرتے تھے۔ دورے پر گھوڑے پر جاتے تھے۔ جاڑے کے دنوں میں خود آپ کمبل اوڑھتے تھے گھوڑے کو دوشالہ اڑھاتے تھے۔ میں تو انھیں دیکھتی تھی کہ وہ جانوروں کی بھی محبت میں ہمیشہ گھرے رہتے تھے۔ میں نے انھیں بہت ہی سیدھا پایا۔ میں ضرورت سے زیادہ غصے ور تھی مگر میرا غصہ بھی وہ کافور سا اڑا دیا کرتے تھے۔ گھر میں وہ ہوے کی طرح نہیں رہتے تھے۔ شام کا وقت وہ ہمیشہ گپ شپ کو دیتے تھے۔ بغیر کام کے وہ کہیں نہیں جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے۔۔۔
کاتک کا مہینہ تھا۔ انھی دنوں بیل گاڑی رکھنی تھی۔ پاس پیسے نہ تھے مجھ سے بولے" بیل گاڑی لینا ہے مگر روپے نہیں ہیں۔ بیل گاڑی لے لیتا تو کم سے کم ۲۰ روپے اس کا بھتہ ملتا"۔
مجھے بھی خبر نہیں تھی کہ میرے صندوق میں روپے ہیں کیونکہ جو روپے آتے تھے۔ انھیں میں صندوق کے خانے میں ڈال دیتی تھی' پھر اسے دیکھنے کی مجھے فکر نہیں ہوتی تھی۔ اتفاق سے اسی وقت انھوں نے مجھ سے روپے مانگے نوکر کو دینے تھے۔ جب میں نے صندوق کھول کر دیکھا تو اس میں مجھے زیادہ روپے دکھائی پڑے۔ میں نے ہاتھ ڈال کر خانے میں سے سب روپے نکالے۔ نوٹ اور روپے ملا کر ڈیڑھ سو تھے۔ میں خوب خوش ہو کر ان کے پاس آئی اور بولی" میں آپ کو ڈیڑھ سو روپے دے سکتی ہوں"۔
آپ ہنس کر بولے" واہ' تمہارے صندوق میں ڈیڑھ سو روپے پڑے ہیں تم کو خبر بھی نہیں"۔
میں بولی" کیا میں اسے غریب کی بہاری (جھاڑو) کی طرح ہمیشہ دیکھا کرتی ہوں؟ پڑے رہیں گے تو صندوق میں رہیں گے۔ خرچ ہونے پر کیسے پائیں گے۔

آپ بولے" چلو بیڑا پار ہوا۔ اس میں گاڑی اور بیل سب آ جائیں گے"۔
دن بھر میں دوسرے روز گاڑی اور بیل دونوں آ گئے۔

مجھ سے بولے" ایک بات تم میری مان جاؤ۔ کل چلو۔ چرکھاری میں میلہ ہے دیکھ آئیں"۔

میں نے کہا "چلیے۔"

ہم سب ملا کر دس آدمی چلے۔ ہم سب بیل گاڑی سے گئے۔ خود گھوڑے سے گئے۔

وہاں جا کر خیمہ لگوایا۔ راجہ صاحب کے آدمیوں کو معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب آئے ہیں تو رسد ان کے یہاں سے آئی۔ خیر شام کو کھانا بنا۔ چپراسی مہاراج تھا اس نے کھانا بنایا۔ سب لوگوں کے کھا چکنے پر میلہ دیکھنے کی ٹھہری۔ میں اور میری سکھی تو زنانے حصے میں گئے آپ لوگ مردانے میں گئے۔ سرکس وہاں بہت اچھا ہوتا تھا۔ مگر میں تو دو ڈھائی ہی گھنٹے میں گھبرا گئی۔ میں اپنی سکھی کو لے کر ڈیرے پر چلی آئی۔ آپ لوٹے کوئی ڈیڑھ بجے۔ میں میری سکھی خیمے کے اندر تھے آپ سب لوگ باہر آ کر بولے "کیا تم نے کچھ دیکھا نہیں پہلے ہی چلی آئیں۔"

"ہاں میں چلی آئی میری طبیعت نہیں لگی۔ گانا بے لذت۔ اتنی دور آئی اور تماشہ بھی نہیں دیکھا۔"

دوسرے روز ہم لوگ گھر چلے آئے۔ میں سات سال وہاں رہی۔ بہت بار میلہ دیکھنے کی بات آئی مگر میں جانے کو راضی نہ ہوئی۔ وہ خود گئے۔ کبھی کبھی گھومنے کی میری خواہش ہوتی تھی تو میں کہتی کہ جنگل کو چلنا چاہیے۔ آپ خوشی سے تیار ہو جاتے۔ ہم دونوں جنگل کے شروع ہوتے ہی گاڑی وہاں چھوڑ کر اندر داخل ہو جاتے۔ دن بھر وہیں جھاڑیوں میں پانی پیتے۔ پھل کھاتے' وقت گزارتے' پہاڑوں کی بھی سیر کرتے۔ شام تک مہوبا واپس آتے۔ جن کو میں پیار کرتی ان کو وہ ضرور پیار کرتے۔ مہوبے میں جس محلے میں میں تھی وہ کاستوں کا محلہ تھا' وہ لوگ بھی تیج تہواروں کو آتے تھے۔ آپ بھی سب کے ساتھ بھائی چارے کا برتاؤ کرتے تھے۔ میں خود کبھی کسی کے گھر نہیں گئی' مگر ان کی عورتیں ہمیشہ ہمارے یہاں آتی رہتی تھیں۔

مہوبے میں عورتیں اپنی بارات کے بدا ہونے کے بعد رات کو ہر ایک کے گھر میں بجاتی گاتی جاتی ہیں' اور ایک ہاتھ میں آرتی کا تھال لیے رہتی ہیں۔ جو مرد گھر میں رہتا ہے' بارات میں نہیں جاتا اس کو اسی سے مارتی ہیں۔

ایک بار میرے یہاں بھی وہ آئیں۔ دروازے پر آپ سوئے تھے۔ چپراسی وغیرہ کو انھوں نے پیٹا بھی مگر نہ معلوم کیوں آپ کے ساتھ ان لوگوں نے دیا کی۔ آپ ڈر کے مارے پہلے ہی کمرے میں بھاگ آئے تھے۔

مہوبا (۲)

جب میں مہوبے میں تھی تو ان کی چاچی اور ان کے لڑکے کانپور اپنے ماموں کے پاس پڑھنے چلے

آئے۔ میں اکیلی مہوبے میں رہی۔ آپ بھی ساتھ۔ آپ مجھ سے برابر اصرار کرتے کہ تم بھی ساتھ ساتھ دورے پر رہو۔ مجھے ہمیشہ تمہاری چنتا لگی رہتی ہے اور تمھیں تکلیف بھی تو ہوتی ہے۔

''میں کیسے رہوں گی۔''

''اس میں حرج کیا ہے۔ یہ معائنہ کرنے جب جاؤں تب بھی تم میرے ساتھ رہا کرو۔ وہاں میری راوٹی (چھولداری) لگی رہتی ہے تم اس میں بیٹھ کر آرام سے پڑھتی رہنا۔ مہراج کھانا پکانے کے لیے ساتھ رہتا ہی ہے۔ کون میں ہی دن بھر معائنہ کرتا رہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹے بھر۔ شام کو ہم لوگ پہاڑ گھومنے نکل جائیں گے۔

''کون ہندوستانی اپنی بی بی کو لے کر دورے پر گھومتا ہے۔ ایک تماشہ سا ہوگا۔''

''مجھے تو تماشہ سا کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ میں چاہتا ہوں تم اپنے دماغ سے پرانی باتوں کو نکال دو۔ لیکن تم پیچھے رہ گئی ہو۔''

''مجھے تو مذاق سا معلوم ہوتا ہے۔''

''انگریزوں کو دیکھو کتنے آرام سے رہتے ہیں۔''

''یہ انگریزوں کا ملک نہیں ہے یہ ہندوستان ہے۔''

تب ہی تو پریشان ہیں۔ مجھے بیہودا پن معلوم ہوتا ہے۔ تم اکیلی یہاں رہو میں دورے پر پریشان رہوں''۔

''اس میں فائدہ کیا ہے؟''

'' کچھ بھی ہو شرم محسوس ہوتی ہے۔ پھر آرام کیا رہے گا؟ آج یہاں کل وہاں۔ کیا فائدہ ہے؟''

''میں تو روز اسی طرح گھومتا ہوں۔''

''آپ کو تو گھومنے کے لیے ہی سرکار تنخواہ دیتی ہے بھتہ اوپر سے۔ مجھے کیا ملے گا؟''

''تمھیں آرام ملے گا اور کیا؟''

''میں ایسے آرام سے باز آئی۔''

''تو پھر میں مجبور ہوں۔''

ان کی بہن اور وہ

ان کی چاچی اور ان کی بہن میں نہیں پٹتی تھی۔ پندرہ سال تک ان کی بہن چاچی کے بیر کی وجہ سے

میکے نہ آسکیں۔ میں اکثر ان سے پوچھتی کہ آپ اپنی بہن کو کیوں نہیں لاتے؟"

"ان کو کیسے بلاؤں۔ چاچی اور ان میں بالکل نہیں پٹتی۔"

میں بولی "تو کیا چاچی کے ہاتھ آپ بک گئے ہیں؟ بہن کا حق چاچی سے پہلے ہے۔"

"لیکن حالات تو الٹ ہیں۔ بتا جی ہیں نہیں۔ بہن اپنے گھر میں آرام سے ہیں۔ یہاں آنے پر ان کے ساتھ جھگڑا ہوتا ہے۔ یہ اپنے میکے نہیں جاسکتیں۔ ان کے دونوں بھائی میرے سر پر ہیں۔"

میں بولی "اس میں آپ کی غلطی ہے۔"

"یہ تمہاری ناانصافی ہے۔"

"ناانصافی کیسی جس عورت کے ماں باپ دونوں مر گئے ہوں اور اس کا اکلوتا بھائی موجود ہو لیکن وہ اسے بلانے تک نہیں۔ وہ اپنے دل میں کیا کیا سوچتی ہوں گی۔ اگر میں منع کرتی تو بھی آپ کو بلانا چاہیے تھے۔

انھوں نے کہا "تمھیں نہیں معلوم۔ تم ہی سے رات دن جھگڑا ہوا کرتا ہے۔ ان کے آنے پر تمھیں کون سا سکھ ملے گا۔"

میں بولی "اس سے اچھا تھا آپ شادی نہ کرتے۔"

"بھائی تم میں ان میں فرق بھی تو ہے۔ تم تو کچھ کہہ بھی سکتی ہو۔ بہن تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتیں۔"

"میں ان دلیلوں کو سننے کو تیار نہیں ہوں۔"

"تم خود سمجھو۔ مجھے اپنی ماں بہن کا پیار نہیں ہو سکتا؟"

"پر آپ دبو جو ہیں۔ آپ ہی نے انھیں سر چڑھا رکھا ہے۔ نہیں تو ہر ایک کے لیے اپنا اپنا مقام ہے۔"

"ہاں تم مجھے دبو کہہ سکتی ہو پر دل سے عاری نہیں۔ میں خود بھی سوچتا ہوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"آپ کی چاچی نے آپ کے ساتھ ہی کون سا اچھا سلوک کیا ہے کہ اسے لے کر آپ رو رہے ہیں۔ آپ کی کمائی کو ان کے بھائی بہن کھا سکتے ہیں لیکن اپنے بھائی بہن نہیں کھا سکتے۔"

آپ بولے "یہ برتاؤ ان عورتوں کے لیے ہے جن میں عزت نفس ہو۔ مگر جن میں وہ بات نہ ہو تو کیا

ان کے ساتھ میں برابر جاؤں۔''

میں بولی'' وہ سوچتی کیا ہوں گی؟''

''بہن بھی حالات کو سمجھ کر رو لیتی ہوں گی۔''

میں بولی'' ایشور کا دنڈ آدمی سہ لیتا ہے' پر اپنے کا کیا ہوا کیسے بھولے؟''

''ماں کا مرنا جیسے مجھے کھلتا ہے ویسے ہی انھیں بھی کھلتا ہوگا۔''

''تو پھر رونا کون دیکھتا ہے۔''

''پھر علاج ہی کیا ہے بتاؤ؟''

میں بولی'' آرام سے بیٹھے رہیے۔''

''میرے خیال میں وہ یہاں سے آرام میں ہیں۔ دو ایک بار میں نے بلایا تھا اور ان کی حالت بھی دیکھی تھی۔'' میں بولی'' جہاں آپ سے بھونڈو ہوں گے' وہاں لوگوں کی یہی حالت ہوگی۔''

میرے سامنے دو ایک بار آئی تھیں۔ بعد میں تو خیر وہ مر ہی گئیں۔ جب سے وہ مر گئی تھیں اور ان کی چاچی ہم سے الگ رہنے لگی تھیں' ان کی تینوں لڑکیوں کو آپ برابر اپنی بیٹی کی طرح پیار کرنے لگے تھے۔ سال میں سب کو بلاتے تھے۔ وہ اپنی بہن کی کمی ان لڑکیوں سے پوری کرتے تھے۔ ان کے بچوں کو گود میں لے کر کھلاتے تھے' پیار کرتے تھے۔ میں کبھی کبھی کہہ بھی دیتی کہ آپ اپنے بہن کو اس طرح پیار کرتے ہوتے تو وہ بھی سکھ محسوس کرتیں۔''

''کیا کرتا بے بسی بھی کوئی چیز ہے۔ نہ میں نے اپنی ماں کی سیوا کی نہ بہن کی۔''

یہ کہتے کہتے اکثر ان کا گلا بھر آتا۔

۱۹۰۵

میرے آنے سے پہلے ہی ادب کی خدمت جاری تھی۔ آپ کا پہلا ناول'' کرشنا'' الہ آباد سے شائع ہو چکا تھا۔ میری شادی کے سال ہی آپ کا دوسرا ناول'' پریما'' آیا جس کا نام آگے چل کر ''وبھو'' (غیر معمولی طاقت' دولت' زندگی سے نجات' اعلیٰ حوصلگی) ہوا۔ میری شادی کے ایک برس بعد آپ کی کہانیوں کا مجموعہ'' سوز وطن'' شائع ہوا۔ اس پر مقدمہ بھی چلا۔ ہم لوگ مہوبا میں تھے۔ وہاں بھی خفیہ پولیس پہنچی۔ اس کے بعد ان کو کلکٹر کا حکم ملا کہ آکر مجھ سے ملو۔

آپ کو دورے پر آرڈر ملا۔ رات بھر بیل گاڑی پر چلنے کے بعد آپ ''کل پہاڑ'' پہنچے۔ آپ اسی دن گھر آنے والے تھے۔ جب دوسرے روز میرے پاس پہنچے تو میں نے پوچھا ''کل آپ کہاں رہ گئے؟''

آپ نے کہا ''ٹھہرو بتاتا ہوں بڑی پریشانی میں پڑ گیا تھا۔ کل ساری رات چلتا رہا''

میں بولی ''ارے! بات کیا ہے؟''

آپ بولے ''سوزِ وطن کے سلسلے میں سرکار نے مجھے بلایا تھا''

میں نے پوچھا ''آخر بات کیا تھی؟''

آپ بولے ''کلکٹر نے اسی سلسلہ میں مجھے بلایا تھا۔ میں گیا تو دیکھا کلکٹر کی میز پر سوزِ وطن کی کاپی پڑی ہے۔''

میں نے پوچھا ''پھر کیا ہوا؟''

آپ بولے ''کلکٹر نے پوچھا یہ کتاب تمھاری لکھی ہے؟ میں نے کہا ہاں! اسے پڑھ کر میں نے سنایا بھی۔ سننے کے بعد وہ بولا 'اگر انگریزی راج میں تم نہ ہوتے تو آج تمھارے دونوں ہاتھ کٹوا لیے گئے ہوتے۔ تم کہانیوں کے ذریعے بغاوت پھیلا رہے ہو۔ تمھارے پاس جتنی کاپیاں ہوں۔ انھیں میرے پاس بھیج دو۔ آئندہ پھر کبھی لکھنے کا نام بھی نہ لینا''۔

میں نے کہا ''آپ کتابیں بھیج دیجیے گا؟''

آپ بولے ''واہ۔ ارے یہ کہو کے سستے چھوٹے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بڑی آفت آئے گی۔''

میں نے کہا ''تو پھر لکھنا بھی اب بند ہی سمجھوں''۔

آپ بولے ''لکھوں گا کیوں نہیں؟ اپنا نام (عرف قلمی نام) رکھنا پڑے گا۔ خیر اس وقت تو بلا ٹلی۔ مگر میں سوچتا ہوں ابھی یہ اور رنگ لائے گا۔''

میں بولی ''نہیں جی جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اس مجموعے کی خاطر آپ پر ایسی آفت آئی اور میں نے وہ ابھی تک پڑھا نہیں۔''

آپ بولے ''یہ تو ہمیشہ کی بات ہے۔ جب سرکار کسی کتاب کو ضبط کر لیتی ہے تو اس کے خریداروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر اس میں ہے کیا؟''

میں نے کہا" آپ نے کبھی سنایا بھی نہیں۔ میں اردو جانتی نہیں۔"

"اچھا اب آئے گی تو میں تمھیں پڑھ کر سناؤں گا۔"

میں بولی "ضرور سنانا۔"

شادی کے پہلے میری دلچسپی ادب میں بالکل نہیں تھی۔ اس کے بارے میں میں کچھ جانتی بھی نہیں تھی۔ میں پڑھی بھی نہیں کے برابر تھی۔ آج میں جس لائق ہوں وہ پتی کی بدولت ہوں۔

کانپور سے سوز وطن کا پارسل آیا۔ ایک کاپی رکھ لی۔ باقی مجسٹریٹ کو واپس کر دی گئیں۔

ان دنوں میں اکیلی مہوبے میں رہتی تھی۔ وہ جب دورے پر رہتے میرے ساتھ ہی سارا وقت گزارتے اور اپنی لکھی ہوئی چیزیں سناتے۔ انگریزی اخبار پڑھتے تو اس کا ترجمہ مجھے سناتے۔ ان کی کہانیوں کو سنتے سنتے مجھے بھی ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔ جب وہ گھر میں ہوتے تو میں کچھ پڑھنے کے لیے ان سے اصرار کرتی۔ صبح کا وقت لکھنے کے لیے وہ مخصوص رکھتے تھے۔ دورے پر بھی وہ صبح ہی لکھتے، بعد کو معائنہ کرنے جاتے۔ اس طرح مجھے ان کی ادبی زندگی کے ساتھ تعاون کرنے کا موقع ملا۔ جب وہ دورے پر ہوتے تو میں دن بھر کتابیں پڑھتی رہتی۔ اس طرح ادب میں میرا تعارف ہوا۔

ان کے گھر رہنے پر مجھے پڑھنے کی ضرورت نہ محسوس ہوتی۔

مجھے بھی خواہش ہوتی کہ میں بھی کہانی لکھوں حالانکہ میرا علم نام کو بھی نہ تھا پر میں اسی کوشش میں لگی رہتی کہ کسی طرح میں کوئی کہانی لکھوں۔ ان کی طرح تو کیا لکھتی میں لکھ لکھ کر پھاڑ دیتی اور انھیں دکھاتی بھی نہ تھی۔ ہاں جب ان پر کوئی تنقید آتی تو مجھے اسے سناتے۔ ہمیں ان کی اچھی تنقید بہت بھاتی۔ کافی دیر تک یہ خوشی رہتی۔ مجھے جان کر فخر ہوتا کہ میرے شوہر پر یہ تنقید آئی ہے۔ جب بھی ان کی کوئی تنقید کری آتی تب بھی وہ اسے بڑے چاؤ سے پڑھتے۔ مجھے تو بہت برا لگتا۔

میں اسی طرح کہانیاں لکھتی۔ اور پھاڑ کر پھینک دیتی۔ بعد میں گرہستی میں پڑ کر کچھ دنوں کے لیے میرا لکھنا چھوٹ گیا۔ ہاں کبھی اگر کوئی اچانک خیال دماغ میں آتا تو ان سے کہتی اس پر آپ اس پر کہانی لکھیں۔ وہ ضرور اس پر کہانی لکھتے۔

کئی برسوں کے بعد ۱۹۱۳ کے لگ بھگ انھوں نے ہندی میں کہانیاں لکھنا شروع کیا۔ کسی کہانی کا ترجمہ ہندی میں کرتے، کسی کا اردو میں۔

میری پہلی ساہس (بہادری ہمت) نام کی کہانی چاند میں چھپی۔ میں نے وہ کہانی انھیں نہیں دکھائی

چاند میں آپ نے اسے دیکھا۔ اوپر آ کر مجھ سے بولے "اچھا آپ بھی کہانیاں لکھنی والی بن گئیں" بولے" یہ کہانی آفس میں میں نے دیکھی۔ آفس والے پڑھ پڑھ کر خوب ہنستے رہے۔ کیوں کہ انہوں نے مجھ پر شبہہ کیا۔"

تب سے جو کچھ میں لکھتی انھیں دکھا دیتی۔ ہاں یہ خیال مجھے ضرور رہتا کہ کہیں میری کہانی ان کی نقالی نہ بنتی جا رہی ہو کیونکہ میں لوگوں کے ہنسی اڑانے سے بہت ڈرتی تھی۔

ایک بار گورکھپور میں ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی لکھی ہوئی ایک کتاب لائے۔ میں نے وہ کتاب پڑھنے کے لیے مانگی۔ آپ بولے "تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گی" میں بولی" کیوں نہیں آئے گی۔ مجھے دیجیے تو سہی" اسے میں چھ مہینے تک پڑھتی رہی۔ رامائن کی طرح اس کا پاٹھ کرتی رہی۔ اس کے ایک ایک لفظ کو مجھے ذہن نشین کر لینا تھا۔ کیونکہ انھوں نے کہا تھا کہ یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں کتاب کو ختم کر چکی تو ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی" اچھا' آپ اس کے بارے میں مجھ سے پوچھیے' میں اسے پورا پڑھ گئی۔" آپ ہنستے ہوئے بولے" اچھا!"

میں بولی" آپ کو بہت کام رہتے بھی تو ہیں۔ پھر بیکار آدمی کسی کسی چیز کے پیچھے پڑے گا وہی پورا کرے گا۔"

میری کہانیوں کا ترجمہ جب دوسری زبانوں میں ہوتا تو آپ کو بڑی خوشی ہوتی۔ ہاں' اس وقت ہم دونوں کو بہت برا لگتا جب دونوں سے کہانیاں مانگی جاتیں۔ یا جب کبھی رات کو پلاٹ ڈھونڈنے کی وجہ سے مجھے نیند نہ آتی۔ تب آپ کہتے' تم نے کیا اپنے لیے ایک بلا مول لے لی۔ آرام سے رہتی تھیں فضول کی ایک جھنجھٹ خرید لی۔ میں کہتی" آپ نے نہیں بلا مول لے لی۔ میں تو کبھی کبھی لکھتی ہوں آپ نے تو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے۔ آپ بولتے" تو اس کی نقل تم کیوں کرنے لگی؟"

میں کہتی" ہماری مرضی۔ میں بھی مجبور ہوں۔ آدمی اپنے جذبات کو کہاں رکھے؟"

قسمت کا کھیل کبھی نہیں جانا جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ وہ ہوتے تو آج اور بات ہوتی۔ لکھنا پڑھنا تو ان کا کام ہی تھا۔ میں یہ لکھ نہیں رہی ہوں بلکہ سکون پانے کا ایک بہانہ ڈھونڈ رکھا ہے۔ بیسوں برس کی پرانی باتیں یاد کر کے میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔ میرے بس میں ہے ہی کیا؟ ہاں' پرانی باتوں کو سوچ کر مجھے نشہ سا ہو جاتا ہے۔ اس نشے سے کوئی لطف نہیں آتا ہے بلکہ ایک تڑپن ہی پیدا ہوتی ہے۔ اب بیتی باتوں کو یاد کر کے دل بہلا لیتی ہوں۔

۱۹۱۳ء کے لگ بھگ

کانپور کا 'پرتاپ' نکلا تھا گنیش شنکر کے ہاتھوں۔ انھوں نے کچھ لکھا ہوا طلب کیا تھا۔ آپ نے لکھ

کرانھیں بھیج دیا۔ کانپور میں آپ کا کوئی کام تھا۔ بستی سے وہاں گئے۔ 'پرتاپ' آفس بھی چلے گئے۔ وہاں جا کر دیکھا دودھیا رتھی جی زیادہ سے زیادہ کام اپنے ہاتھوں کرر ہے ہیں۔ وہاں سے لوٹ کر مجھ سے بولے۔

''دودھیا رتھی جی بڑے محنتی ہیں۔ مکتبہ کا بہت سا کام اپنے ہی ہاتھوں کرتے ہیں۔ ایسے ہی آدمیت کا اخیر کہتے ہیں۔ اسی طرح کے آدمیوں کی ملک کو ضرورت ہے۔ ایسے ہی آدمی اپنی زندگی کو کارآمد بنا سکتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے دودھیا رتھی جی اپنی زندگی میں کامیاب رہیں گے۔ جو آدمی خود اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے اس کی مدد خدا بھی کرتا ہے۔ میری یہ بھی آرزو ہے کہ میں بھی اس نوکری کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں تنہائی میں بیٹھ کر ادب کی خدمت کروں۔ کیا کروں میری بدقسمتی ہے کہ میرے پاس تھوڑی سی زمین بھی نہیں۔ میرے پاس ۱۰ بیگھے بھی زمین ہوتی تو میں اپنے کھانے بھر کا غلہ پیدا کر لیتا اور چپ چپ تنہائی میں بیٹھ کر ادب کی سیوا کرتا۔''

میں بولی ''دس بیگھے زمین میں کیا آپ سونا اگا لیتے؟ پھر دودھیا رتھی کی طرح آپ نہیں ہیں۔ ابھی آپ دو مہینے نوکری چھوڑ کر بیٹھ جائیں تو بائے تو بہ مچ جائے۔ آٹھ سال کام کرتے ہوئے ہو گئے اگر آپ نے ۱۰۰ رسال کے بچائے ہوتے تو آٹھ سو ہوئے ہوتے۔ من کی مٹھائی کھانا دوسری بات ہے کام ٹھیک ٹھیک چلانا دوسری بات ہے۔ جب نوکری کرنے پر یہ حالت ہے کہ خرچ چلائے نہیں چلتا تو چوبیسوں گھنٹے ادب کا کام کرنے سے کیسے گزارا ہوگا۔''

آپ بولے ''ڈپٹی انسپکٹری چھوڑنے سے کیا کام رک گیا؟ اب بھی اسی طرح کام چل جائے گا۔ پھر کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا۔ کام کہیں رکتا ہے''۔

پھر آپ بولے ''نہیں جی دال روٹی تو ہی پہ ہے اور زیادہ سے ہم سے کیا مطلب؟''

میں بولی ''خود کے لیے تو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صحیح ہے اور بال بچے بھی تو ہیں۔ ان کا کیا ہوگا؟ ابھی آدھی تنخواہ پر چھ مہینے کی چھٹی لی تھی مشکل سے خرچ چل پاتا تھا۔ میں اپنے گھر تھی۔ آپ کانپور تھے خالی چھوٹک اور چاچی تھیں تب بھی پورا نہیں پڑتا تھا۔ آپ کا ہی کہنا ہے کہ اپنے ہاتھ سے دودھ جما کر مٹھا بناتا تھا۔ ایک آدمی رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ دودھیا رتھی جی کا کیا' وہ آپ جیسے نہیں ہیں۔ ان کے سر پر کوئی بوجھ نہیں ان کے باپ زندہ ہیں۔ بڑے بھائی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ دودھیا رتھی جی کو ان سے مدد بھی ملتی ہو۔ یہاں سب کا بوجھ تمھارے سر پر ہے۔ ان کی اور تمھاری بالکل بھی برابری نہیں۔ آپ چپکے سے اپنا کام کرتے رہیے۔''

آپ کو جیسے فکر سی ہوگئی۔ جیسے کوئی بھولی بات یاد آ گئی ہو۔ ان کو ادب کی خدمت کی فکر ہمیشہ رہتی ۔ بنارس دوالا سے وہ گاؤں سے روز جاتے۔ ٹھیک بارہ بجے کڑی دھوپ میں لوٹ کر گھر آتے۔

''اس پر کوئی آپ پر رحم نہیں کرتا تھا' نہ کوئی دوا ہی لا کر دے دیتا۔ ٹونگ کی دال میں لال مرچ کا بگھار پڑتا تھا۔ آپ بھول گئے اس بات کو۔ سب کے کھلانے کا ذمہ آپ پر ہی ہوگا۔''

آپ بولے'' جانے بھی دو جی۔''

میں بولی'' اور کیا!''

آپ بولے'' خیر دیکھا جائے گا۔ میری یہ آرزو کبھی نہ کبھی ضرور پوری ہوگی۔''

میں بولی'' ان لوگوں کو تو پہلے کنارے پہنچاؤ۔''

ان سب باتوں کو سوچ کر ان کے بارے میں میرے من میں طرح طرح کے تعجب بھرے خیالات پیدا ہوتے ہیں'' جولائی کے شروع میں بیمار ہونے پر بھی آپ بستی اسکول چلے آئے۔

ان کا کام میں انہماک دیکھ کر یہی لگتا تھا جیسے وہ کام کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی ان پر مجھے غصہ بھی آتا تھا۔ گھر کے سارے آدمی انھیں پریشان کرتے وہ ذرا بھی دھیان نہ دیتے۔ ساری تکلیفوں کو وہ خوشی سے برداشت کر لیتے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے۔ کہ وہ کتنے عظیم تھے۔ وہ بروں کے ساتھ بھی بھلوں کا برتاؤ کرتے۔ یہ ہندوستان کی خاصی خصوصیت ہے کہ کسی کی زندگی کے دوران انسان اسے ٹھیک ٹھیک نہیں پہچان پاتے۔ ہاتھ سے نکل جانے پر ہی انسان کو اس کی قیمت کا پتہ لگتا ہے۔ اگر میں پہلے انھیں سمجھ گئی ہوتی تو میری یہ دشا نہ ہوتی۔ میں پہلے ان باتوں پر نکتہ چینی نہ کرتی۔ جیسے جیسے ان سب باتوں کو سمجھتی ہوں ویسے کلیجے پر چھریاں سی چلتی جاتی ہیں۔ وہی میں ہوں۔ سب باتیں اسی طرح سے ہیں۔ زمانہ وہی ہے۔ ہاتھ ملنا ہی خالی باقی رہ گیا ہے۔

بستی-۱۹۱۴ء

ایک دن کا واقعہ ہے کہ دروازے پر ان کے پہلے سالے بیٹھے تھے۔ آپ انھیں سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنی بہن کے بارے میں آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ دکھی بھی تھے۔ اتفاق سے میری دو سال کی لڑکی کملا بکواں دروازے پر چلی گئی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے دروازے کی طرف گئی۔ میں نے دیکھا لڑکی ان کے سالے صاحب کی گود میں تھی۔ وہ بڑے پیار سے اسے چمکار رہے

تھے۔ اسی کے دوران وہ رنجیدہ لہجے میں بولے: اگر ہمارا رشتہ بھائی چارے کا بھی ہوتا تو کیا میری بہن اسے پیار نہ کرتی۔ اس پر آپ خاموش رہے۔ وہ بہت سی باتیں اپنی بہن کے بارے میں کہتے رہے۔ میں بڑے دھیان سے ان کی باتیں آڑ میں سے سنتی رہی (تیرے بھی بدن کا خون) میرا بھی خون اس وقت گرم ہو رہا تھا۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ آپ لڑکی کو لے کر اندر آئے۔ وہی پہلا دن تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔ مجھے تو دھوکا دیا جا تا رہا تھا کہ وہ مر گئی ہیں۔

میں بولی ''کون صاحب تھے۔''

آپ بولے ''ایک مہاشے تھے۔''

میں بولی ''مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی کہ آپ جھوٹ بولیں گے۔''

آپ بولے ''جس کو انسان سمجھے کہ زندہ ہے، وہی زندہ ہے، جسے سمجھے مر گیا وہ مر گیا۔''

میں اسے ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ آپ کرپا کر کے انھیں لے آیئے۔''

''میں تو لینے نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں نہیں جایئے گا؟ شادی ہوئی تھی تماشہ نہیں تھا۔''

میں نے نہیں شادی کی تھی۔ میرے باپ نے شادی کی تھی۔

''باپ نے تو جو اپنی شادی کی تھی اسے آپ گلے باندھے پھر رہے ہیں۔ باپ کی شادی کی ذمے داری تو آپ کے سر ہے، اپنی نہیں؟ یہ ذمے داری کی تک نہیں ہے۔''

''چاہے ہو یا نہ ہو میں لاؤں گا نہیں۔''

''کیا بات ہے؟ ایک آدمی کی زندگی مٹی میں ملانے کا آپ کو کیا حق ہے؟''

انھوں نے کہا ''حق وغیرہ کی کوئی بات نہیں۔''

میں بولی ''بھلا آپ کیا کہتے ہیں کیا یہی ہندو سنسکار (شادی کی رسوم) کے معنی ہیں۔''

''آج نہ معلوم وہ کم بخت کہاں آ گیا کہ اسے دیکھ کر دنیا بھر کی باتیں تم سنانے لگیں۔''

میں کچھ نرم پڑی۔ سوچا کہ غصے سے کام نہیں چلے گا۔ پیار سے بولی ''آپ ان کو لوا لایئے۔ ان کی ذمہ داری میرے سر رہے گی۔''

''تم سے جھگڑا ہو گا۔''

''جیسے میں گھر گرہستی کے بارے میں کچھ صلاح آپ سے نہیں لیتی ویسے ہی ان کے بارے میں آپ سے کچھ نہ کہوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ انھیں خوش رکھوں۔ ہم دونوں بڑے آرام سے رہیں گے۔''

''تم لوگ تو آرام سے رہوگی مزہ مجھے بھگتاؤ گی۔''

''ایشور قسم۔ آپ سے سچ کہتی ہوں جو اس بارے میں آپ سے کچھ میں کہوں۔''

''بھائی تم اپنی مرضی کے مطابق جو کرنا ہو کرو۔ میں کچھ نہ بولوں گا۔''

میں خاموش ہو گئی۔

میں نے انھیں 'پیاری بہن' کر کے خط لکھا۔ انھیں بلایا تھا۔ اس کے چوتھے روز اس کا جواب آیا کہ جب وہ خود بیٹے آئیں گے تو میں چھوڑوں گی۔ میں تم کو دیکھنا تو چاہتی ہوں پر انھیں بھیج دیجیے لوانے کو۔ میں نے انھیں وہ خط اٹھا کر دے دیا۔ انھوں نے کہا 'نہیں آئیں تو میں کیا کروں؟'

پھر میں انھیں برابر خط لکھا کرتی تھی۔ ان کا خط کیتھی (کیتھی ناگری: ایک طرح کا بے قاعدہ ہندی رسم الخط) میں لکھا ہوتا تھا۔ اسے میں انھیں دے دیا کرتی تھی۔

یہیں بستی میں ۱۹۱۴ میں پرائیویٹ ایف۔ اے بھی انھوں نے پاس کیا۔

جب وہ پرائیویٹ پڑھ رہے تھے۔ تو ان کے سرہانے سلائی لالٹین کتاب رکھی رہتی تھی۔ کبھی کبھی میں چارپائی سے ہی انھیں آواز دے دیا کرتی تھی کہ اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ ۵ بجے تک آپ پڑھتے رہتے تھے۔ ۵ بجے اٹھ کر پاخانے جاتے، ہاتھ منھ دھوتے اور اس وقت جو کچھ ملتا اس کا ناشتہ کر لیتے۔ یہی ان کے روز کے کام تھے۔ اس کے بعد چھ بجتے بجتے پھر اپنے کمرے میں کہانیاں اور دوسری چیزیں لکھتے۔ نو تک وہ ادب کی سیوا میں لگے رہتے تھے۔ بعد میں بیت الخلا، جانا، نہانا، کھانا ہوتا۔ پھر کپڑے بدل کر اسکول جاتے۔ بستی میں اسکول جاتے تو تانگے سے جاتے تھے۔ پھر لوٹتے تھے پیدل۔ روزانہ دو آنے مجھ سے کرائے کے لیے لیتے تھے۔ لوٹتے ہوئے ترکاری وغیرہ خود ادھر ہی سے لیتے آتے۔ ساڑھے تین بجے گھر پہنچتے، کبھی چار بھی بج جاتے تھے۔ گرہستی کا کام میرے کرنے پر بھی کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا۔ چار بجے آتے ہی کچھ ناشتہ کرتے۔ اس کے بعد پانچ تک گپ شپ کرتے۔ پھر چھ بجے سے لے کر آٹھ تک کچھ نہ کچھ ادب کی خدمت کرتے۔

بیمار تو وہ مہوبا ہی سے تھے۔ اتنا سب ہوتے ہوئے بھی وہ سیکنڈ پاس ہوئے تھے۔ کسی کام سے ہار ماننا تو انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ دن میں بچی کو بڑی دیر تک کھلاتے رہتے۔ اس کے بعد پاس

پڑوس میں کسی سے ملنے جلنے جاتے تو بیٹی کو گود میں لیے جاتے۔ بچوں کا پیار ان میں بہت تھا۔ لوٹتی بار شام کے وقت وہ کچھ تھک جاتے تھے۔ میں چاہتی پیر وغیرہ دبادوں پر یہ سب انھیں بہت ناگوار معلوم ہوتا تھا۔

کبھی کبھی میں ضد کر کے دبا دیتی تو وہ بے بس ہوکر دبوا لیتے تھے۔ عورتوں سے کام کروانا انھیں پسند نہ تھا۔ حقے کی چلم تک بھروانا مجھ سے وہ پسند نہ کرتے تھے۔ نوکر دروازے پر بیٹھا رہتا تھا لیکن اندر آ کر وہ پانی پیتے تھے۔ دھوتی بھی وہ خود دھو لیتے تھے حالانکہ نوکر خالی ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھی میں ان حرکتوں پر بگڑ بھی جاتی اور کہتی کہ نوکر پھر کیوں ہے؟ آپ بولتے: اپنی ضرورتیں خود پوری کرنا آدمی کا دھرم ہے۔ آج تو نوکر ہے ہوسکتا ہے کہ کبھی نوکر نہ رہے۔ پھر میں پانچ روپے کا نوکر تو خود تھا۔" میں کہتی "میں نے تو نہیں دیکھا۔

"تمہارے نہ دیکھنے سے کیا؟ میں تو بھگت چکا ہوں۔ اس لیے انسان کو اپنی ضرورت خود رفع کرنی چاہیے۔

جولائی - ۱۹۱۵ء

اس کے بعد وہاں آپ کا ہاضمہ خراب ہوا۔ ہاضمے کی خرابی کی وجہ سے آپ نے وہاں سے تبادلہ کروالیا۔ سوچا تھا کوئی اچھی جگہ دیں گے۔ مگر وہی نیپال کی ترائی بستی یہاں بھی ہاضمہ خراب رہا۔ چار چھ مہینے رہنے کے بعد میرے پتا نے بلایا اور ایک مہینہ پریاگ (الہ آباد) میں ہی رہ کر دوا کرائی۔ میں بھی ساتھ تھی۔ وہاں سے بغیر تندرست ہوئے ہی آپ پھر بستی چلے آئے۔

میں اپنے پتا کے گھر رہی۔ میرے پتا بولے" بیٹا دیکھو! اپنی دوا کرو۔ ایک بار اور چھٹی لے لو۔"

اس بار چھ مہینے کی لمبی چھٹی آپ نے لی۔ آدھی تنخواہ ملتی تھی۔ ۲۵/روپے۔ اس میں سے ۱۰/ماں کو دیتے تھے ۱۵/اپنے بھائی کو دیتے تھے جو جھانسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیسے اپنا خرچ چلاتے تھے۔ لکھائی کے روپیوں سے شاید وہ اپنا گزارہ کرتے رہے ہوں۔ کانپور اور لکھنو دونوں جگہ دوا کراتے تھے۔

میں اپنے پتا کے گھر پر تھی۔ دسمبر کے مہینے میں مجھے بلانے میرے گھر آئے۔ پتا سے کہلوایا کہ میں بدا کرانے آیا ہوں' پتا نے اسی آدمی سے کہلوایا' وہ بڑے آرام میں ہیں۔ آدھی تنخواہ پار ہے ہو کیوں جھنجھٹ پال رہے ہیں۔ خود بھی تو کبھی لکھنو کبھی کانپور رہتے ہیں۔

خیر وہ واپس گئے۔

پھر اپریل کے مہینے میں آئے اور بدائی کے لیے کہا۔ پھر پتا جی نے وہی جواب دیا۔ اُس دفعہ اس آدمی سے انھوں نے کہلوایا ''کیا جس کی آمدنی زیادہ نہ ہو یا جو بیمار ہو وہ اپنے بیوی بچے کو نہ لے جائے۔''

جب میرے پتا کو یہ بات معلوم ہوئی تو اسی آدمی سے بولے ''مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے میں تو ان کے فائدے کے لیے کہتا تھا۔''

اپریل کے مہینے میں مجھے لے کر وہ لمہی آئے۔ اس کے بعد دو مہینے آپ لمہی میں رہے۔ شہر روزانہ پیدل جاتے تھے اور حکیم کے یہاں سے دوا لیتے تھے۔ کہیں بارہ بجے کے قریب پھر گاؤں واپس جاتے تھے۔ چاچی پر ہیزی کھانا تو مونگ کی دال کا دیتی تھیں لیکن اس میں مرچ کا بھگار ہوتا تھا۔ پیچش دن دن بڑھتی جاتی تھی۔ مجھ سے روز پیچش کی شکایت کرتے تھے۔

دو مہینے بعد پھر بستی گئے۔ پھر وہی حالت ہوئی۔ کوئی پندرہ روز رہنے کے بعد پھر واپس آئے۔ وہاں ڈمریا گنج تحصیل میں منن دیو دے دی گنج پوری' سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ ان سے کبھی کبھی ادبی گفتگو ہوتی تھی۔ ڈمریا گنج جاتے تو انھی کے یہاں ٹھہرتے۔

اس کے بعد پھر گھر چھٹی لے کر آئے۔ پھر تبادلے کی درخواست دی۔ اس پر بھی صاحب نے کچھ دھیان نہیں دیا۔ پھر الہ آباد گئے۔ ڈائرکٹر سے ملے۔

بولے ''بستی کی آب و ہوا مجھے موافق نہیں ہے۔''

صاحب بولے ''تمھیں نہ مہوبا کی آب و ہوا پسند ہے نہ بستی کی' بتاؤ کہاں بھیجوں؟ تمہاری ماسٹری کی جگہ چالیس روپے کی ہے' جا سکتے ہو۔ منظور ہے؟''

آپ بولے ''بعد کو لکھوں گا۔''

گھر آئے میں نے پوچھا ''کیا ہوا؟''

''ہوا کیا کچھ بھی نہیں۔ کم بخت جھلاتا ہے۔ کہتا تھا ''کس جہنم میں بھیج دوں؟ اس کے بعد بولا ''چالیس روپے ماسٹری کی جگہ پر جا سکتے ہو۔''

میں بولی ''تو آپ کیا کہہ آئے؟''

''ابھی تو میں نے کچھ جواب نہیں دیا جیسا کہو ویسا کروں گا۔''

مجھے ان سب باتوں سے بہت غصہ آیا اور اپنی بے بسی پر افسوس بھی ہوا۔ بولی ''تو ماسٹری کیا بری ہے؟''

وہ بولے ''تمھیں معلوم چالیس ہی ملیں گے۔''

''ہاں معلوم ہے۔ چالیس ہی ملیں گے تو کیا؟''

''بتاؤ خرچ کیسے چلے گا''؟

''دیکھا جائے گا جیسے چلے گا۔ خرچ کے لیے جان تو نہیں دی جا سکتی''

آپ بولے ''سب ملا کر اس وقت تمھارے گھر سو روپے آ جاتے ہیں۔ پھر بھی خرچ نہیں چلتا''

میں بولی ''میں کہتی ہوں ایک ہزار میں بھی خرچ نہیں چل سکتا۔ جو دس روپے کماتا ہے اسی میں وہ بھی گزارہ کر لیتا ہے''۔

''میں نہیں جانتا' میں تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

''میں بھی تیار ہوں۔ کوئی بات نہیں۔''

''یوں ہی لوگ پریشان کرتے ہیں۔''

میں نے کہا ''سیدھے پن کے سب نتیجے ہیں۔ دیکھتے ہیں لوگ کہ مر رہے ہیں پر دوا کے لیے بھی نہیں پوچھتے۔ اور نہیں دال میں مرچوں کا بگھار دیا جاتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔''

''خیر تمھاری مرضی میں درخواست دیے دیتا ہوں۔''

پھر منظوری آئی۔ ان دنوں ہم بنارس تھے۔ جس دن منظوری آئی بولے۔

''چلو پھر وہیں بستی۔''

میں نے کہا ''چلو' دورہ تو نہیں کرنا ہوگا۔''

۸؍ جولائی کو وہ پھر بستی آئے۔ ساتھ میں میں' میری لڑکی اور ان کے بھائی تھے۔ پھر پرانی بستی میں ہم لوگوں نے مکان لیا۔ پہلے تو میرے بہنوئی کے یہاں ٹھہرے جو وہاں پوسٹ ماسٹر تھے۔ دونوں آدمیوں نے مل کر مکان ٹھیک کیا۔ کھانے پینے کا وہاں ٹھیک رہا۔

ایک روز کا واقعہ ہے آپ بازار مچھلی، ترکاری، پان وغیرہ لانے کے لیے گئے۔ وہیں پنڈت مگن دیو وے دی جی سے ملاقات ہوئی۔ پنڈت جی کو ساتھ لے کر گھر آئے۔ آکر بولے" پنڈت جی گھر آئے بیٹھے ہیں، پان تو بنالاؤ" وہ خود ہاتھ دھوکر طشتری میں پان لے کر باہر آئے۔ ان سے کچھ دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر پنڈت جی اپنے گھر گئے۔

آپ اندر آکر بولے" آج مچھلی خریدتے ہوئے پنڈت جی مل گئے۔ بڑا مسخرہ آدمی ہے۔ ساتھ ہی جاندار بھی ہے۔ میں نے کہا" آپ کو تو میں کئی بار ٹوک چکی ہوں کہ اور کسی سے منگالیا کیجیے، پر آپ مانتے ہی نہیں۔"

آپ بولے" مجھے اپنا کام کرتے شرم نہیں معلوم ہوتی۔ اپنا کام کرنا کیا جرم ہے پھر میں اپنے کو مزدور کہتا بھی تو ہوں"۔

میں بولی" آپ ہتھوڑا کیوں نہیں چلاتے؟"

"پھاوڑا نہیں چلاتا تو قلم تو چلاتا ہوں"۔

میں بولی" اگر آپ پھاوڑا چلاتے ہوتے تو میں آپ کو روٹیاں پہنچاتی ہوتی۔"

"اچھا باہر نہ سہی گھر میں تو دیتی ہو۔ اگر میرا سودا بازار سے کوئی دوسرا لاتا تو کیا مہراجن کی ضرورت نہ پڑتی؟"

"مہراجن کا تو کوئی سوال نہیں۔ اگر آپ اپنے کو ہر حالت کے لیے تیار رکھ سکتے ہیں تو کیا میں اتنا بھی نہیں کرسکتی؟"

"اس کے لیے ایشور کو دھنیہ واد ہے۔"

وہاں چالیس روپے ملتے تھے۔ دس روپے وہ سوتیلی ماں کو برابر بھیجتے رہتے تھے۔ باقی میں ہم تین تھے۔

یہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے

دو تین دن بیتنے پر پنڈت جی نے تین چار کھانچی مچھلیاں بھیجیں اور ساتھ میں ایک دوہا

دھیمر نے پھانسیو ابھی دین۔ چھین سپھرین

پریم چند بھوجن کریں۔ ودھیا۔ بدھی پروین

(دھیمر۔ مچھیرا' دین۔ ھین۔ غریب' مہھر ین ایک طرح کی چھوٹی چمکدار مچھلی' بھوجن کرنا۔ کھانا'
دودھا۔ عالم بدھی عقل پروین۔ ہوشیار)

آپ تو گھر پر تھے نہیں اسے میں نے رکھوایا اور چار چار آنے وداعی دے کر ان آدمیوں کو واپس کیا۔ کویتا اٹھا کر پڑھی۔ مجھے ہنسی آئی۔ ساتھ ہی فکر بھی ہوئی اتنی مچھلیاں ہوں گی کیا۔ دعا مانگ رہی تھی کہ جلدی آئیں تو کوئی انتظام ہو۔ جب شام کو آئے۔ تین بجے' تو نوکروں میں آنگن میں مچھلیاں رکھی تھیں' کپڑے بھی نہیں اتارے تھے کہ بٹی کو اٹھالیا۔ اس کو گود میں لیے تھے کہ مچھلیوں پر نگاہ پڑی۔ بولے "یہ کہاں سے آگئیں؟" میں بولی "یہی نہیں آئیں ان کے ساتھ ایک کویتا بھی آئی ہے۔ یہ پنڈت جی کی شرارت ہے۔"

آپ بولے "میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ضرور اس پر مذاق کریں گے۔ مگر یہ ہوں گی کیا؟"

"میری سمجھ میں تو خود کچھ نہیں آتا کہ یہ کیا ہوں گی۔ انھیں بنوائیے۔ کچھ جیجا کے یہاں بھجوائیے۔ اور جگہ بھی بھجوائیے۔ شام کو کسی طرح مچھلیوں کی بانٹی۔ تب سے ہمیشہ ڈرتی رہتی تھی کہ کہیں پھر نہ انھیں بازار میں وہ مل جائیں۔ مگر ان کو اس کی فکر نہ تھی وہ تو اپنا کام کرنا جانتے تھے۔

جب پنڈت جی دوبارہ بستی آئے مچھلیوں پر کافی قہقہہ رہا۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ پنڈت جی آپ کی بنائی ہوئی وہ کویتا مجھے بہت پسند آئی۔ پھر تم ایسی کویتا لکھو گے تو میں بھی کچھ لکھ کر بھیجوں گا۔

اسی بستی میں ایک دن کنوار کا مہینہ تھا۔ ٹوٹ کر مینہ برس رہا تھا۔ گھر گر رہے تھے۔ ہم چار آدمی بھی ساتھ ہی ایک مکان میں بیٹھے تھے۔ کہ مکان گرے گا تو پھر جو کچھ ہوگا ہم ساتھ ہی خطرہ جھیلیں گے۔ دوسرے روز کسی طرح پانی نکلا۔ آپ اسکول گئے۔ ہیڈ ماسٹر بولا "کل آپ کیوں نہیں آئے؟"

"صاحب ادھر پانی بہت تیز تھا۔"

"کیا آپ نمک تھے' گل جاتے؟"

"میں نمک تو نہیں تھا' ہاں میرے پڑوس کے مکان گر رہے تھے' ممکن ہے میرا بھی مکان گر پڑتا" ہیڈ ماسٹر بولا "کیا آپ روک کر اسے گرنے سے روک لیتے؟"

آپ بولے "روک تو نہیں سکتا تھا۔ ہاں' ساتھ مر سکتا تھا۔"

"تو آپ اسی لیے رک گئے تھے؟"

آپ بولے ''جی۔''

آپ گھر کا کام کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ہمیشہ گھر کے کام میں مدد بھی کرتے تھے۔ یہ کام مجھے نامناسب لگتا۔ میں چاہتی تھی کہ باہر کا کام ان کے ذمے ہو اور اندر کا میرے۔ جو کام مجھے کرنا ہوتا اُسے وہ میرے سوتے میں ختم ہی کر دیتے کیونکہ میں ایسے کاموں کے لیے انھیں ہمیشہ روکتی تھی۔ اس پر میں کبھی کبھی ناراض بھی ہو جاتی۔ کوئی گھر کا بھاری کام ہوتا تو ان کی چوری میں پہلے کر لیتی۔ کیونکہ وہ کئی سال بیمار رہنے کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے اس لیے ہم دونوں میں ہمیشہ بازی سی لگی رہتی۔ اسی طرح ہمارا گھر کا کام چلتا تھا۔

چار سال پہلے کی بات ہے۔۔۔۔ پھر بستی

چار سال کی بات ہے وہاں پر ووٹنگ کا سوال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس کا آدمی ووٹ پائے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں ایک کنویں کی ضرورت ہے۔ بولے ''میں کنواں تمھارے لیے بنوا دوں گا۔ ووٹ انھی کو دینا۔ ان کے ہاتھوں میں تمھارا بھلا ہوگا'' وہاں پر زیادہ بستی کاشت کاروں کی ہے۔ اتفاق سے ایک دوسرا گری تھا۔ جو ممبروں کے لیے کھڑا تھا۔ ان کے کہنے پر بھی وہاں کے سارے ووٹ اس کانگریسی کو نہیں ملے۔ جب معلوم ہوا گاؤں والوں کو تو کانستھ لوگ بوکھلا گئے۔ آ کر بولے ان آدمیوں کو آپ جہاں تک جہاں سے نکال سکیں اچھا ہو۔ یہ آپ کی بے عزتی ہوئی۔

آپ بولے ''تم لوگ کیا بکتے ہو؟ میری زندگی کا یہی مقصد ہے کاشت کاروں کو سدھارنا۔ میرا اس بات کی قیمت ہی کیا جس کے پیچھے میں سب کو تباہ کر دوں۔ لوگوں نے نہ مانا تو اپنا نقصان کیا نہ کہ میری۔ میں انھیں تباہ کر دوں یہ شرافت نہیں ہے۔ پھر میں تو چاہتا ہوں وہ اپنے پیروں کھڑے ہوں۔ آج میں ان کو بھلا بتا رہا ہوں کل شاید کوئی انھیں دھوکا دے۔ بھیڑوں کی طرح کسی کے اشاروں پر پبلک کا چلنا کہاں تک ٹھیک ہے؟

میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ انھوں نے خود سمجھ کر جو بھی کیا اچھا کیا۔ اب سب میں کچھ نہ کچھ سمجھداری آ گئی ہے۔ میرے سالے تو علاقے دار تھے پر ووٹ نہیں ملے تو کیا وہ اپنے علاقے کو تباہ کر دیں یا کہ انھیں ایسا کرنا چاہیے۔''

کئی مہاشے ایک ساتھ بولے ''آپ کا مان بھنگ ہوا۔''

''اس میں میری عزت ہے۔ پیچ نہیں ہونا چاہتا۔''

سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ جب آپ اندر آئے تو میں نے پوچھا ''کیا تھا؟''

''کچھ نہیں جی۔ گاؤں والوں نے ووٹ نہیں دیے۔اسی سے گرمائے ہوئے ہیں۔''

ان ہی دنوں کا ایک واقعہ اور ہے۔آپ صبح کے وقت اندر ناشتہ کرر ہے تھے اور دو بچوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔پچیسوں آدمی اکھٹا تھے۔دو بچے آپس میں گھتے مار پیٹ کرر ہے تھے۔ایک بچہ دونوں کو چھڑا رہا تھا۔چھڑانے والا ایک کا بھائی تھا۔آپ نے سمجھا۔ایک بچے کو دو آدمی مل کر پیٹ رہے ہیں۔چھڑانے والے بچے کو دو تمانچے کس کر لگائے اور بولے''بدمعاش مارتا ہے''

چھڑانے والا بولا''میں تو چھڑا رہا تھا۔''

تب تک میں بھی وہاں پہنچ گئی۔مار کھانے والے بچے پر مجھے دیا آئی۔میں بولی''مت رو بیٹے۔ان کی غلطی ہے''۔

بچہ بولا'' کچھ نہیں اپنے ناناہی تو تھے۔''

میرے ساتھ بابوجی گھر آئے۔میں بولی آپ کو غصہ بے وجہ ہی چڑھتا ہے۔وہ غریب کیا کر رہا تھا۔''

''میں سمجھا وہ مار رہا ہے''۔

''پوچھ کیوں نہ لیا۔وہاں کا معاملہ بنا جانے آپ نے مارنا شروع کر دیا۔وہ دونوں کے دونوں شیطان ہیں۔آپ جہاں کا جھگڑا گھٹار ہے تھے وہاں کا حال تو دریافت کر لیتے۔''

''ہاں یہی تو غلطی ہوئی۔'' مجھے بھی غصہ آ گیا۔

''یہ کہنے سے آپ بے گناہ تو نہیں ہو سکتے''۔

''تم دے لو سزا''۔

''آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔یہی سب سے بڑی سزا ہے۔''

''اب ایسا نہ ہوگا''۔

باہر وہ بچہ پتھر پر بیٹھا تھا۔اسے وہاں جا کر چمکارا۔اس کے بعد اسے لے کر میرے پاس آئے۔بولے:اسے کچھ کھلاؤ۔

میں بولی''اچھا مارا آپ نے'مٹھائی میں کھلاؤں۔آپ کھلایئے نا۔

''ارے تمھارا ابھی تو ناتی ہے۔''

ایک بار کی بات ہے۔ میں بستی جا رہی تھی۔ آپ بیمار ہی تھے۔ رات کا وقت۔ پیٹ بھاری تھا۔ ہم تین آدمی تھے۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ ان کے لیے میں نے بستر لگا دیا۔ وہ لیٹے ہوئے تھے۔ لڑکی بھی سوئی ہوئی تھی۔

''دو مسافر آئے اور بولے'' اوروں کو بیٹھنے کی جگہ نہیں پر یہ سو رہے ہیں۔''

میں بولی ''تم بھی کہیں بیٹھ جاؤ۔''

''ان کو اٹھا دو۔''

''ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔''

مسافر بولے'' جب طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو چلے کیوں تھے؟''

میں بولی'' بک بک مت کرو۔''

'' گاڑی کا کرایہ تم ہی نے دیا ہے؟''

''اچھا جہاں تمھیں جگہ ملے وہاں بیٹھو'' میں بولی۔

''انھیں اٹھا کر بیٹھیں گے۔'' ایک مسافر بولا۔

''اٹھاؤ۔ میں ذرا دیکھوں تو۔''

وہ آگے بڑھا۔ مجھے غصہ آیا۔ میں نے طیش میں کہا'' خبردار اگر آگے بڑھے تو گاڑی کے نیچے جھونک دوں گی۔ ہم دونوں کی باتوں سے ان کی نیند کھل گئی اور انھوں نے ہڑبڑا کر اٹھنا چاہا۔ میں نے کہا'' آپ کیوں اٹھتے ہیں۔''

آپ بولے'' اٹھ جانے دو۔ کیوں لڑائی کرتی ہو۔''

میں نے کہا'' ان گدھوں سے سیدھے کام نہ چلے گا۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں۔ میں نے آپ کی حالت بتائی تھی پھر بھی ان گدھوں کو عقل نہیں آئی۔ یہ زور دکھانا چاہتے ہیں۔ میں انھیں نیچے پھینک دوں گی۔''

جب ان لوگوں نے مجھے طیش میں دیکھا تو دبک کر کھڑے رہے۔ وہ لوگ کئی اسٹیشن تک کھڑے کھڑے ہی گئے۔ جب وہ لوگ گاڑی سے اتر گئے تو مجھ سے بولے'' تم بڑی دلیر ہو۔ میری ہمت اس طرح دھمکی دینے کی نہ پڑتی۔''

پھر بولے'' مانو وہ مجھے جگا دیتے تو تم کیا کرتیں؟''

''گاڑی سے نیچے پھینک دیتی اور کیا کرتی۔''

''گرنے پر وہ زندہ رہتے؟ تمھیں پھانسی نہ ہوجاتی۔''

''پھانسی کا سوال تو بعد میں اٹھتا ہے۔ غصہ یہ سب نہیں دیکھتا۔''

''تم بڑی اڑیل ہو۔''

میں نے کہا'' میں کوئی ٹکنے والی نہیں ہوں۔ آخر وہ میرے ساتھ ایسے کیوں پیش آرہا تھا؟ وہ چیلنج کیوں دے رہا تھا؟ یہی سمجھ کرنا کہ وہ بیمار ہیں اور یہ عورت ہے۔ میں اسے مزہ چکھا دیتی کہ میں پردے والی عورت نہیں ہوں۔ اور وہ اگر بھلے مانس کی طرح آتا اور کہتا تو میں شاید جگہ بھی دیتی۔''

''کچھ بھی ہو تم بہت اڑیل ہو۔''

''میں کب کہتی ہوں کہ اڑیل نہیں ہوں۔''

گورکھپور

گورکھپور کا تبادلہ ہوا۔ ہم نے سب سامان گورکھپور کے لیے بک کرایا۔ بک کرانے پر پتہ چلا کہ جو کوارٹر ہمیں گورکھپور میں ملے گا وہ ایک دن دیر سے ملے گا۔

جب وہاں سے آنے پر آپ کھانا کھانے بیٹھے تو بولے''ابھی تو ہمیں کل چلنا ہے کیونکہ کوارٹر خالی نہیں۔ آج خط آگیا ہے۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ کل چلوں۔''

میں کئی دنوں سے بیمار تھی۔ سامنے بیٹھے وہ کھانا کھا رہے تھے۔

میں بولی''اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ میںے دو مہینے کی چھٹی لے کر بیٹھیے۔''

آپ بولے''کیا آج ہی چلنا چاہتی ہو؟''

''ہاں آج ہی۔ سامان تو بک ہوگیا اور میں یہ ۔ ور یہ مصیبت ہوگی۔''

آپ بولے''چلو ایک دن اسکول ہی میں ٹھہریں گے۔''

''ہاں چلیے'' میں نے کہا۔

ہم وہاں سے چلے۔ تین بجے چل کر شام کو پانچ بجے پہنچے۔ اسکول میں ٹھہرائے گئے۔ اسکول کے

برآمدے میں سب ماسٹروں اور دو سو کے لگ بھگ لڑکوں نے گھیر لیا۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب وہاں کے ایک ماسٹر مجھے ایسی حالت میں جان کر اپنے گھر لے گئے۔ بولے ''کل کوارٹر خالی ہو جانے پر اس میں چلا جاؤں گا۔ بات ایک ہی ہوگی۔''

دس بجے رات کو دھنو کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس پچاس کے آس پاس تھی۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا تو ماسٹر صاحب دائی بلانے خود گئے۔ اور دروازے پر باجے بجنے لگے۔ اس محلے بھر میں شور ہوا۔ کہ آخر بچہ ہوا کہاں؟

پھر صبح ماسٹر صاحب اسی کوارٹر میں جو ہمیں ملنے والا تھا چلے گئے۔

اس مکان میں ہم دو مہینے رہے۔

دھنو مُول میں ہوا تھا۔ اس کی پوجا ختم ہونے پر اسکول کے پورے اسٹاف کو دعوت دی گئی۔ پھر ہم (اپنے) کوارٹر میں آئے۔ اسی مہینے میں آپ کی دس روپے کی ترقی ہوئی۔

(مول'' پانچ اور بعضوں کے نزدیک تین دوسرے نکشتر ستارے۔ جو بچے کی پیدائش کے وقت نامسعود سمجھے جاتے ہیں)

پھر آپ بی اے کی تیاری میں لگے۔ پھر وہی بستی کا معمول چلنے لگا۔ صبح اٹھنا۔ بیت الخلا جانا ویسے ہی ناشتہ کرنا وغیرہ۔

ان دو لڑکوں کو وہ برابر روزانہ کچھ دیر تک کھلاتے اور پیار کرتے۔

دھنو جب آٹھ مہینے کا تھا' تب ہی میرے پھوڑا نکل آیا تھا۔ انھی دنوں آپ کو ایک مہینے ڈاکٹری پڑھنے کا حکم الہ آباد میں ہوا۔ ہیڈ ماسٹر بولا'' آپ جا کر پڑھ آیئے۔ اس میں دس روپے آپ کی ترقی بھی ہے۔ اسی لیے میں نے آپ کو رکھا۔''

آپ بولے'' میں کیسے جاؤں۔ میری بیوی کے پیر میں پھوڑا ہوا ہے۔''

ہیڈ ماسٹر نے کہا'' آپ ضرور جایئے۔ وہ اچھی ہو جائیں گی۔''

آپ بولے'' مجھے تو یہ پھوڑا خطرناک لگ رہا ہے۔ دو مہینے گزر گئے۔ کیسے جاؤں۔''

ہیڈ ماسٹر نے کہا'' ترقی آپ کی ہو جاتی اور کوئی بات نہیں۔''

آپ بولے'' ترقی کی نہ مجھے بہت خواہش ہے'' نہ انھیں۔ پھر ایسا کیوں کروں۔''

''اس کا ذمہ مجھ پر' ہیڈ ماسٹر نے کہا''میں آپ کے گھر کو اپنے گھر کی طرح سمجھوں گا۔''

''اچھا آپ کے کہنے سے میں جاتا ہوں''۔

تب تک میرا پیر بھی کچھ اچھا ہو چلا تھا۔ میں نے بھی کہا'' جائیے''۔

آپ ایک مہینے کے لئے گئے بھی۔تب تک ہیڈ ماسٹر روزانہ دیکھنے کے لیے آتے تھے۔

گورکھپور میں گو ایک ماہ تک اکیلی رہی پھر بھی مجھے ذرا سا اکیلا پن محسوس نہ ہوا۔ سارا اسکول مجھے اپنے رشتے دار کی طرح سمجھتا تھا۔ یوں تو ان کے بہت چاہنے والے تھے وہ بھی سب کو پیار کرتے تھے۔

ایک ماہ بعد آپ پریاگ (الہ آباد) سے واپس آئے۔ پھر دس روپے اور ترقی ہوئی۔ ستر ملنے لگے۔ان کا بھائی لکھنو میں پڑھتا تھا۔ پچیس روپے اسے دیتے تھے۔ باقی پینتالیس میں سوتیلی ماں' میں' لڑکی' لڑکا اور آپ خود بھی۔ گھر کا پیسوں کا حساب میں نے سوتیلی ماں پر چھوڑ دیا۔ پھر وہی کچ کچ چلنے لگی۔ آپ کو ان باتوں سے پریشانی ہو جاتی تھی۔

ایک روز کی بات ہے مجھ سے بولے''اور کام میں چاہے لاپرواہ رہو' کرو یا نہ کرو' پر روپوں کے جھنجھٹ سے تو مجھے بری رکھو۔''

میں نے ہنسی میں کہا''کون تمہارا جھنجھٹ اپنے سر لے۔ آپ کی بلا' آپ اپنے سر لیں۔''

بولے'' یہ کام تم اپنے ہاتھ میں لے لوگی تو میں اور بھی کچھ کر دھر سکتا ہوں۔ نہیں تو ہر وقت میں اسی جھنجھٹ سے پریشان رہوں گا۔''

میں بولی''کون یہ جھنجھٹ لے۔ آپ ہی بتایئے''؟

بولے''تم تو ہی ہو۔ مجھ سے تم پائی پائی کا حساب لو اور ہر دم کی کچ کچ سے دور رکھو۔''

ان کے بھائی کو ۲۵ روپے تو بندھے ملتے ہی تھے۔ پرائیویٹ خرچ' کپڑے لتے بھی دوسرے مہینے کچھ نہ کچھ بھیجنا ہی پڑتا۔

''میں پینتالیس روپے میں کیا کروں گی۔ آپ کی ماتا (سوتیلی ماں) الگ تنی رہتی ہیں۔''

''کچھ بھی ہو تم سنبھالو۔اس کے لیے تم مجھ سے پہلے ہی دھنیواد لے لو۔''

مجھے ان کی اس ادب پر دیا آئی اور میں نے کہا''میں اس مہینے سے سارا انتظام اپنے ذمے لے لیتی ہوں۔ آپ نشچنت رہیے۔''

۰ے روپے تو انھیں مل رہے تھے وہ روپے لاکر مجھے اسی دن دیے۔ میں نے لے کر رکھ لیے۔ خرچ کرتی رہی۔ سامان لانے وہ خود جاتے۔ کسی طرح انتظام چلتا رہا۔

مئی کے مہینے میں ان کا بھائی تعلیم پا کر گھر آیا۔ دو مہینے گھر پر رہنے کے بعد بستی میں بندوبست آفس میں نوکر ہوا تو تو میں ان ۲۵ روپوں کو بنک میں جمع کرنے کے لیے ماہانہ دینے لگی۔ جب پہلے مہینے میں میں نے انھیں پچاس دیے تو انھوں نے جمع نہ کرایا بلکہ باہر اپنی الماری میں رکھ لیا۔

مجھے کیا پتہ۔ پھر دوسرا مہینہ آیا۔ میں نے پھر روپے دیے کہ انھیں جمع کرا آیئے تو آپ بولے ''ابھی تو اس مہینے کے روپے ہی پڑے ہیں۔''

میں حیرت میں آ گئی' بولی ''کیا بات ہے؟''

آپ بولے ''میرا ایسا خیال تھا کہ کہیں خرچ ہی کم نہ پڑ جائے' پر تم دوبارہ دے رہی ہو تو دیکھو میں ابھی دونوں مہینے کے روپے جمع کرا تا ہوں۔''

''کیا خوب! آپ بھی اچھے رہے'' میرے منھ سے نکلا ''خرچ کا اندازہ اگر مجھے ٹھیک نہ ہوتا اور اتنے میں چلانا ناممکن لگتا تو بھلا میں دیتی کیوں؟''

۱۹۱۶ء

سنہ ۱۹۱۶ کی بات ہے' اپریل کی شاید ۲۰ تاریخ تھی گھر سے ان کے بڑے بھائی صاحب کی ماں اور چھوٹی بھاوج گورکھپور آئی تھیں۔ گاؤں میں پلیگ تھا اور ان کے بھائی صاحب اندور میں نوکر تھے۔ وہیں اپنی اکیلی بیوی کے ساتھ تھے۔ گھر پر اور کوئی مرد نہ تھا۔ وہ لوگ سیدھے گورکھپور چلے آئے اور وہ اپنا ہی سمجھ کر آئی تھیں۔ ان کا آنا ہماری چاچی صاحبہ کو اچھا نہ لگتا تھا اور انہیں کا دکھڑا لے کر وہ روز ان سے جھگڑا کرتی تھیں۔ ایک وقت وہ باورچی خانے میں کھانا کھا رہے تھے اور کیا بات ہوئی یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر جب وہ میرے پاس آئے تو میں نے پوچھا ''آخر بات کیا ہے؟ تم میں روز جھگڑا کیوں ہوا کرتا ہے؟'' بولے ''جھگڑا اس بات کا ہے کہ ان کا لڑکا اب اسی سال کہیں نہ کہیں نوکر ہو جائے گا۔ وہ چاہتی ہیں کہ جو کچھ وہ کہیں وہی میں کروں۔ چھوٹی بھابھی جو گھر سے میرے پاس آ گئی ہیں وہ کیوں آئیں۔ یہی جھگڑے کی بات ہے۔ وہ اپنا ہی سمجھ کر میرے پاس آئیں۔ اور حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو کیا میں ان کا کوئی غیر ہوں۔ اگر وہ میری سوتیلی ماں ہیں تو وہ بھی میری چاچی ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ دونوں کا حق میرے اوپر ایک سا ہے۔ اگر یہ بات تم کو بری

لگتی تو میں سمجھتا کہ یہ واجب ہے۔ مگر یہاں الٹا ہوتا ہے۔ جب میں سنتا ہوں تب بار بار یہی کہتی ہیں کہ تم لوگ گرمی کی چھٹی میں چلے جاؤ گے تو ہم کرایے کا مکان لے کر شہر میں الگ رہیں گے۔''

میں بولی ''الگ ہی رہنا ہے تو بستی میں جو جگہ ملتی ہے وہاں کیوں نہیں بھیجتے۔ الگ ہی رہنا ہے تو گورکھپور میں کیوں بستی میں بھیجیے۔

آپ بولے'' اجی کچھ نہیں' یہ سمجھتی ہیں کہ اب میں ان کی کمائی کھانے کے لیے تیار ہوں۔ اور میں کہتا ہوں کہ جس دن مجھے کسی کی کمائی کھانے کا وقت آئے گا میں اس سے زہر کھا لوں گا۔ میں اتنا نیچ نہیں ہوں میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔''

میں بولی ''اس میں تو جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنی اپنی فکر کرنی چاہیے۔ دوسروں کی کیا فکر ہے''۔

ان دنوں میری گود میں آٹھ مہینے کا دھنو تھا اور مجھے دو ماہ سے دست کی بیماری تھی۔ پھر بچہ دودھ کیا پیتا۔

ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اگر بچے کو دودھ پلایا گیا تو ماں کو تھائی سس ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس ڈر سے ڈیڑھ سیر دودھ آتا تھا کہ بچہ پیئے گا اور کچھ کا دہی تیار کیا جائے گا جس کا مٹھا میں پیتی۔ ہوتا اس کا الٹا تھا۔ آدھ سیر دودھ چاچی پہلے ہی اپنے لڑکے کے لیے رکھ دیتیں۔ باقی ایک سیر دودھ میں سے تھوڑا ان کو بھی دے دیتیں۔ اور ایک بچی تھی اس کو بھی دودھ چاہیے ہوتا۔ اب بچے کے لیے دن بھر کے لیے بچا آدھ سیر دودھ۔ آمدنی اتنی نہیں تھی کہ اوپر سے اور زیادہ دودھ منگاؤں۔ پھر یہ ہوتا تھا کہ بچے کو ساگودانہ ابال کر پانی میں گھلانا پڑتا۔ اس کا پھل یہ ہوا کہ اس کو خون کے دست ہونے لگے۔

ایک دن گوالا دودھ لے کر دروازے پر آیا۔ آپ دودھ لینے کے لیے لوٹا لینے آئے۔ میں بولی: ''اب سے بچے بھر کے لیے دودھ آئے گا اور کسی کے لیے نہیں۔''

گورکھپور ۱۹۱۶ء

سنہ ۱۶ کی بات ہے آپ کی بہن میرے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس بھی دو بچیاں تھیں' وہ تھیں۔ دو ہم تین وہ۔ انفلوئنزہ میں بیمار پڑے۔ اب ان کی سیوا کا حال سنیے۔ بہت صبح اٹھنا' اس کے بعد آگ جلانا۔ حقہ پی کر کاڑھا چڑھانا۔ اتنی دیر میں بیت الخلا ہو آنا۔ پاخانے سے لوٹنے کے بعد پانی اپنی بہن کو پہلے' اور مجھے پانی داتون دے جانا۔ تب تک دھنو' بیٹی اور اپنی بھانجی وغیرہ کا ہاتھ منہ دھونا۔ اگر ان کی بھانجی ٹھیک ہوتی تو لڑکوں کو دودھ خود پلا دیتی۔ ان سب کاموں کو کرنے

کے بعد آپ کو کھانا بنانے کی ہوتی ۔ ہاں لڑکی کی صحت اگر ٹھیک ہوتی تو وہ خود بنا دیتی ۔ اس کو اگر بخار چڑھ جاتا تو مجبور ہو جاتی ۔ کھانا بنا کر سب کو جوس پانی دینا بھی انھی کا کام تھا ۔ پان بنا کر میرے ڈبے میں رکھ کر' دھنو کو گود میں لیے ہوئے ہی اسکول چلے جاتے تھے ۔ پھر بارہ بجے آتے ۔ پھر بیٹی کو دودھ پلاتے ۔ دھنو کو دودھ پلاتے ۔ پھر پان کھا کر دھنو کو اسکول چلے جاتے ۔ شام کو پھر اسی طرح ۔

اب دونوں بچوں کو سلانا بھی انھیں ہی پڑتا ۔ ایک کو ایک طرف' دوسرے کو دوسری طرف ۔ رات میں لڑکے پیشاب کر ہی دیتے تھے تو آپ خود بھیگ جاتے اور کپڑے بدلتے' دوسرا بچھونا بچھاتے ۔

جب سے دھنو ہوا تھا بیٹی کو برابر اپنے پاس رکھتے تھے ۔ کہیں رات میں بچے رونے لگتے تو رات بھر انھیں لٹکائے جاگتے رہتے ۔ غصہ تو انھیں چھو تک نہیں گیا تھا ۔ اس کے تیسرے برس دوسرا بچہ ہوا تو وہ دھنو کو بھی اپنے پاس رکھنے لگے ۔

میرا دو ہلا لڑکا گیارہ مہینے کا ہو کر چیچک سے بیمار پڑا ۔ چیچک کالی تھی ۔ میں نے لڑکے کی حالت دیکھ کر کہا ''کوئی ڈاکٹر بلا ئیے ۔ چیچک کا رنگ خطرناک ہے ۔''

آپ اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں گئے اور ڈاکٹری کی کتاب وہاں سے دیکھ کر آئے ۔

مجھ سے بات کرتے ہوئے ان کا گلہ بھرا ہوا تھا ۔ کمرے میں ، میں شاید رو رہی تھی بولے ''تمھارا یہ لڑکا بچتا نہیں معلوم ہوتا ۔''

میں نے کہا ''پہلے ڈاکٹر بلا ئیے ۔''

''ڈاکٹر کو لاتا ہوں پر مجھے وشواس نہیں'' ۔ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے ''مرنا جینا تو لگا ہی رہتا ہے ۔ کیا کرو گی ۔ اپنا کیا بس ہے؟''

اسی وقت چاچی کو تار دیا ۔ وہ اپنے میکے میں تھیں ۔ جب دوسرے روز آئیں تو ان سے بولے ''بیٹی اور دھنو کو لے کر تم مردانے کمرے میں رہو ۔ یہ تو بھلا بچے رہیں ۔ میری تو رائے ہے کہ انھیں گھر سے بھی دور رکھا جائے ۔''

چاچی بولیں ''نہیں چیچک کے دِنوں میں باہر جانا ٹھیک نہیں ۔''

وہ الگ رہنے لگیں ۔

لڑکا گیارہویں دن ٹھنڈا ہونے لگا ۔

پھر ڈاکٹر آیا۔ اس نے کہا صبر کیجئے۔

رات کو جس وقت مرا میں اور وہ ساتھ تھے میں چاہتی تھی وہ خود بھی دور رہیں۔

جب انھوں نے مجھے روتے دیکھا' یعنی جب کہ بچہ مر چکا تھا' تو میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھا لائے اور مجھ سے بولے'' کیوں روتی ہو؟ کیا سکھ اس سے تمھیں ملا۔ گیارہ ہی مہینے زندہ رہا اس پر بھی برابر بیمار۔ میں تو زندہ ہی ہوں۔ اصل میں میں ہی تمھارا ہوں۔

اس دن رات بھر مجھے پکڑے رہے۔ وہ رات بھر برابر بیٹھے بھی رہے۔ صبح جب اس کی لاش چلی گئی تو اس کا سارا سامان جلوا دیا۔ پھر سارے کمرے کو فنائل سے دھلوایا۔ اس کے بعد وہاں پر ہون کرایا (پوجا کی شکل میں نذر)۔ پھر اس کمرے میں نو مہینے تک تالا پڑا رہا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے کمرہ بند کر کے تالی باہر پھینک دی تھی اور اس کی کسی چیز کو گھر میں نہیں رہنے دیتے تھے۔

اس کے بعد خود بیمار پڑے۔ جو انھوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے۔ اس وقت ۱۹۲۰ تھا (تفصیل ہنس کے خودنوشت سوانح عمری نمبر میں چھپے ان کی تحریر سے ہے)

شروع شروع میں بیمار ہونے پر انھوں نے پانی کا علاج شروع کیا جس سے پیٹ اور بھی بڑھ گیا۔ کبھی کبھی پیٹ میں درد بھی ہوتا۔ دوا سے آپ بہت گھبراتے تھے۔ اور دوا کرتے بھی نہیں تھے۔ اسکول میں آرام کرسی پر لیٹے رہتے تھے۔ گھر میں ادب کا کام تو اسی طرح چلتا رہا۔

اس کے دو مہینے بعد میں نے اپنے پتا کو لکھا کہ یہ بیمار ہیں اور یہ بیماری ہے۔ میرے پتا نے خط پڑھتے ہی میرے وکیل بھائی کو بھیجا اور کہا فوراً لوا لاؤ۔ الگ مکان لے کر ان کی دوا ہوگی۔

میرے بھائی آئے اور بولے'' پتا جی آپ کو بلا رہے ہیں۔ وہیں آپ کی دوا ہوگی۔

آپ بولے'' میں دوا کر چکا بھائی کہاں تک دوا کروں۔''

وہ بولے'' نہیں صاحب چلنا ہی پڑے گا۔ پتا جی کی سخت تاکید ہے''۔

آپ بولے'' میں تو نہیں جاؤں گا۔ تم جس ڈاکٹر سے علاج کرانا چاہو اسے یہاں بلاؤ اور خود بیٹھو''۔

بھائی بولے'' آپ کو وہاں چلنے میں تکلیف نہیں۔ الہ آباد سے ڈاکٹر لانے میں آپ ہی بتلائیے کیسے ہوگا کیا ہوگا' یہاں سے بالکل ناواقف ہوں۔

آپ بولے'' ان سے کہہ دیجئے میں اچھا ہوں۔''

وہ بے چارے مجبور ہو کر چلے گئے۔ آٹھ روز کے بعد پھر انھیں پتا جی نے بھیجا۔ پھر وہی روکھا جواب۔

۱۹۱۷ء

ایک بار کی بات ہے۔ میرے گھر کا زینہ چھوٹا تھا۔ اوپر سے ایک چار پائی نیچے اور نیچے سے ایک چار پائی اوپر کرنی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے مجھ سے کہا "چھوٹے بھائی کے آنے پر اس سے کہنا 'وہ رکھ دے گا۔ جب وہ آیا تو میں نے چار پائی کو نیچے لے جانے اور نیچے کی چار پائی کو اوپر لے جانے کے لیے کہا۔ وہ بولا" بھائی آئیں گے تو وہ خود رکھیں گے۔ مجھے یہ برا لگا میں نے خود چار پائیوں کو اپنے ہاتھوں اوپر نیچے کیا۔ میں ان دنوں بیمار تھی۔ جب انھوں نے اسکول سے لوٹنے پر چار پائی کو نیچے دیکھا تو بولے "اسے کون یہاں لایا؟" میں نے کہا" میں۔ جو آپ کے گھر میں سب سے تندرست ہوں " تب آپ بولے" تمھیں ایسا کرنے کی کیا جلدی تھی۔ میں تو آ ہی رہا تھا۔"

میں نے غصّے میں کہا" سب کاموں کے لیے کیا آپ ہی ہیں۔ آخر یہ چھوٹے موٹے کام یہ لوگ نہیں کر سکتے؟" وہ بولے" اس میں زبردستی کس بات کی؟ اپنی طبیعت"

میں بولی" طبیعت کو سب ہی آرام پہچانا چاہتے ہیں۔ میں' آپ' سب ہی چپ بیٹھ جائیں تو کام کیا خود ہو جائیں گے۔ چاہیے تو یہ کہ اپنے اپنے لائق سب کام کریں۔ گرہستی کے یہی معنی ہیں۔"

"بھائی زبردستی کچھ نہیں ہوتا۔"

میں پھر جھنجھلائی اور بولی" اچھا پسو۔ مجھے کیا۔"

گورکھپور: انسپکٹر کا معائنہ

جاڑے کے دن تھے۔ اسکول کا انسپکٹر معائنہ کرنے آیا تھا۔ ایک روز تو انسپکٹر کے ساتھ رہ کر آپ نے اسکول دکھا دیا' دوسرے روز لڑکوں کو گیند کھیلنا تھا اس دن آپ نہیں گئے۔ چھٹی ہونے پر آپ گھر چلے آئے۔ آرام کرسی پر لیٹے دروازے پر آپ اخبار پڑھ رہے تھے۔ سامنے ہی سے اپنی موٹر پر انسپکٹر جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ یہ اٹھ کر سلام کریں گے لیکن آپ اٹھے نہیں۔ اس پر کچھ دور جانے کے بعد انسپکٹر نے گاڑی روک کر اپنے اردلی کو بھیجا۔ اردلی جب آیا تو آپ گئے اور بولے "کہیے کیا ہے؟"

انسپکٹر بولا ''تم بڑے مغرور ہو۔ تمہارا افسر دروازے کے سامنے سے نکل جاتا ہے اٹھ کر سلام بھی نہیں کرتے۔''

''میں جب اسکول میں رہتا ہوں نوکر ہوں' بعد میں میں بھی اپنے گھر کا بادشاہ ہوں۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس پر مجھے حق ہے کہ آپ پر میں کیس چلاؤں۔''

انسپکٹر چلا گیا۔ آپ نے اپنے دوستوں سے رائے لی کہ اس پر کیس چلانا چاہیے۔ دوستوں نے صلاح دی جانے دیجیے۔ آپ بھی اسے مغرور کہہ سکتے تھے۔ بنائیے اس بات کو۔ مگر اس بات کی خلش انھیں بہت دنوں تک رہی۔''

پانچویں مہینے جب پچیس کے علاوہ ۸۰ روپے میں نے اور دیے اور جمع کرانے کو کہا تو آپ بولے۔ ''یہ روپے کہاں تھے؟''

میں نے کہا ''ہر مہینے کے خرچ میں سے بچے ہیں' اب یہاں کیوں رہیں؟''

آپ بولے ''یہ بچت کے روپے تو پھر تمھارے ہوئے۔''

''تو پھر سب میرے ہوئے'' میں نے کہا آپ تو کبھی ایک پیسہ نہیں بچا پائے۔

''خیر لاؤ رکھ آؤں اچھا ہی ہے''۔

ان کی چاچی کو یہ روپے برے لگے۔ جب چلے گئے تو بولیں ''کیا میں روپے اپنے پاس رکھ لیتی تھی؟''

''میں نے کہا'' رکھنے کا الزام کہاں لگا رہی ہوں؟ بس بچ گئے۔ گھر میں رکھنے سے کیا ہوتا۔ ضرورت پڑنے پر وہاں سے بھی تو آ سکتا ہے۔''

''انھیں برا تو لگے ہی۔''

''وہ شام کو آنے پر مجھ سے بولے'' بھائی کیا بات ہے؟ سچ سچ بولو'' کیسے پورا انتظام کر لیتی ہو''؟ میں نے کہا'' آخر چیزیں لاتا کون ہے' آپ ہی نا۔ تو آپ پورے خرچ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تھوڑا خرچہ پچھلی کا اور بڑھ گیا ہے پہلے کی بہ نسبت۔''

''سچ کہتا ہوں' مجھے تو خرچ پورا پڑنے ہی کی فکر رہتی تھی۔ اچھی بات ہے' تم ایسے ہی چلاتی رہو۔''

اس کے بعد سے تو وہ چیزوں کو لے آنے کے بعد پیسے پیسے کا حساب اسی طرح دیتے تھے کہ جیسے

کوئی پرایا حساب دیتا ہو۔ پیسہ دھیلا جو بھی بچتا۔ اسے مجھے واپس کر دیتے۔ کہیں سے بھی جو پیسے آتے اسے مجھے وہ فوراً دے دیتے۔ حساب تو کبھی بھی نہیں مانگا۔

کھانے پینے کے معاملے میں تو بچوں کی طرح ذرا سا بھی جو پائیں چپکے سے کھالیں اور کچھ نہ بولیں۔ اگر اپنی پسند کی کوئی چیز وہ کھانا چاہیں اور میری مرضی نہ ہوتو اسے وہ ہرگز نہیں کھاتے تھے۔

میری باتوں کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ اپنی زندگی میں کوئی بھی کام انھوں نے میری صلاح کے بنا نہیں کیا۔

ایک دفعہ کی بات ہے میں بیمار تھی۔ دست آرہے تھے۔ میرا لڑکا دھنو آٹھ مہینے کا تھا۔ بیمار کئی مہینے رہی۔ ڈاکٹروں کو اندیشہ تھا کہ اپنے بچے کو میں اگر دودھ پلاتی رہی تو تپ دق ہو جانے کا پورا خطرہ ہے۔ اس پر آپ ایک دن بولے "مہترانی کو دودھ پلانے کے لیے رکھ لو نہیں تو دھنو تو کمزور ہو جائے گا۔"

میں بولی "ایسا نہیں ہوگا۔"

"نہیں جی دودھ میں کیا حرج ہے؟ تم اسے مت چھونا۔ وہ تو بچہ ہے۔"

"بچے پر دودھ کا اثر بہت پڑتا ہے۔ اس کا دودھ اس کی حالت کے مطابق بھی تو نہیں ہوگا۔ وہ آٹھ مہینے کا ہے۔ مہترانی کو تو ابھی بچہ ہوا ہے۔ اس کا دودھ کیسے موافق ہوگا"۔

آپ بولے "پھر تم ہی بتاؤ کیا کروں؟"

"بکری کا دودھ ٹھیک ہوگا۔"

ایک بکری انھوں نے منگوائی۔ بچے کے لیے جب بھی دودھ کی ضرورت پڑتی خود دودھ دوہتے۔ چاہے کوئی وقت کیوں نہ ہو۔

مگر لڑکا ایسی نٹکھٹ طبیعت کا تھا کہ شیشی کا ربڑ ہی کاٹ ڈالتا۔ پھر وہ ہاتھ پکڑتے میں چمچے سے منہ میں دودھ ڈالتی۔ کبھی کبھی مجھے بھی اس نے گرادیا۔ بہت ہی مچلتا تھا۔ پھر تھوڑا تھوڑا سابودانہ (ساگودانہ) کھلانے لگی۔

پھر ایک سیر دودھ اہیر کے یہاں سے آنے لگا۔ چاچی اس میں سے آدھا تو اپنے بچے کے لیے لے لیتی تھیں باقی آدھ سیر سابودانے کے لیے بھی پورا نہ پڑتا۔ یہ دیکھ کر کہ ذرا سے بچے کا بھی خیال نہیں رکھتیں مجھے غصہ آگیا۔

میں نے کہا'' آج سے کل تین پاؤ دودھ آئے گا۔ صرف دھنو کے لیے۔''

اس پر آپ بولے'' بیٹی کیا یوں ہی جئے گی؟ اسے بھی تو چاہیے۔''

'' یہاں دھنو کا ہی پورا نہیں ہوتا۔ سابودانے میں پانی بھی پڑتا ہے اور آپ ایسا کہتے ہیں۔''

'' تمھیں تو ڈاکٹر نے دہی کھانے کو کہا ہے؟''

'' مجھے تو ڈاکٹر نے سنکھیا کھانے کو کہا ہے۔''

'' سنکھیا کھا لینے سے تو خوب کھیل ختم ہو جائے گا۔'' آپ بولے۔

اس کے تین مہینے کے بعد چاچی کو کھانسی آنے لگی۔ کھانا خود بناتے۔ چاچی کہتیں۔ اپنی بیوی سے کیوں نہیں بنواتے؟ خود آخر کیوں بناتے ہو؟ ان کی بیماری کا یہی راز تھا۔ تین روز تک انھوں نے کھانا پکایا۔ چاچی نے نہیں کھایا۔ تیسرے روز جب وہ کھانا کھا کر لیٹے تو چاچی آ کر بولیں۔

'' بچوا کو تار دے دو۔ ہم کو گھر پہنچا دیں۔''

دھنو کو آؤں آ رہی تھی۔ آپ بولے'' کہاں جانا چاہتی ہو''؟

'' وہ آ کر مجھے لے بھی بھیج دے۔''

آپ بولے'' اس وقت دوا تک کے پیسے نہیں ہیں۔ آٹھ مہینے کے بچے کی یہ حالت۔ اس کی ماں سخت بیمار۔ اور وہ ابھی گیا۔ پچیسوں خرچ ہوئے۔ تم بنا سمجھے کیا کرتی ہو۔ ہاں جانا چاہو تو بنارس کا ایک لڑکا ہے' تمھیں گھر وہ بھیج دے گا۔''

'' ہاں میں جانا چاہتی ہوں۔''

'' جائیے' شوق سے کوئی بات نہیں۔''

شام کو وہ ٹرین سے دس روپے لے کر روانہ ہوئیں۔

میرے پتا نے مجھے بیمار جان کر فوراً بلایا۔ اس کے جواب میں آپ نے لکھا تھا'' میں خود لوا کر آ رہا ہوں۔ چھٹی ہونے پر۔''

جس دن ہمارے جانے کو بستر بندھا تو تار پہنچا چاچی کا کہ میں آ رہی ہوں۔ میری طبیعت یہاں نہیں لگتی۔ آپ نے جواب دیا'' ابھی مت آؤ میں الہ آباد جانے کو تیار ہوں۔

ہم الہ آباد آئے۔اس کے بعد میں دیہات چلی گئی۔آپ بھی پندرہ روز تک میرے پتا کے گھر رہے۔پھر آپ کانپور آئے۔میری دوا تو میرے میکے میں ہوتی رہی۔دھنو کو دودھ پلانے کے لیے ایک عورت رکھی گئی۔دھنو بھی صحت مند ہونے لگا۔میں نے بھی دست سے چھٹی پائی لیکن کھانسی زکام نے پلو پکڑا۔

کانپور سے آپ نے میرے پتا سے میری خبر پوچھی۔پتا نے لکھا ''دست تو بند ہو گئے لیکن کھانسی آ رہی ہے۔دھنو تگڑا ہو رہا ہے۔تم اس کی فکر چھوڑ دو۔

مگر وہ پھر لوٹ آئے۔پندرہ دن کے قریب پھر آپ رہے۔آپ کی دوا بھی وہاں بیچ بیچ میں ہوتی رہی۔اس کے بعد وہ کانپور چلے گئے۔

پندرہ دن اسکول کھلنے کو رہے تو آپ لوٹ کر آئے اور میری بدائی کے لیے کہا۔میرے پتا بولے ''اب ذرا سی اچھی ہوئی تو پھر بدائی کی سوجھی۔ابھی میری مرضی نہیں ہے۔''

پھر اس آدمی سے آپ بولے ''کہہ دو بس اتنا میرے ساتھ کیا کریں' میں بھی تو بیمار رہتا ہوں۔میں بھی تو ابھی کا ہوں۔میں اکیلا یہاں سے جاؤں گا تو مجھے تکلیف ہوگی۔ان کے میرے ساتھ رہنے سے میں بالکل بے فکر رہوں گا۔''

میرے پتا راضی ہو گئے۔میں جب یہاں آئی تو ان کا بی۔اے کا دوسرا برس تھا۔پھر وہ کورس کی تیاری کرنے لگے۔جب میں گورکھپور میں تھی تو میرے پاس گائے تھی۔وہ گائے ایک دن کلکٹر کے احاطے میں چلی گئی۔کلکٹر نے کہلا بھیجا کہ اپنی گائے لے جائیں نہیں تو میں گولی مار دوں گا۔آپ کو خبر بھی نہ ہونے پائی' ڈھائی تین سو کے لگ بھگ لڑکے نوکروں کے ساتھ پہنچے۔

جب میں نے بہت شور غل سنا اور دروازے پر دیکھتی ہوں کہ کوئی آدمی نہیں ہے تو میں آپ کے کمرے میں گئی۔میں نے کیا دیکھا۔۔۔۔آپ شانتی سے لکھ رہے تھے۔

''آپ تو یہاں بیٹھے ہیں' احاطے میں بھی کوئی بھی آدمی نہیں ہے۔''

''اچھا!''

جاڑے کے دن تھے۔ایک کرتا اور سلیپر پہنے آپ باہر نکلے۔کلکٹر کے بنگلے ہی کی طرف گئے۔وہاں جا کر پوچھا ''آخر تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو''؟

آدمیوں نے کہا ''صاحب کے احاطے میں گائے آ گئی ہے۔اس نے گولی مارنے کو کہا ہے۔''

''تم لوگوں کو کیسے خبر ہوئی؟''

''صاحب آدمی گیا تھا۔ وہی یہ سب کہہ رہا تھا۔''

''جب اردلی گیا تھا تو مجھ سے بتانا چاہیے تھا۔''

''آپ سے اس لیے نہیں کہا کہ ہم ہی کون کم تھے۔''

''مگر صاحب جب گولی مارنی تھی ہی تو مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی تو صاحب کی بات بالکل بچوں کی سی ہے۔ گائے کو گولی مارنا اور مجھے دکھا کر۔''

لڑکے بولے ''بغیر گائے لیے ہم نہیں جائیں گے۔''

آپ بولے ''اگر صاحب نے گولی ماردی؟''

لڑکے بولے ''گولی ماردینا آسان نہیں ہے۔ یہاں خون کی ندی بہہ جائے گی۔ ایک مسلمان گولی ماردیتا ہے تو خون کی ندیاں بہتی ہیں۔''

''فوج والے تو روز گائے بچھڑے مار مار کر کھاتے ہیں۔ تب تم لوگ کہاں سوتے رہتے ہو؟ یہ تو غلطی ہے کہ مسلمانوں کی ایک قربانی پر سینکڑوں ہندو۔ مسلمان مرتے مارتے ہیں۔ گائے تمھارے لیے جتنی ضروری ہے مسلمانوں کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ چلو۔ ابھی تمھاری گائے لے کر آتا ہوں۔''

صاحب کے پاس جاکر آپ بولے ''آپ نے مجھے کیوں یاد کیا؟''

''تمھاری گائے میرے احاطے میں آئی۔ میں اسے گولی ماردیتا۔ ہم انگریز ہیں۔''

''صاحب آپ کو گولی مارنا تھی تو مجھے کیوں بلایا؟ آپ جو چاہے سو کرتے۔ یا آپ میرے کھڑے رہتے گولی مارتے؟''

''ہاں ہم انگریز ہیں' کلکٹر ہیں؟ سب کچھ ہیں۔ پر پبلک بھی تو کوئی چیز ہے۔''

''میں آج چھوڑ دیتا ہوں۔ آئندہ آئی تو ہم گولی مار دے گا۔''

''آپ گولی مار دیجیے گا۔ ٹھیک ہے' پر مجھے نہ یاد کیجیے گا' یہ کہتے ہوئے آپ باہر چلے آئے۔

گورکھپور— ہولی

گورکھپور میں جب اسکول ماسٹر تھے' تب کی بات ہے۔ ہولی کے دو روز پہلے ہی سے ان میں خوشی کا

جوش ہوتا تھا۔ ہولی کے ایک دن پہلے ہی سے وہ خود ابیر' رنگ' مٹھائی' بھنگ وغیرہ خرید لاتے۔ ہولی کے دن سب لڑکے آتے اور وہ سب سامان لڑکوں کے سامنے رکھ دیتے۔ وہ لوگ کھاتے پیتے۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہوتے۔ کھانے پینے کے بعد بھنگ بھی پلاتے۔ پھر گانا بجانا بڑی دھوم سے ہوتا۔ ہر تیوہار میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ گانا آپ خود گاتے تھے۔ کبھی کبھی ہم دونوں ساتھ ساتھ گاتے۔ مجھے ان ہی سے گانا سننا پڑتا۔

کلکتے میں پریس لینے کا ارادہ

ان دنوں ان کے بھائی کلکتے میں نوکر تھے۔ وہاں انھوں نے ایک پریس لینا چاہا۔ پریس ایک مارواڑی کے ساجھے میں لینا تھا۔ انھوں نے لکھا ''نو ہزار میں ہم لوگ خرید رہے ہیں۔ آپ ساڑھے چار ہزار دیجیے۔

جو کچھ میں نے بچا کر رکھا تھا اسے اور پرومسری نوٹ (وعدے کا رقعہ) بھنا کر انھیں دینے کے لیے تین ہزار اکٹھا کیے۔ ڈیڑھ ہزار انھوں نے اپنے چچیرے بھائی سے بھی مانگے تھے۔ انھوں نے اندور سے ایک ہزار بھیج دیے اور پانچ سو بعد میں بھیجنے کا وعدہ کیا۔

ایک روز میں نے پوچھا'' روپے دینے کا ڈھنگ کیسا ہے؟ پریس کن شرطوں پر ٹھیک ہوگا؟ بولے ''شرط کیا' ارے پریس رکھے گا' جو کچھ منافع ہوگا' تمھیں بھی دے گا۔''

میں نے کہا'' ان شرطوں پر روپیہ دینا ٹھیک نہیں۔ ہاں' دھنو کے نام خریدا جائے' وہ کام کرنے والے ہیں۔''

''نہیں'' وہ جھلا اٹھے۔

''پھر یہ روپے آپ کے نہیں' آپ اپنے روپے دیجیے' روپے میری ہی شرط پر جائیں گے۔''

''خیر' میں لکھ دوں گا کہ دھنو کی ماں اس شرط پر روپے دینا چاہتی ہے''۔

اس خط کا چوتھے روز جواب آیا کہ میری یہاں بڑی ہنسی اڑ رہی ہے۔ کیا آپ ہمارے اوپر بھروسہ نہیں کرتے؟ میرا ہی اور کون ہے' دھنو ہی تو میرے بھی ہیں۔ میرے لیے بڑے افسوس کی بات ہے۔

خط آنے پر اسے انھوں نے مجھے سنا دیا اور بولے'' بڑی گڑبڑ ہوئی۔''

میں بولی'' کوئی گڑبڑ نہیں۔ میری رائے ٹھیک ہے۔ میں کسی کے ہاتھ میں نہیں ہونا چاہتی۔ کوئی کام

ہوا پنی جگہ ہونا چاہیے۔ میں بہتوں کو دیکھ چکی ہوں۔ آپ آنکھیں بند کر کے دیکھتے ہیں۔ میں آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں۔''

''اچھا بولو اس کا جواب کیا لکھوں؟''

''میری طرف سے لکھو کہ جب تک کوئی لڑکا میرے پاس نہ تھا تب تک تم ہی سب کچھ تھے۔ یہ لڑکا تمھارا بھی ہے تو اس کا نام رہنا کیا بُرا ہے۔ یہاں خود آ جاؤ' سب باتیں صاف صاف ہو جائیں۔ پھر سب تمھارے ہی ہاتھ میں تو ہوگا۔ اس کا تو محض نام رہے گا۔''

اس پر وہ جھلاتے ہوئے چوتھے دن آئے۔ کہنے لگے' لوگوں نے میرا بہت مذاق اڑایا۔''

میں نے کہا'' مذاق اڑانے والے بے وقوف ہیں۔ انھیں سمجھ ہونی چاہیے۔ پھر یہ تو بیٹے ہیں۔ جینوں کے یہاں تو باپ بیٹوں میں لکھا پڑھی ہوتی ہے۔ اس میں برا لگنے کی کوئی بات نہیں تھی۔''

اس پر وہ بولے'' میں ان شرطوں پر روپیہ لینے سے معذور ہوں۔''

''میں بھی مجبور ہوں'' میں نے جواب دیا'' بھائی صاحب کے بھی روپے بھیج دیجیے۔

''بھیج دیے جائیں گے۔''

''نہیں ابھی بھیج دیجیے' رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کوئی اور کام تو ہے نہیں۔''

اس کے بعد وہ چلے گئے۔

گورکھپور: تدریسی کام

ان دنوں مہنگائی کا دور تھا۔ جن دنوں انھوں نے نوکری چھوڑی ان دنوں سب ملا جلا کر میرے پاس تین ہزار روپے تھے۔ نوکری چھوڑنے کے پہلے کئی رات ان کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ خیر دو تین دن کے بعد جب نوکری چھوڑنے کا خیال مجھ پر ظاہر کیا کہ میری خواہش نوکری چھوڑنے کی ہے اس میں تمھاری کیا رائے ہے؟ تو میں نے جواب دیا۔

''اس موضوع پر غور کرنے کے لیے دو تین دن کا وقت چاہیے۔''

''میں تو خود ہی چاہتا ہوں کہ پہلے تم اپنی کوئی رائے قائم کر لو۔''

جو الجھن ان کو تھی وہی دو تین دن مجھے بھی رہی۔ مجھے بھی بار بار یہی خیال آتا کہ آخر انھیں بی۔ اے

کی خواہش کیوں ہوئی ۔ یہی نا کہ آگے ترقی کی امید ۔ پہلے تو یہ خیال تھا کہ یہ کبھی پروفیسر ہو جائیں گے اور زندگی کے دن آرام سے کٹیں گے ۔ کیونکہ صحت اچھی نہ تھی اور کہاں یہ خیال کہ جو کچھ بھی مل رہا ہے اسے بھی چھوڑ کر ہوا پر گزارا کیا جائے ۔ اس وقت ان کو کل ملا کر ۱۷۵/ روپے کے قریب ملتے تھے ۔ اسکول کی نوکری ہونے کی وجہ سے گھر پر بھی کام کرنے کا وقت مل جاتا تھا ۔ مجھے بھی اس بات کی الجھن تھی کہ آخر نوکری چھوڑ کر کریں گے کیا ۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا سامنے تھے ۔ اور ابھی بچے ہونے کی امید تھی ۔ نوکری چھوڑنے کے بعد سنہ ۲۱ میں بنو پیدا ہوا ۔ ادھر میری یہ خواہش بھی نہیں تھی کہ کسی کی پیر کی بیڑی بن کر رہوں اور آگے بڑھنے سے روکوں ۔ یہ نہیں تھا کہ روپوں کی قیمت میری آنکھوں میں کم تھی ۔ آپ تو اپنی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے' خود بھی بہت دنوں کے بیمار' نہ گھر نہ دوار' ان سب باتوں کو سوچ کر یہی دل میں آتا تھا کہ ان کو نوکری چھوڑنے سے روک لوں ۔ اس کے لیے تھے دو روز لیکن چار پانچ دن میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ۔

چار پانچ دن کے بعد انھوں نے پھر پوچھا کہ بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا ۔ میں بولی ''ایک دن کی مہلت اور'' اس دن میں نے یہ سوچا کہ آخر جب یہ اتنے بیمار تھے اور بچنے کی کوئی امید نہیں تھی ۔ ایک طرح سے شاید انھوں نے مجھے جواب ہی دے دیا تھا یہ کہہ کر کہ یہ ۳۰۰۰ ہزار روپے ہیں اور تین تم ہو ۔ اب یہ اچھے ہو گئے ہیں تو نوکری کی کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے ۔ ایشور کچھ اچھا ہی کرنے والا ہوگا ۔ تب ہی تو یہ اچھے ہو گئے ہیں ۔ مان لو جب یہی نہ رہتے تو میں کیا کرتی' شاید اسی کام کے لیے ایشور نے انھیں اچھا کیا ہے ۔ پھر ان دنوں جلیان والے باغ میں جو بھیانک قتل عام ہوا تھا اس کی آگ سب ہی کے دل میں اٹھنی قدرتی بات تھی ۔ شاید میرے دل میں بھی جل رہی ہو ۔ دوسرے دن اپنے کو ان سب ہی مصیبتوں کو سہنے کے لیے تیار کر پائی جو نوکری چھوڑنے پر آنے والی تھیں ۔ دوسرے دن میں نے ان سے کہا ''چھوڑ دیجیے نوکری کو' ۳۵ برس کی نوکری چھوڑتے ہوئے تکلیف تو ہوئی ہی تھی ۔ مگر نہیں یہ جو ملک پر ظلم ہو رہے تھے ان کو دیکھتے ہوئے تو شاید یہ تکلیف نہیں کے برابر تھی ۔ جب میں نے ان سے کہا کہ چھوڑ دیجیے نوکری' کیونکہ ان ناانصافیوں کو تو اب سب کو مل کر مٹانا ہوگا اور حکومت کا یہ اخلاقی رویہ (پولیسی) تو اب سہے جانے کی طاقت سے باہر ہے ۔ تب آپ اپنی فطری ہنسی میں ہنس کر بولے ''دوسروں کا خاتمہ کرنے سے پہلے اپنا خاتمہ سوچ لو'' ۔

میں بولی ''میں نے سوچ لیا ہے' جب تم اچھے ہو گئے ہو تو میں سوچتی ہوں کہ اب آگے بھی میں جنگل میں منگل کر سکوں گی اور میرا خیال ہے کہ ایشور کچھ اچھا ہی کرنے والا ہے'' ۔

آپ بولے ''سوچ لو' پھر نہ کہنا کہ چھوڑ کر خود تکلیف اٹھائی اور مجھے تکلیف دی کیونکہ سر پر تکلیفیں آگے بہت آنے والی ہیں ۔ ممکن ہے کہ کھانے کو کھانا بھی نہ ملے'' ۔

میں بولی ''میں اس کے لیے سوچ چکی ہوں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ سر پر جب بلا آتی ہے تب ہر کوئی بھگت لیتا ہے۔ پھر بھگتے تو ہیں بڑے بڑے گھروں کے لوگ اپنی تو بساط ہی کیا ہے۔''

بولے ''یہی فیصلہ ہے؟''

میں بولی۔ ''ہاں''

''تو میں کل ہی استعفیٰ دیتا ہوں اور کل ہی یہ سرکاری مکان بھی آپ کو چھوڑنا ہوگا۔ جانا کہاں ہے' اس کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں'' انھوں نے کہا۔

میں بولی۔ ''گاؤں چلنا''

وہ بولے'' گاؤں میں تمھارے رہنے کے لیے مکان کہاں ہے کیونکہ جو پرانا گھر ہے اس میں چاچی وغیرہ گزر بسر کر رہی ہوں گی۔ اس میں تمھارے لیے جگہ کہاں؟''

میں نے پوچھا ''تو گھر ان کا ہے؟''

''جہاں زمین پاؤ گی وہیں تو رہو گی کہ دوسرے کے مکان میں چلی جاؤ گی؟''

میں نے کہا ''مکان میں جو جگہ ہے آدھی وہ لیں گے آدھی ہمیں دیں گے۔''

''اس میں جگہ ہی کتنی ہے؟''

میں نے غصے سے کہا'' جتنی بھی ہے۔ ہم ہی کیوں چھوڑ کر چلے جائیں۔ وہ ہی کیوں نہ جائیں۔ جب انھوں نے ہمارے آرام تکلیف کا کوئی ٹھیکہ نہیں لیا تو ہم ہی کیوں لیں''۔

''تو تم اس پر یہ کہہ سکتی ہو کہ جب سرکاری نوکریاں اور نہیں چھوڑ رہے ہیں تو میں ہی کیوں چھوڑوں؟''

''یہ ایک طرف داری کا کام نہیں ہے' یہ تو دیش بھر کی بات ہے'' میں بولی ''پھر اس میں تیاگ' تپسیا اور قربانی ہے' یہ اپنی مرضی سے انسان کر سکتا ہے۔''

آپ ہنس کر بولے'' جس کو تم تیاگ' تپسیا اور قربانی سمجھتی ہو وہ ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ یہ تو ہم تم دونوں کا اپنے گناہوں کا محض تھوڑا سا کفارہ ہے۔''

میں بولی ''تو ہم لوگوں نے پاپ کیا کیے ہیں؟''

وہ بولے'' تو تم نے نہیں کیے تو تمھارے بزرگوں نے کیے کیونکہ آرام کے نشے میں تو وہی لوگ ڈوبے تھے۔ اپنی عیاشی کے نشے میں اندھے پڑے تھے۔ تب ہی ملک میں پھوٹ بھی پیدا ہوئی

اور دونوں فریقوں کو ہٹا کر تیسرا فاتح ہوا۔ ممکن ہے کہ اس عیاشی میں ڈوبنے والے ہم ہی تم ہوں اور پھر سے جنم ملا ہو۔ یہ جو کھم پہلے جو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ یہ جو آج کل تمھارے اوپر حکومت کر رہے ہیں کیا یہ فاتح ہوئے تھے۔ ان کے بڑے فاتح ہوئے تھے۔

میں نے کہا ''فاتح کبھی غرور سے اندھا بھی ہو سکتا ہے؟''

وہ بولے ''اس جگہ تم غلطی پر ہو۔ فاتح ہمیشہ غرور سے اندھا رہتا ہے۔ اگر فاتح غرور سے اندھا نہ ہو تو اسے انسان نہیں کہنا چاہیے۔ دیوتا کہنا چاہیے۔ اگر دیوتا نہیں ہے تو یہ کہتا ہوں کہ تمھارے بھائی بند کیا کم اندھے ہیں جو کہ فاتح بھی نہیں ہیں۔ یہاں جو ہندوستانی حاکم آتا ہے وہ انگریزوں کی نسبت کہیں کڑی حکومت کرتا ہے اور اسی کو دیکھ دیکھ کر ہمارے دیش کے نوجوانوں کی حالت بھی اسی طرح کی ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے اس موقع پر رحیم کا دوہا بہت مناسب معلوم ہو رہا ہے' پیارے سے پتھر جی بھیو نبھر دبھر و جائے'' میں تو کہتا ہوں کہ بہت دن لگ جائیں گے ہندوستانیوں کو اپنی ذہنی حالت بدلنے میں۔ کیونکہ ادھر وہ کوئی ۵۰۰ برس سے غلامی میں رہ چکے ہیں' تم کیا سمجھتی ہو کہ ان کی روح دس بیس سال میں سدھر جائے گی۔ سوراجیہ ملنے پر بھی میں کہتا ہوں کہ اس میں کافی دن لگیں گے۔''

''پھر گھر چلنا ہی ہوگا'' میں نے کہا'' آخر چلیں گے کہاں؟''

آپ بولے ''میرا تو خیال ہے یہیں (گورکھپور میں) کچھ کام کر لوں۔'' کچھ نہیں تو کوئی پچاس ساٹھ روپے تو کوئی دے ہی دے گا یہیں دس پانچ روپے کا مکان لے کر پڑے رہیں۔ میری رائے ہے کہ ایک چرخہ سوسائٹی کھولیں اس کے لیے پوت دار تیار بھی ہیں۔''

''جب سرکاری نوکری چھوڑ دی' تب یہاں رہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور آب و ہوا بھی یہاں کی تمھیں موافق نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب یہاں کیوں رہا جائے۔ ابھی تک تو سرکاری نوکری کی لالچ تھی۔''

بولے ''یہاں تو کچھ کام بھی ہوگا بھائی' اور بنارس چل کر بیٹھنے سے کیا ہوگا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ یہاں اور کچھ نہیں ہے تو پوت دار میرا مددگار ہے ہی۔ بنارس میں تمھارا کون مددگار بیٹھا ہے؟''

میں نے کہا ''اور کچھ نہیں تو گھر کے لوگ تو ہیں ہی۔''

اس پر وہ بولے ''جن کو تم اب تک اپنا سمجھتی تھیں وہ اپنے لیے تھے' تمھارے لیے نہیں۔ جب تمھارے پاس پیسہ نہیں ہے تو تمھارا کوئی ساتھ کیوں دینے لگا۔ تمھیں معلوم ہے کہ ابھی اپنی

بیماری میں میں چاچی کو روکنا چاہتا تھا کہ وہ رہیں مگر وہ رہیں؟ ان کا لڑکا نوکر ہے ہی' اس کی شادی بھی ہوگئی ہے۔ اب ان کو کیا پڑی ہے جو میرا ساتھ دیں۔ اب تو یہی سمجھیں گے کہ شاید مجھ سے کچھ مدد چاہتے ہیں۔ جب سے وہ میری اس حالت پر مجھے چھوڑ کر گئے ایک بار بھی کم سے کم دیکھنے کو آئے۔ دو بار تمھارے بھائی مجھے بلانے بھی آئے اور دوا کرانے کے لیے بھی۔''

میں بولی'' کون تم ہی ان کے پاس دوا کرنے کو گئے۔''

'' خیر میں جاؤں یا نہ جاؤں ان کا فرض تو پورا ہوگیا۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اب وہ میرا بھلا چاہنے والے ہیں اور جن کو میں اپنا سمجھتا تھا اب وہ نہیں رہ گئے۔ اس لیے وہاں جانے میں تم کو کیا آنند ملے گا' میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

'' آخر گھر تو چلنا ہی ہے'' میں بولی'' میں آپ ان کی روٹیوں پر گزر کرنے والی ہوں۔ اگر مجھ میں تکلیف سہنے کی طاقت نہ ہوتی تو میں کیوں استعفیٰ دینے کے لیے آپ کو تیار کرتی۔ میں اپنے گھر تو جا ہی سکتی ہوں یا اب ان کے لیے پورا بنارس چھوڑ دیا جائے گا۔''

'' تو وہاں جانے سے فائدہ ہی کیا؟ آپس میں نفرت ہی بڑھے گی'' وہ بولے۔

'' میں اس نفرت سے ڈرتی کب ہوں اور اس طرح سے ڈر کر گرہستی میں کوئی نہیں رہ سکتا یہ تو ایک سنیاسی ہی کر سکتا ہے۔ گھر بار والا نہیں۔''

'' اچھا صاحب جیسی تمھاری مرضی ہو۔''

'' ہاں میری مرضی تو یہی ہے۔ میں نے جیون میں کبھی ڈرنا نہیں سیکھا؟'' میں نے کہا'' اپنے سے میں کسی کو چھیڑوں گی نہیں مگر جو کوئی مجھ کو چھیڑے گا اس سے ڈر کر کہیں بھاگوں گی بھی نہیں۔''

نوکری چھوڑنے کے دو مہینے بعد ہم گھر آئے۔ اور اس کے بعد کا حال میں پہلے ہی سنا چکی ہوں۔''

استعفیٰ

سنہ بیس کی بات ہے۔ ترک موالات کا زمانہ تھا۔ گاندھی جی گورکھپور آئے۔ آپ بیمار تھے پھر بھی میں' دونوں لڑکے' بابو جی میٹنگ میں گئے۔ مہاتما جی کی تقریر سن کر ہم دونوں بہت متاثر ہوئے۔ ہاں بیماری کی حالت تھی' بے بسی تھی۔ مگر تب ہی سے سرکاری نوکری کے خلاف ایک طرح کی اداسی پیدا ہوئی۔ اس کے دو سال پہلے ہی آپ بی اے پاس کر چکے تھے۔ ایم اے کرنے کی تیاری میں لگ گئے تھے۔ فیس بھی داخل کر چکے تھے۔ بیمار تو تھے ہی' دوا دارو کسی کی کرتے نہیں تھے۔ بیماری کی

حالت میں وہ مجھے اپنے پاس سے ہٹنے نہ دیتے تھے۔ دوا بھی نہیں کرتے تھے۔

ایک دن جھلا کر میں بولی ''اس کا فیصلہ آج ضرور کرنا ہوگا کہ دوا کیجیے گا یا نہیں''۔

آپ بولے ''دوا سے کچھ نہ ہوگا۔''

میں نے دوبارہ کہا ''محض اس کا جواب دیجیے کہ دوا کرائیے گا یا نہیں؟''

''بھائی، دوا کرنے سے کیا ہوگا، نتیجہ تو اس کا الٹا ہی ہوگا۔''

''پھر آپ وہی کہتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے آخری فیصلہ بتائیے۔''

''آخر کروگی کیا؟''

میں نے کہا '' یہ کروں گی کہ ایک آنے کی سنکھیا منگا کر کھا کر سو جاؤں گی۔ نہ رہوں گی نہ تکالیف دیکھوں گی۔ ابھی دو ہی مہینے ہوئے میرا ایک لڑکا مرگیا' اب آپ بیمار پڑے ہیں۔ گھر گرہستی کروں، دونوں بچوں کو دیکھوں آپ کی بیماری کی یہ حالت۔ اب مجھ میں زیادہ طاقت نہیں۔''

بولے ''اچھا دوا کروں گا۔ نہیں مانتی ہو اسی وجہ سے۔ مگر دوا سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہاں تم کہہ رہی ہو تو کروں گا ہی۔''

میں نے کہا ''دوا کرنا ہمارا کام ہے۔ فائدہ، نقصان ہونا ایشور کے ہاتھ ہے۔ کب سے کیجیے گا' کل سے نا؟''

''ہاں کل ہی سے کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، کل ہی سے شروع کردیجیے۔ کل ہوتے دیر نہیں لگتی۔''

میرے یہ کہنے پر انھیں قدرتی ہنسی آگئی۔ میں نے کہا ''ہنسنے سے کام نہیں چلے گا۔ جو کہہ رہی ہوں کرنا پڑے گا۔''

''نہیں، دیکھ لینا کل سے ضرور کروں گا۔ دوا نہیں کروں گا تو رہوں گا کہاں۔''

''ہاں، ٹھیک صبح''۔

صبح ہاتھ منھ دھو کر دھیرے دھیرے وید کے یہاں گئے۔ وہاں سے دوا اور بیل کے پتے لائے۔

میں نے تیار کر کے دوا ان کے سامنے رکھی۔

آٹھ دن گھڑوں پانی پاخانے کے راستے سے نکلا۔

دن بھر جب کافی دست آئے تو میں بولی "اب آپ فوراً وید کے یہاں جائیے۔"

وید نے کہا "ٹھیک ہے۔ پیٹ کا سارا پانی نکل رہا ہے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟ ایک بھسم (راکھ) میں اور دے رہا ہوں' اس سے آپ کے بدن میں گرمی بھی رہے گی۔ کمزوری بھی نہ رہے گی"

پانی آٹھ دن تک پیٹ سے نکلتا رہا۔ پھر دوبارہ اس نے دوا دی۔ ابلی ہوئی ترکاری' بنا چھنا ہوا ہاتھ کا پسا آٹا کھانے کو بتایا۔ خیر اس طرح میں نے انھیں اچھا کیا۔

ایک دن کی بات ہے' مجھ سے بولے "تم رائے دیتیں تو میں سرکاری نوکری چھوڑ دیتا۔"

میں نے کہا "کیا ہی اچھا ہو۔"

"خرچ کیسے چلے گا؟"

"کم میں بھی خرچ چل جاتا ہے' زیادہ میں بھی چلتا ہے۔ یہ تو اپنی اپنی ضرورتیں ہیں۔ اس کے لیے انسان کب تک بندھا رہے گا۔ میں تو اسی پر خوش ہوں کہ آپ صحت یاب ہوئے۔"

بولے "آج ہی استعفیٰ دینے جا رہا ہوں۔ کئی آدمیوں نے مجھ سے پہلے بھی کہا تھا' مگر میں سوچتا تھا شاید تمھیں تکلیف ہو۔"

"اس سے بھلا کیسی تکلیف ہوتی" میں نے کہا "اس میں مجھے سکھ معلوم ہو رہا ہے۔"

اسی دن استعفیٰ لکھ کر ہیڈ ماسٹر کو دیا۔ ہیڈ ماسٹر دیکھ کر گھبرا گیا اور بولا "آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ۱۵۲ روپے پا رہے ہیں اور بیماری سے اٹھے اور یہ سنک" انھوں نے مذاق میں کہا "پہلے اپنی دیوی جی سے پوچھ آیئے۔"

"میری دیوی جی نے مجھ سے خود کہا ہے۔ وہ مجھ سے بھی آگے ہیں۔ ان کی تو اور رائے ہے"۔

ہیڈ ماسٹر نے کہا "نہیں میں آج اسے نہیں بھیج سکتا۔"

آپ بولے "میں کل سے کام پر نہیں آؤں گا"۔

اسی طرح آٹھ دن بیتے۔ استعفیٰ وہیں پڑا رہا۔ نویں روز خود ہیڈ ماسٹر گھر پر آئے اور بولے "یہ کیا تمھیں سوجھتا ہے۔ میں نے تو استعفیٰ نہیں بھیجا۔ ابھی تو آپ بیماری سے اٹھے ہیں اور اتنی جلدی استعفیٰ دے دیا۔ میں تو ایسا نہیں چاہتا۔"

"میری آتما نہیں چاہ رہی ہے' ہیڈ ماسٹر صاحب میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔

اسی کے ایک سال پہلے انھیں اسکول کے بورڈنگ کا سپری ننٹنڈنٹ بھی ہونا پڑا تھا۔۱۲۵اس کے الگ سے ملتے تھے۔ بورڈنگ کے چھ مہینے کے پیسے انھیں پہلے ہی مل چکے تھے۔ بہن اس سے ہمارے پاس ہی تھی۔اس کے پاس روپے رکھ کر بولے ''تمھارے روپے ہیں۔تمھارے آنے پر تو ملے۔ایشور بھی کیا ہے،جب خرچ دیکھتا ہے تو آمدنی بھی بڑھا دیتا ہے۔''

بہن بولیں ''ایشور انصاف کرنے والا تو ہی ہے۔وہ سب ہی کی خبر رکھتا ہے۔''

''بھائی یہی تو میں خود کہتا ہوں۔ لو خرچ کرو۔''

بہن ان کے ہاتھ سے روپے لے کر گھر کے روپیوں میں رکھ آئی۔

میں نے صندوق کھولا تو وہ روپے بھی ان میں تھے۔

میں نے کہا'' کیوں یہ روپے تو آپ کو ملے تھے۔میرے صندوق میں کیسے پہنچ گئے؟''

''میں اور وہ کیا دو ہیں؟''

میں نے کہا'' یہ تو بڑی اچھی بات ہے،روپے میرے صندوق میں پڑے رہیں۔''

وہ بولیں ''رکھے رہیں تب نا؟ دیکھتی ہوں روزانہ خرچ ہو جاتے ہیں۔''

وہ اپنی بہن سے برابر گپ شپ کرتے رہتے تھے۔وہ آٹھ مہینے ہمارے یہاں رہیں۔

وہ ہمارے سکھ کے دن تھے۔

۱۹۲۰ء کی فروری

گورکھپور کی نوکری چھوڑنے کے بعد آپ مہاویر پرساد پوتدار کی مستقل رہائش گاہ مانی رام گئے وہاں سے ایک چٹھی میں چاچی کے پتا کو نوکری کے چھوڑنے کا سارا قصہ سنایا۔ان کے نانا نے لکھا 'نوکری چھوڑ کر برا کیا' خیر تمھاری مرضی۔اپنے بال بچوں کو میرے پاس چھوڑ جاؤ اور اپنے لیے کوئی کام ڈھونڈو۔ابھی سے کام چھوڑنے کے بعد کیا کرو گے۔

آپ اس چٹھی کو لیے میرے پاس آئے۔ہنس کر بولے ''پرانے خرانٹ سمجھتے ہیں کہ ساری لیاقت بس (ہم ہی) نے پائی ہے۔لکھتے ہیں بال بچوں کو میرے پاس پہنچا کر اپنے لیے کام ڈھونڈو۔'' ان کا خط پڑھ کر مجھے بھی برا لگا۔میں بولی ''اتنے سارے بچے ہیں بھی تو۔دانے دانے کو مرنہ جائیں گے۔

''آپ بولے''نوکری چھوڑتے ہوئے سب میں نے سمجھ لیا ہے۔ پھر یہ لوگ مجھے سبق سکھاتے ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی بے کاری ہی میں بتادی۔''

میں بولی''اب یہ علاقے دار ہوئے ہیں' تمھاری پرورش کے لیے تڑپ رہے ہیں۔''

''اگر وہ اپنی پرورش کرلیں تو سمجھو میری پرورش ہوئی۔ میں پندرھویں سال سے ہی بوجھ اٹھانے کا عادی ہو گیا ہوں اب تو ایشور کی دیا سے اپنا ہی بوجھ ہے اس وقت کی سمجھو جب تین تین خاندانوں کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ اس وقت یہ اپنا بوجھ تک نہ اٹھا سکے۔''

میں بولی''ضرور اٹھائیں گے جب کہہ رہے ہیں۔''

آپ بولے''شاید وہ گھبرا رہے ہیں کہ میں کہیں ان کے ناتی پر اپنا بوجھ نہ ڈال دوں۔''

''ان کا یہ سوچنا غلط تھوڑے ہی ہے۔''

''تم بھی کیا بچوں کی سی باتیں کررہی ہو۔ جو آدمی دوسروں کا بوجھ اٹھا سکتا ہے وہ اپنے بال بچوں کا بوجھ کسی دوسرے کے سر نہیں ڈال سکتا۔ خدانخواستہ اگر ایسی نوبت آجائے تو اسے چاہیے کہ اپنے بچوں کو زہر دے کر مار ڈالے۔''

میں بولی''وہ جیسے گھبرا اٹھے ہیں۔''

آپ بولے''وہ لوگ زندگی بھر بے حیائی سہتے رہے ہیں۔ ان کے اندر خودداری کبھی تھی ہی نہیں۔ پھر میں نے نوکری چھوڑی ہے اپنے قلم کے بل پر۔ میں نے کسی کے آسرے کام کیا ہی نہیں' میں ہمیشہ اپنے بازوؤں پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ جن لوگوں کو میں سمجھ چکا ہوں ان سے تو خیر کیا اور امید کروں گا۔''

''لیکن خرچ ہی کیا ہے؟ میں نے کہا۔

''تم ان کے یہاں رہ سکتی ہو''؟

''میں جب انھیں اپنے یہاں رکھ چکی ہوں تو انھیں مجھ کو اپنے یہاں رکھنے میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

آپ بولے''تم سراسر جھوٹ بول رہی ہو۔ کیا وہاں تم سچ مچ رہ سکتی ہو؟''

میں بولی'' آپ بھی کیا کہتے ہیں۔ مجھے اوروں کے یہاں ہی رہنا پڑتا تو میں نوکری ہی کیوں چھڑواتی۔''

''وہی تو میں بھی کہتا ہوں۔''

''میں نے یوں ہی کہا تھا۔'' میں بولی۔

آپ بولے'' یہ لوگ بڑے چھوٹے خیالوں کے ہیں۔ یہ ہمیشہ کسی نہ کسی کے سر کا بوجھ بن کر رہے ہیں۔''

مہاویر پرساد پوت دار

استعفیٰ دینے کے بعد مہاویر پرساد پوت دار اپنے گاؤں میں لوانے گئے۔ اپنی بیوی کو بھی لوا گئے جس سے طبیعت گھبرائے نہ۔ ایسا لگتا تھا کہ پوت دار جی اور ہم سب ایک ہی ہیں۔ پوت دار جی نے ہماری کافی سیوا کی۔ ان ہی کی سیوا کی وجہ سے وہ جلدی تندرست ہوئے۔ ۱۳ میل شہر روزانہ پوت دار جی جاتے تھے۔ بابو جی دروازے پر بیٹھے بیٹھے چرخے بنواتے اور لکھتے پڑھتے۔

دو مہینے رہنے کے بعد طے ہوا کہ پوت دار جی کے ساجھے میں شہر میں چرخے کی دکان کھولی جائے۔ اور ایک مکان وہاں لیا گیا۔ اسی جگہ دس کرگھے لگائے گئے۔ چرخا چلانے والی کچھ عورتیں بھی تھیں۔ دیہات سے بن کر چرخے آتے تھے۔ وہ بیچے بھی جاتے تھے۔ شام کے وقت پوت دار جی اور بابو جی اور اسی طرح اور کچھ دوست لوگ بیٹھ کر گپ شپ کرتے۔

ایک دن کی بات ہے۔ رات کو کھانا کھا کر آپ جیسے اٹھے ویسے ہی لال بادل ہوئے۔ مجھ سے بولے'' تم لوگ بھی جلدی کھالو۔ معلوم ہوتا ہے آندھی جلدی آئے گی۔ جیسے ہی تھالی پروس کر رکھی ویسے ہی آندھی پانی دونوں آ گئے۔ میں بھاگ کر بچوں کے کمرے میں پہنچی۔ آپ بھی وہاں پہنچے۔ اسی وقت (اولے) پتھر گرنا شروع ہوئے۔ پتھر پڑتے وقت میں برانڈے میں گئی اور ان کی میز پر جو کاغذ لکھے ہوئے پڑے تھے انھیں سمیٹ کر ان کی چارپائی پر پٹک دیے۔ تب تک پتھر کھپڑا (کھپریل) توڑ کر اندر بھی آنے لگے۔ آپ گھبرا کر بولے'' دیکھو رانی بچوں کے سر چھوٹے'' ہم جلدی میں بچوں کے اوپر ایک لحاف تان کر دونوں طرف کھڑے ہوگئے۔ بچوں کے بچنے کی امید تو تھی پر اپنے سر کیسے بچاتے۔ ہم دونوں کے سر پر پتھر لگے۔ وہ بولے'' اب اپنے سر کیسے بچائے جائیں گے۔''

میں نے بچوں کو ایک تخت کے نیچے ڈال دیا اور ان سے کہا'' آپ بھی جلدی اس کے نیچے چلے جائیے''۔

''تم بھی اسی کے نیچے آؤ۔''

''نوکر تو بھی چل بھیتر۔''

ہم پانچوں اس تخت کے نیچے پیٹ کے بل لیٹے پڑے تھے۔ اوڑھنے بچھونے سب بھیگ گئے۔ آپ بولے ''تمھیں موقع پر بات سوجھ جاتی ہے لیکن مجھے نہیں سوجھتی' کیا بات ہے؟ اگر آج تم نہ ہوتیں تو دو ایک کا سر ضرور پھوٹ گیا ہوتا۔''

''کہاں میں جاتی!''

بچوں کو سلا کر ہم باہر پتھر دیکھنے آئے۔ دیکھتے ہیں تو کمرے کے برابر پتھر لگا ہوا ہے۔ میز پر کاغذ نہ دیکھ کر بولے ''میرے کاغذ بھی اڑ پڑ گئے۔''

میں نے کہا ''نہیں چارپائی کے نیچے سب پڑے ہیں۔ میں نے انھیں رکھ دیا تھا۔''

''کیا تمھارے بدن میں بجلی ہے؟ دیکھتے دیکھتے سارا کام کر ڈالا۔''

میں نے کہا ''تم سے عمر میں بھی کم ہوں' جوان ہوں' کیوں نہ جلدی کر ڈالوں؟''

''ٹھیک ہے دو میں تو کوئی تو بھلا ایسا رہے۔''

''نہیں میں ایسا کرنے سے درگزری۔ دیکھنے والوں کو بھی بھدا لگے۔''

''تم خود اپنے لیے ہی ہوتیں تو بھدا لگتا۔ یہ سب تو میرے لیے کرتی ہو۔ تم ایسی نہ ہوتیں تو میں زندہ بھی نہ رہ سکتا۔

دھنو نے تحریر پھاڑ ڈالی

ایک بڑی بات دھنو چھوٹا تھا۔ آپ ایک مسودہ مکمل کر کے میز پر رکھ آئے تھے۔ دھنو نے جا کر اس مسودے کو پھاڑ ڈالا۔ قلم دوات لے کر دوسرے کاغذ پر وہ کچھ خود لکھنے لگا۔ جب آپ نے کمرے میں اندر جا کر یہ حرکت دیکھی تو غصے میں آ کر ایک چپت لگائی اور ڈانٹا ''بھاگو یہاں سے نہیں تو اور پٹائی کروں گا۔''

دھنو کی چیخ میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے ان کی بہن سے کہا ''جی جی ذرا دیکھیے تو' کیا دھنو پر مار پڑ رہی ہے۔'' وہ وہاں دوڑی ہوئی گئیں۔ بچے کو گود میں اٹھا کر بولیں ''کیوں بچے کو مار دیا؟''

''تم دیکھو تو۔ میرا مسودہ اس نے پھاڑ ڈالا۔ آج اسے میں بھیجنے والا تھا۔ دشٹ (بدمعاش) نے اسے پھاڑ ڈالا۔ اب کیا اپنا سر بھیجوں؟''

''بچہ ہی تو ہے۔ سمجھ کر تھوڑے ہی کیا۔ تم بھی کم شیطان نہ تھے۔''

''میں مسودے تھوڑے ہی پھاڑتا تھا۔''

''تب مسودے لکھتا ہی کون تھا؟ رامو کے کان تو تم ہی نے کاٹے تھے۔ وہ مسودہ کان سے بھی مہنگا تھا؟''

آپ چپ ہو گئے۔ بہن بڑبڑاتی ہوئی بولیں ''ناسمجھ بچے پر اتنی مار!'' جی جی اسے گود میں لے کر اندر آئیں اور بولیں ''انھیں غصہ بہت آنے لگا ہے۔

پھر میں ان سے بنارس آنے کو کہنے لگی۔ بولے ''وہاں جا کر کیا کرو گی؟''

''یہیں رہنے سے کیا ہوگا؟ وہاں پر بیٹھیے اور اپنا کام کیجیے۔

''میں کام تو یہاں بھی کرتا ہی ہوں۔''

میں نے کہا ''پھر بھی یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ وہاں کی آب و ہوا بھی آپ کو موافق رہے گی۔

''اچھا ہے دو تین روز میں چلا جائے۔''

اس کے بعد ہم لوگ لمہی آئے۔

لمہی، کانپور

لمہی (بنارس) آنے کے بعد وہ ۴۰ روپے ماہانہ پر دو مضمون یا دو کہانیاں باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ لکھتے تو اور جگہ کے لیے بھی تھے پر یہ مستقل تھا۔

صبح اٹھنا' بیت الخلا ضرور جانا' پھر ہاتھ منھ دھو کر کچھ ناشتہ کرنا۔ پھر اپنے روز کے کام پر لگ جانا۔ پھر بارہ بجے کام سے اٹھ کر نہانا اور کھانا۔ اس کے بعد ایک گھنٹے آرام کرتے پھر اسی تپتے ہوئے مکان کے نیچے دو بجے سے لکھنے پڑھنے میں لگ جاتے۔ پھر کچھ ناشتہ کر کے بچوں کو لیتے اور دروازے پر بیٹھ کر گاؤں والوں سے باتیں کرتے۔

ایک دن چرخہ بنوانے کے لیے ایک زمیندار صاحب کے پاس لکڑی مانگنے گئے۔ بولے ''مجھے آپ لکڑی دیجیے' میں ان کی بنوائی دوں اور چرخے دیہات میں بانٹے جائیں۔ جس سے غریب بھائیوں میں چرخے کی تشہیر بڑھے۔''

زمیندار کو یہ بات پسند آئی اور وہ لکڑی دینے پر راضی ہو گئے۔

گاؤں بھر کے آدمیوں کو اکٹھا کر کے اپنے ساتھ لکڑی لدوا لائے۔

ایک ماہ تک دو بڑھئی دروازے پر چرخے بناتے رہے۔ اس کے بعد سب لوگوں کو ایک ایک چرخہ مفت بانٹا گیا۔ چرخے کے لیے اٹیئن (بانٹا) کس طرح کی ہو۔ کس طرح وہ چلائے جائیں۔ کیسا سوت ہو ان سب باتوں کی جانکاری وہ لوگوں کو کرانے لگے۔ اسی طرح دو مہینے بیتے۔

ایک دن کی بات ہے۔ وہ جب کھانا کھانے بیٹھے تھے تو میں اسی وقت اپنے ہاتھوں میں انھیں گرم گرم روٹیاں پکا کر دیتی تھی۔ جب آپ کھانا کھانے بیٹھے تو گھی ندارد۔ مجھ سے پوچھا ''کیا دال میں گھی نہیں پڑا ہے؟''

میں نے کہا ''گھر میں ہو تب نا۔''

اس وقت انھوں نے اپنی چاچی کو بلایا اور پوچھا ''گھی کیوں نہیں رہا؟''

چاچی بولیں ''ایک دن بنا گھی کے نہیں کھا سکتے؟''

''کبھی گھی، کبھی ترکاری، کبھی دال اس طرح تو ایک نہ ایک چلتا ہی رہے گا۔ آخر بے کیوں نہیں؟''

''نہیں رہا۔''

اسی وقت جھلا کر تھالی پر سے اٹھ گئے۔ سبھوں نے کھانا کھایا۔ میں تو دوبارہ چوکے ہی میں نہ جاسکی۔ مجھے یہ فکر پریشان کرنے لگی کہ آخر اور یہ کیا کھائیں گے۔ کیا ویسے ہی رہیں گے۔ میں نے فوراً آٹھ آنے کا گھی گاؤں سے منگوایا اور مونگ کی دال دھوپ میں بیٹھ کر میں نے خود پیسی۔ موٹوڑے اور حلوہ بنایا۔ جب تیار ہو گیا تو ان کے پاس ڈرتے ڈرتے لے گئی۔ بولے ''اس وقت کچھ نہ کھاؤں گا۔''

میں نے کہا ''بڑی محنت سے میں نے ابھی تیار کیا ہے اور میں نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا ہے۔''

میری یہ دھمکی کامیاب رہی اور انھیں کھانا پڑا۔ اس کے بعد سے میں برابر سامان منگوا کر رکھنے لگی۔ اس پر آپ بولے ''اب یہاں زیادہ رہنا اچھا نہیں۔''

اس کے دوسرے دن میرے پتا کے مرنے کی خبر آئی۔ دو تین دن ہی بعد وہ مجھے الہ آباد لے کر گئے۔ وہاں ساتھ آٹھ روز رہے۔ اس کے بعد آپ کانپور چلے گئے۔ وہاں مارواڑی اسکول میں ہیڈ ماسٹری خالی تھی۔ اس کے منیجر شری کاشی ناتھ تھے۔ وہ طالب علم گنیش شنکر کے دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے یہ طے کیا کہ اس کام کو آپ قبول کیجیے۔ آپ کے یہاں آجانے سے رنگ آجائے گا۔

آپ نے اسے قبول کیا۔ یہ جون ۱۹۲۱ کی بات ہے۔ طے ہوا کہ جولائی سے آپ کام پر آ جائیں گے۔ اس کے بعد آپ الہ آباد آ گئے۔ مجھ سے بولے۔ میں اپنے لیے جگہ ٹھیک کر آیا۔ آؤ ہم تم بنارس پھر ایک بار ہو آئیں۔" پھر ایک مہینے تک اسی طرح چلتا رہا۔

پانچ جولائی کو ہم کانپور آنے کی تیاری میں لگے۔ ان دنوں بنو پیٹ میں تھا۔ چاچی بولیں "انھیں چھوڑ جاؤ" آپ بولے "انھیں میں نہ چھوڑوں گا۔ ان کی طبیعت اچھی نہیں۔ کیا معلوم کیا ہو جائے۔ مجھے تو جیون بھر پچھتانا پڑے گا۔"

چاچی بولیں "ہونی کو تم روک لو گے؟"

"میرے سامنے ہونے سے مجھے پچھتاوہ تو نہ رہے گا۔"

چاچی بولیں "ایسی صورت میں تم مجھے بلاؤ گے اور مجھے آنا پڑے گا۔"

"یہ تو آپ کی مرضی پر ہے" انھوں نے کہا۔

ہم پانچویں تاریخ کو دونوں بچوں کو لیے کانپور پہنچے۔ کانپور جانے کے بعد میری طبیعت پھر خراب ہوئی۔ جو مہری (عورت) ہم رکھتے ایک دن آتی' دو چار دن غائب رہتی۔ مجھے دست ہو رہے تھے۔ کمزوری بے حد تھی۔ کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ ساگودانہ پانی میں ابال کر کھاتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ کھانا پکاتے ہی برتن بھی وہ اپنے ہاتھوں صاف کرتے۔ ایک دن مجھے رات بھر دست آئے۔ رات کو کوئی ۴ بجے کے قریب کمزوری کی وجہ سے میں گر پڑی۔ آپ دوڑے آئے۔ دیکھا تو میری یہ حالت تھی۔ مجھے اٹھا کر چارپائی پر رکھا کیونکہ میں بے ہوش تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے "تمھاری جب یہ حالت تھی تو مجھے کیوں نہیں جگایا؟"

میں نے کہا "آپ کو کیوں تکلیف دیتی؟"

"تو تم مر جانے پر اپنی لاش ہی دکھانا چاہتی تھیں۔"

"مرنے کا کیا اندیشہ تھا۔ کمزوری تھی گر پڑی۔"

"مرنا کیسے ہوتا ہے؟ بے ہوش تھیں تم۔"

"کبھی مری تو نہیں ہوں کہ بتاؤں کہ مرنا کیسا ہوتا ہے۔"

بولے "تمھیں ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔"

میں بولی "ارے اب تو اچھی ہوں۔"

اس کے ڈیڑھ مہینے بعد بنو پیدا ہوا۔ ان کی چاچی آئیں تو میرے پاس ضرور' لیکن بنو کے پیدا ہونے کے بیس دن بعد واپس چلی گئیں۔

کانپور

ایک دن ایک مہاشے میرے یہاں آئے اور بولے کہ ''ریل میں کوئی میرا کوٹ چرا لے گیا' اسی میں روپے بھی تھے میں اپنی بیوی اور بچے کو لینے سسرال جا رہا تھا۔ مجھے کچھ روپے چاہئیں۔ نہیں تو میں نہیں جا سکتا۔''

''دور دور تک وہ رہے۔ مجھ سے آپ بولے ''ان کو ۱۵ روپے چاہیے دے دو۔''

میں نے کہاں ''روپے کہاں ہیں؟ فیس ہی کے تو روپے ہیں''۔ آپ بولے ''کسی طرح بھی سہی۔ دو تو۔ میرا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔''

''اگر وقت پر روپے نہ آئے؟''

''پہلے اسے دو۔ سمجھ لیں گے۔''

میں نے انھیں ۱۵ روپے دیے۔ وہ لے کر رخصت ہوئے۔

پانچ چھ روز کے بعد پھر وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر پہنچے۔ پھر تین روز رہے۔ ان کے دوبارہ بیس مانگے۔ وہ ڈرتے ہوئے میرے پاس آئے۔ بولے ''وہ بیس پھر مانگ رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟''

''مجھے تو تم نے پریشان کر ڈالا۔ اتنے روپے کہاں ہیں۔ دوسرے کے روپے اگر وقت پر نہ آئے تو! میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

''روپے نہیں ہیں تو اتنے آدمیوں کو کھلا دیا جواب دو۔''

''جواب تو آپ ہی کو دینا چاہیے تھا۔''

آپ بولے ''نہ دو گی تو تم سے پلیں گے نہیں۔ چار چار آدمیوں کو پکا کر کھلانا بھی مشکل پڑ جائے گا۔ کہہ رہے ہیں کہ فوراً روپے بھیج دوں گا۔''

میں نے پھر ۱۵ روپے دیے۔ اس نے چار پانچ دن میں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب وعدے کی تاریخ

ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''روپے آئے''؟ آپ بولے ''روپے تو نہیں آئے خیر جب فیس دینی ہوئی تو میں نے گھر کے روپے ملا کر پورے کیے۔

۱۵۔۲۰ دن کے بعد ایک دن میں نے کہا'' آپ ایک خط تو بھیج دیجیے۔'' آپ بولے'' بنا تمھارے کہے میں نے دو خط بھیجے ہیں۔''

میں نے کہا''اب آج عہد کر لیجیے۔ کہ ادھار کی نیت سے کسی کو روپیہ نہیں دوں گا۔''

''تم جیسا کہو ویسا ہی کروں۔ پر جو مانگنے آئے گا اسے دینا تو پڑے گا ہی۔''

''تم کو الجھن نہیں ہوتی۔ تم تو سمجھتے ہوں صندوق میں ایک روپیہ رکھنے سے دس روپے ہو جاتے ہیں۔''

''تم بھی تو چپکے سے نکال کر دے دیتی ہو۔ رہتے نہیں تو کیسے دیتی ہو؟ پہلے ہی کی طرح تھوڑے ہی ہے۔ اگر فیس کے روپے نہ داخل ہوتے تو میں جانتا کہ روپے نہیں ہیں۔''

میں نے کہا'' کم سے کم میری پریشانی تو محسوس کیا کرو۔''

''ارے بھائی کیا کروں؟ تم اپنی طبیعت کو الزام کیوں نہیں دیتیں۔ لوگ روپے رکھے رہتے ہیں۔ لیکن دیتے نہیں۔''

''مجھے تمھارے اوپر ترس آجاتا ہے۔ اسی سے مجبور ہو جاتی ہوں۔ سب تو تمھیں بھاڑے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ میں بھی کیوں سمجھوں۔''

''خیر ہم لوگ شاید اسی کے لیے پیدا ہوئے ہوں۔''

میں خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد ادھار کی نیت سے میں نے کسی کو روپے نہیں دیے۔''

اسی طرح کی ایک اور واردات ہے۔ ایک بار گوالیار سے ایک خط آیا۔ ہم لکھنؤ میں تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ ایک سو روپے آپ اگر بھیج دیں تو مجھے ایک سو روپے مہینے کی ایک نوکری مل جائے۔ مجھے ضمانت دینی ہے۔ انھوں نے وہ خط مجھے پڑھ کر سنایا اور بولے'' سو روپے وہ مانگ رہے ہیں اور انھیں سو روپے کی جگہ مل رہی ہے۔''

''تو پھر نوکری کریں۔ روپے کیوں مانگ رہے ہیں؟''

''اس کو ضمانت جو دینی ہے۔''

خیر اس کے اوپر مجھے بھی رحم آیا۔ میں نے سوچا سو روپے دینے پر جب ایک آدمی کو سو روپے کی جگہ ملتی ہے تو کیا حرج ہے۔؟

آپ بولے ''نہیں وہ دو مہینے میں ۵۰ کر کے روپے دے گا۔

میں نے کہا '' دینے لینے کی خواہش مت کرو۔ اسے دے دو۔ اس کا بھلا ہو جائے۔ اس کا جیون شاید سدھر جائے۔''

''خیر جیسی تمھاری مرضی۔''

دوسرے دن بینک سے سو روپے میں نے منگوائے۔ اور ان کو بھجوا دیے۔ آپ نے خط میں لکھ دیا کہ یہ روپے میں نہیں شورانی بھیج رہی ہیں۔

چوتھے روز ان کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ خوشی ہے۔ اب مجھے وہ جگہ مل جائے گی۔

تب سے ایک مہینے تک برابر ان کے خط آتے رہے۔

اس کے بعد وہ خود آئے۔ میرے گھر ٹھہرے۔ بولے '' میں چھٹی لے کر صرف آپ لوگوں کے درشن کے لیے آیا ہوں۔ میری ماں پہلے ہی مر چکی تھیں۔ میرے پتا نے دوسری شادی کر لی۔ مجھ سے انھیں بڑی نفرت ہے۔ اب میں اسی کو اپنا گھر سمجھ رہا ہوں۔''

دو تین دن کے بعد میں بولی ''انھیں آپ کسی ہوٹل میں ٹھہرا دیجیے۔''

آپ بولے ''میں بھی یہی ٹھیک سمجھتا ہوں۔''

ایک ہوٹل میں وہ بارہ روز تک ٹھہرے رہے۔ ان دنوں 'ہنس' نکالنے کا چرچا ہو رہا تھا۔ ان صاحب کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ پھر وہ بارہ تیرہ روز کے بعد چلے گئے۔ اس کے بعد مئی کے مہینے میں ہم لوگ گھر آئے۔ جون میں بیٹی کملا کی شادی تھی۔ اس موقع پر وہ پھر میرے گھر آئے اور لگ بھگ پندرہ دن تک ٹکے رہے۔ جب وہ جانے لگے تو پھر انھوں نے ۵۰ روپے مانگے۔ دیے گئے' یہ بات مجھے نہیں معلوم۔ وہ گئے۔ اس کے بعد جولائی میں آپ بھی لکھنؤ گئے۔ وہاں میں اس وقت نہیں گئی۔ وہ دھنو کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔

اس کے بعد اس نے پٹنے میں اپنی شادی طے کی۔ آپ کو خبر دی۔ آپ نے اس کی بیوی کے لیے سونے کی چار چوڑیاں' گلے کی زنجیر' کرن پھول اور دو تین ریشمی ساڑیاں خرید کر اسے دیں اور ایک سو روپے اسے نقد بارات کے خرچ کے لیے دیے۔ اور خود پٹنہ تک گئے بھی۔

وہ اپنی بیوی بیاہ کر لکھنؤ لایا۔ تین روز کے بعد اسے ڈھونڈتی ہوئی پولیس پہنچی۔ وہ مفرور آدمی تھا۔ تب اس سے آپ بولے۔ ''تم یہاں نہیں رہ سکتے'' وہ اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا۔ جب میں اگست کے مہینے میں وہاں گیا تو انھوں نے بتایا کہ اس کی شادی ہوئی ہے۔ یہاں سے کپڑے لے گیا ہے۔ روپے لے گیا ہے۔''

ایک دن سنار تقاضہ کرنے آیا میں ان کے پاس بیٹھی تھی۔ یہ سنار نے کہا کہ روپے چاہئیں۔ اسی سنار سے میں نے اپنی لڑکی کے لیے زیور بنوائے تھے۔

میں بولی ''تمھارے روپے تو پورے دیے گئے تھے۔''

سنار بولا ''وہ روپے نہیں بابو جی نے ایک بنگالی صاحب کو اور گہنے دلوائے ہیں۔''

''بنگالی کے یہاں سے روپے آئیں گے تو ملیں گے۔'' میں نے کہا۔

آپ بولے'' ہاں اس کا خط آیا تھا۔ جیسے ہی روپے آئیں گے میں دوں گا۔''

سنار چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے ان سے پوچھا'' جب اس کے پاس روپے نہیں تھے تو آپ نے دیے کیوں؟''

''جیسے ہی تم نے نوکری کے لیے سو روپے بھیجے ویسے ہی میں نے اس کی شادی کرادی۔ تم ہوتیں تو اس کی بیوی تمھارے پیر دباتی''۔

میں چپ ہو گئی۔ اس کے کچھ دن بعد بزاز پہنچا۔ اس دن بھی اتفاق سے میں اسی کمرے میں تھی۔

میں نے پوچھا ''تم کیوں آئے ہو۔''

بولا'' بابو جی نے ایک بنگالی بابو کو کپڑے دلوائے ہیں۔''

''کیا تمھیں بھی روپے نہیں ملے؟'' میں بولی۔

بزاز بولا'' اگر ملے ہوتے تو کیا میں زبردستی آپ سے مانگتا؟''

اس کو بھی وہی جواب دیا گیا۔ جب وہ چلا گیا تو مجھے بری طرح غصہ آیا۔

''جتنا میں ادھار سے گھبراتی ہوں'' میں نے کہا'' اتنا ہی آپ میرے سر پر لا دو دیتے ہیں۔ ابھی لڑکی کی شادی کی تب آپ ادھار لائے اور اتنا پھر ادھار۔ یا تو آپ مالک رہیں نہیں تو میری رائے سے

کام ہونا چاہیے۔ یہ بے ہودگی مجھے قطعی پسند نہیں۔ کبھی کوئی بلا' کبھی کوئی بلا۔ مجھے تو مطلق امید نہیں کہ وہ روپے بھیجے گا۔''

آپ نے ان روپوں کے لیے مجھ سے چھپ کر لکھ لکھ کر روپے منگا کر بھرنا شروع کیے۔ کوئی ڈیڑھ سال میں پورے روپے دے پائے۔

یہ باتیں مجھے جیتیندر کمار نے مرنے کے بعد بتائیں۔ جیتیندر جانتا تھا' اسے وہ پہلے بتا چکے تھے اور مجھے نہ بتانے کے لیے سخت تاکید کی تھی: گھر میں مت بتانا' نہیں تو سخت پھٹکار سننی پڑے گی۔

اس طرح ایک بار ایک اور صاحب آئے اور دو سو روپے ان سے بینک سے نکلوا کر لیے۔ میں ان دنوں جیل میں تھی۔ جیل سے چھوٹ کر جب میں آئی تو ایک دن میں نے روپیوں کا حساب مانگا۔ حساب بتایا۔ اس میں دو سو روپے کم نکلے۔ میں نے پوچھا ''اور روپے کہاں گئے؟'' آپ بولے ''خرچ ہو گئے' نہیں'' میں نے کہا ''جھانسا مت دیجیے۔ بتائیے کہاں گئے'' مجبور ہو جانے پر بولے ایک صاحب آئے تھے وہ لے گئے۔ انھیں سخت ضرورت تھی۔''

میں نے کہا' سب ہی کی ضرورت کا تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے؟

''کیا کروں جان بوجھ کر تھوڑی پریشانی میں پھنستا ہوں۔ مدد کیے بنا نہیں رہا جاتا۔''

میں نے کہا'' آپ بہت ہی اچھے تھے جب آپ کو ٹکے ٹکے کی پڑی رہتی تھی۔ کوئی کسی کی قسمت نہیں بنا سکتا۔ آپ اسی حالت میں پھر جانا چاہتے ہیں۔ روپے جس طرح میں جمع کرتی ہوں آپ جمع کریں تو پتہ چلے۔ چوبیسوں گھنٹے کی کفایت سے روپیہ جمع کیا جاتا ہے۔''

آپ بولے'' رانی روپے تم اپنے نام جمع رکھو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔''

''معلوم ہوتا ہے مجھے روپے جمع کرنے کا خبط ہے۔''

''بیویاں چپکے سے جو روپے رکھ لیتی ہیں وہ عادت سچ مچ بڑی اچھی ہوتی ہے۔''

میں نے کہا' جمع کرتی ہوں تم ہی لوگوں کے لیے۔ چاہتی ہوں تم لوگوں کو اس کی فکر نہ رہے بلکہ معلوم ہو کہ تمھارے روپے جمع ہیں۔ میں دیکھ چکی ہوں کہ تم پہلے اس معاملے میں ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ تمھاری چنتا میں کم کرنا چاہتی ہوں اور تم مجھ سے چوری کرتے ہو؟''

آپ بولے'' تم سے میں چوری نہیں کرتا۔ ان کم بختوں کے مارے پریشان رہتا ہوں۔''

میں نے جل کر کہا'' آپ اپنے ہاتھ سے خرچ کیا کیجیے۔ چوری کرنے سے آتما بھی خراب ہوتی ہے۔''

''چوری صرف تم سے کرتا ہوں۔ سزا بھی ہلکی ہونی چاہیے۔''

میں اپنی بات پر ڈٹی رہی ''آج سے میں ہرگز روپے نہیں رکھوں گی۔''

آپ بولے ''تو میں ہی قسم کھا لیتا ہوں کہ میں آئندہ کبھی کسی کو روپے نہیں دوں گا۔ اب کوئی کام کرنا ہوگا تو تمھارے ہاتھ سے ہوگا۔ اس بوجھ سے میں اپنے کو الگ رکھوں گا۔''

(ایک بنگالی بابو کو ادھار پر سنار سے زیور اور بزاز سے کپڑے دلوانے اور بیوی سے چھپ کر لکھ لکھ کر قرض خواہوں کے پیسے بھرنے کا قصہ پریم چند نے اپنی ہندی کہانی ''ڈھپور سنکھ'' میں بیان کیا ہے۔ یہ کہانی مارچ ۱۹۳۱ میں ہندی میں چھپی تھی اور غالباً تا حال اس کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا ہے۔ یہ افسانہ ان کے افسانوں کے مجموعے مان سروور کی جلد چار میں شامل ہے۔ ڈھپور سنکھ۔ بڑبولا گانٹھ کا پکّا۔ ج۔م)

خدمت کی افتاد مزاج

ایک بار کی بات ہے میرے پاس چھوٹا بچہ بنو تھا۔ میں کھانا پکا رہی تھی اور بنو رو رہا تھا اسے بیٹی نے اٹھا لیا۔ بچی اور بچہ دونوں گرے۔ بچے کے سر میں چوٹ لگی اور تین دن تک تو وہ چارپائی پر سر تک نہ رکھ سکا۔ اسی لیے تین چار دن تک انھیں ہی روٹی پکانی پڑی ان کے صبح کے کام تو ویسے ہی چل رہے تھے۔ ساڑھے چار بجے ہی اٹھ جاتے تھے اور لکھنے پڑھنے میں لگ جاتے تھے۔ دھنو کو پڑھاتے بھی تھے۔ لکھتے بھی جاتے تھے۔ اس کے بعد نہا کھا کر اسکول جاتے۔ اسکول سے لوٹتے ہوئے ترکاری وغیرہ لیتے آتے تھے۔ بچوں کے ساتھ بھی کچھ دیر کھیلتے۔ ان دنوں کانگریس کی میٹنگ روزانہ ہو رہی تھیں ان میں بھی شریک ہوتے۔ میٹنگ سے لوٹنے میں کبھی کبھی رات کے دس بج جاتے۔ جس دن دس بجے لوٹتے اس دن رات کو کام نہ کر پاتے اور اس کی کمی رات کو تین بجے جاگ کر پوری کرتے۔ مگر اتنے آہستہ سے اٹھتے تھے کہ میری آنکھ نہ کھلتی۔ میں ان سے ہمیشہ آرام کے لیے جھگڑتی رہتی تھی کہ پورے طور سے نہیں کرتے ہیں مگر وہ کب میرا کہا ماننے والے تھے۔ اسی سال اگہن (نواں مہینہ۔ مطابق نومبر دسمبر) کے مہینے میں آپ بیمار پڑے۔ نو دن تک بخار دن رات رہا۔ مگر میں جب ان کی طبیعت کا حال پوچھتی تو وہ یہی کہتے ''اچھا ہوں'' میرے گھر ان دنوں میں چولہے میں آگ بھی نہیں جلی۔ دونوں بچوں کو بازار کی پوریاں اور دودھ ملتا تھا۔

دسویں دن اسکول کے ماسٹر آئے اور پوچھا ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

بولے ''بخار نہیں اتر رہا ہے۔ معیادی معلوم ہوتا ہے۔''

وہ لوگ جا کر تھوڑی دیر بعد ایک وید کو بلا لائے۔ اس نے ایک ایسی تیز دوا دی کہ بخار تو اتر گیا لیکن خون کے دست آنے لگے۔ جس دن خون کے دست شروع ہوئے انھیں میں بیت الخلا میں پہنچانے گئی۔ جیسے ہی آپ وہاں سے اٹھنے لگے وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ میں دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ ہڑبڑا کر دروازہ کھولا دیکھا بے ہوش پڑے ہیں۔ اٹھا کر کسی طرح چارپائی پر لٹایا۔ اس کے کچھ دیر بعد انھیں ہوش آیا۔ بولے "نہ معلوم کیسی دوا دی تھی۔" اس وقت بے حد کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ تین روز تک خون کے دست آئے۔ اس کے بعد جب اپنا کہار آیا تو اس سے ایک ماسٹر صاحب کو بلایا۔ اور ان سے وید کو بلانے کو کہا۔ وید آئے اور دوسری دوا دی۔ اس سے دست بھی رک گئے۔ ایک مہینے تک کمزوری کی وجہ سے زینہ نہیں اتر پائے۔

مگر اس حالت میں بھی لکھنے کی خواہش انھیں رہتی تھی۔ رات کو جب میں سو جاتی تو دھیرے سے اٹھ کر اپنی کاپی قلم دوات اٹھا لاتے۔ جاڑے کے دن تھے۔ چارپائی پر رضائی اوڑھے لکھنے لگتے۔ ان دنوں وہ پریم آشرم (گوشۂ عافیت) لکھ رہے تھے۔ میں دیکھ لیتی تو جھلا اٹھتی اور کہتی "کیا ابھی بیماری کچھ کم ہے جو اور کسی بیماری کی خواہش ہے۔"

"نہیں میں لکھ کہاں رہا تھا۔ پہلا لکھا ہوا دیکھ رہا تھا۔"

"سارا زمانہ تو آپ کو ٹھگ لیتا ہے مگر آپ مجھے ٹھگنے لگتے ہیں۔"

"بھلا تمھیں کون ٹھگے گا۔"

میں نے کہا اسی طرح گورکھپور میں لکھنا نہ چھوڑنے کی وجہ سے بیماری جڑ پکڑ گئی تھی۔ اب پھر ویسا ہی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"کہاں؟" "تم نے قلم ہی توڑ کر پھینک دیا تھا۔ لکھتا کب تھا۔"

"قلم تو میں نے بعد میں توڑا تھا جب آپ کسی طرح نہیں مانے تھے۔ دن بھر میں بھی آپ کے ساتھ بے کار نہیں رہتی تھی۔"

میں نے کہا "آپ صحت یاب ہو جائیں پھر کام کیجئے گا۔ روکتا کون ہے۔ ابھی زینے سے نیچے اترنے تک کی طاقت تو آئی نہیں۔ اور کام کرنا شروع کر دیا۔ اگر اب بھی آپ نہیں مانے تو میں پھر قلم توڑ کر پھینک دوں گی۔ کوئی چھوٹا بچہ کہنا مانے تو ٹھیک بھی ہے۔ آپ اتنے بڑے ہو کر ایک بات نہیں مانتے۔"

"بولے "اب مان بھی جاؤ۔ کہہ دیا قلم چھوؤں گا تک نہیں۔"

میں نے کہا ''ابھی تالے میں بند کیے دیتی ہوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

آؤں جاری ہی تھی۔ میں اس بیماری سے بہت دکھی تھی۔ ایک روز بولی'' کوئی دوا کیجیے۔ بولے'' تم دیکھتی ہو دوا تو برابر کر رہا ہوں۔ فائدہ نہ ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ شام کو میں کھانا بنانے لگتی۔ ان کو کھانسی آ رہی تھی۔ وہ چھ ماہ کا تھا۔ میرے کھانا بناتے ہوئے اکثر رونے لگتا۔ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ میں روٹی بیل دیتی، وہ روزانہ سینک لیتے۔ جب وہ کھانا کھا کر اٹھتے تو بچے کو لیتے اور میں کھانا کھاتی۔

ایک رات کا خواب ہے: میں نے دیکھا کہ آنے والی جولائی سے یہ اچھے ہو جائیں گے۔

جاگنے پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس سے پہلے کے بھی دو چار خواب سچے نکلے تھے۔ انھیں میں نے آواز دی'' کیا آپ سو گئے ہیں؟''

بولے'' کیا ہے؟''

'' اگلی جولائی سے آپ یقیناً اچھے ہو جائیں گے۔''

'' کیا تم میری بیماری سوتے میں بھی نہیں بھولتی؟'' انھوں نے کہا۔

'' اسے سچ سمجھیے۔'' میں نے کہا'' یہ بات جھوٹی نہیں۔''

'' تم اسی طرح کے سوپن دیکھتی ہو۔''

'' کل اس بات کو آپ نوٹ کر لیجیے گا۔ گورکھپور میں بھی اسی طرح کا سوپن دیکھ چکی ہوں اور وہ سچ نکلا تھا۔''

'' کل نوٹ کر لوں گا دیکھتا ہوں سچ نکلتا ہے یا نہیں۔''

'' ہاں مجھے پکا یقین ہے'' میں نے کہا'' آپ کو بھی میرے خوابوں پر یقین ہو جائے گا۔''

پھر کاشی ناتھ جی سے جھگڑا ہونا شروع ہوا۔ ایک دن مجھ سے بولے۔'' کیا کروں، یہ کمبخت میرے پیچھے پڑا ہے۔ میں نے کہا'' تو کیا ارادہ ہے، آپ اس کی سہتے رہیں گے؟'' ہٹائیے۔ استعفیٰ دے کر گھر چلیے۔''

'' گھر جانے میں بھی وہی بات ہے۔ روپے تو کہیں سے آنے چاہئیں۔''

'' سرکاری نوکری استعفیٰ دیتے وقت مارواڑی اسکول کا سوال تو دماغ میں نہیں تھا۔''

''رانی' یہ ہندوستان ہے۔ یہاں قلم کے بل پر روٹیاں چلانا بہت ہی مشکل کام ہے۔''

میں نے جواب دیا''تو کیا ہوا' کم میں ہی گزارہ کرلیں گے۔ جب وہ نہیں چاہتا تو خود کہاں تک سہا جائے۔''

بولے''تو تمھاری یہی رائے ہے کہ چھوڑ دوں؟''

''بالکل' میں نے کہا' ضرورتوں کا نام ہونا ٹھیک نہیں۔''

ان دنوں کاشی سے ''مریادا'' (وقار) نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر بابو سمپورنانند تھے۔ اسی دن خط آیا۔ آپ آکر اڈیٹ کیجیے۔ ۱۵۰/روپے تنخواہ ملے گی۔ اس کے بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اسکول میں اساتذہ چاہتے تھے ان کی رخصتی پر ایک جلسہ کیا جائے اور ان کو ایک سپاس نامہ پیش کیا جائے۔ کاشی ناتھ کو یہ بات نہیں بھائی۔ پر اساتذہ نے ان کی نہیں چلنے دی۔ لڑکوں کی بھی یہی خواہش تھی۔ جلسہ ہوا' سپاس نامہ (ابھینندن پتر) پیش کیا گیا۔ اس کے کارن چار پانچ اور ماسٹر نکالے گئے۔ پچیس تیس لڑکے خود اسکول چھوڑ گئے۔

اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ گھر چلنا چاہیے۔ میرے بھائی آئے اور مجھے اور بچوں کو اپنے یہاں لے گئے۔ آپ اکیلے کاشی گئے۔ 'مریادا' میں کام کرنا شروع کیا۔ کبیر چورا پر مکان لیا۔ پھر اسی طرح کام چلنے لگا۔

۱۱ بجے 'مریادا' آفس جاتے' کھانا خود پکا کر کھا کر۔ بھائی کو بھی خود کھلاتے۔

ایک بار کی بات ہے۔ گیہوں پس کر آیا۔ اس میں مٹی کنکر کافی تھے۔ میں اپنے میکے میں تھی۔ جب لوٹ کر آئی تو دیکھا کہ ایک چادر میں سوکھے گیہوں کی السی چپکی ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا ''چادر پر کیا ہے؟'' آپ بولے'' آٹا پس کر آتا ہے تو اس میں مٹی تو خیر ہوتی ہی ہے کنکر بھی آجاتے ہیں۔ کھانا کیسے چلتا۔ تو پھر دوبارہ میں نے اسے بین کر' صاف کر کے پانی سے دھویا اور چادر پر سوکھنے کو ڈال دیا تھا۔''

میں نے کہا'' گھر سے منگا لیتے۔''

''گھر میں کسے میری پڑی ہے۔''

''دوسرے بھی تو تھے' گھر میں آپ اکیلے نہیں تھے۔ کھانا کون پکاتا تھا؟''

''میں خود۔''

''میں نے جھلا کر کہا'' ٹھیک ہے کام بھی کرو۔ سب کو کھانا بھی کھلاؤ۔''

''تم تو اپنے گھر بیٹھی تھیں۔ میں اکیلا کیا کرتا؟''

''مجھ میں اتنی برداشت نہیں ہے۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ اب تو ان کا لڑکا سو روپے پاتا ہے۔اب ان کا مزاج ''کیوں ملنے لگا''

''کماتے ہیں تو کیا کسی کو کچھ دیتے ہیں۔''

اس طرح ڈیڑھ سال ''مریادا'' میں رہے۔ پھر ودھیا پیٹھ (علم کی دیوی کی نشست) میں ہیڈ ماسٹری پر فائز ہوئے۔تنخواہ ۱۳۵ روپے طے ہوئی۔ روزانہ بھید بینی اگیے سے جاتے۔اسی جولائی سے دست آنا بند ہو گئے۔تس پر آپ بولے ''بھائی تمھارا سپنا سچ نکلا۔''

''شکر ہے ایشور کا'' میں نے کہا۔''

بوڑھی نائن

سنہ۲۱ کی بات ہے۔آپ کے بڑے بھائی صاحب اندور سے آئے تھے۔ بوڑھی نائن گاؤں میں کسی کو گالی دے رہی تھی۔اس کے اس رویئے پر بڑے بھائی صاحب کو غصہ آ گیا۔انھوں نے نائن کو دو تین طمانچے لگا دیے۔ وہ نائن روتی ہوئی آئی اور آپ کے پیر پکڑ کر رونے لگی۔اس کو تسکین دیتے ہوئے بولے ''میں بھائی صاحب سے پوچھوں گا۔''

جب وہ نائن چلی گئی تو آپ مجھ سے بولے ''بھیا کو نہ معلوم کیا ہو جاتا ہے۔اس بڑھیا کو خواہ مخواہ انھوں نے مار دیا۔''

میں بولی ''یہ بھی تو پاجی ہے۔''

آپ بولے ''مگر ایک بوڑھی عورت پر ہاتھ اٹھانے کا انھیں کیا حق ہے؟''

میں نے کہا ''کوئی سہہ سکتا ہے کسی کو غصہ آ جاتا ہے۔''

''غصے کی کوئی حد بھی ہونی چاہیے۔''

''غصے کی حالت میں حد کون دیکھتا ہے۔ جا کر اپنے بھائی سے پوچھئے آپ کے اوپر بھی بگڑیں گے۔''

''میں انھیں کچھ کہوں گا تھوڑا ہی۔''

شام کو بھائی صاحب سے کہنے لگے ''آپ نے ناحق نائن کو مارا۔''

بھائی بولے" کیا کرتا۔ یہ بڑی پاجی ہے۔ بہت بار میں نے منع کیا مگر مانتی ہی نہیں ہے۔"

"تو کیا آپ کے مارنے سے وہ بھلی مانس ہو جائے گی؟"

"مجھے غصہ آ گیا۔ اور یہ تو سچ کہ وہ پٹنے سے بھلی مانس نہیں ہو جائے گی۔"

"تو اس کا فائدہ کیا؟ مار کی مار بھی ہوئی اور وہ ٹھیک بھی نہیں ہوئی۔"

"اسے جو چاہے کہہ لو غصہ آ گیا' مار بیٹھا۔"

"تو آپ نے پھر اس نائن سے معافی مانگ لی۔؟"

"معافی تو نہیں مانگی۔ لیکن دھنو کی ماں نے البتہ اسے کھانا وانا کھلایا۔ انھوں نے دلجوئی بھی کی۔"

"تو پھر دھنو کی ماں نے اسے خوش کیا۔ پریشانی تو انھیں ہی ہوئی۔ آپ ہم تو بچ نکلے۔ گھنٹوں اسے سمجھایا گیا ہوگا تب کہیں جا کر اسے سکون ہوا ہوگا۔"

جیٹھ جی

سنہ ۲۲ کی بات ہے ہمارے جیٹھ کو کہیں نیوتے میں کچھ دینا تھا۔ انھیں روپوں کی ضرورت تھی۔ پریس میں بابو جی سے بولے" نواب مجھے کچھ روپے دو' ضرورت ہے" آپ بولے" آج بھیا کچھ بھی تو نہیں آیا۔ کہیے تو کسی سے یہاں سے اُدھار منگوا دوں۔"

وہ بولے" میں گھر پر دھنو کی ماں سے لے لوں گا۔ ادھار کیوں لو۔"

آپ بولے" ان کے پاس شاید نہ ہوں۔"

"تمہارے لیے نہ ہوں' میرے لیے ہوں گے۔"

"نہیں روپے ان کے پاس نہیں رہتے۔"

شام کو آپ کے آنے سے پہلے وہ میرے پاس آئے۔ بیٹی سے بولے" اپنی ماں سے کہو ۱۵ روپے مجھے چاہییں۔ ہوں تو دے دیں۔"

مجھ سے نہیں کرتے نہ بن پڑا۔ میں نے ۱۵ روپے نکال کر انھیں دے دیے۔ وہ میری بات کو بہت مانتے تھے۔ میری ہی صلاح سے وہ بھی کام کرتے تھے۔

جب شام کو آپ آئے تو بولے "بھیا آئے تھے؟"

میں بولی "آئے تھے اور ۱۵ روپے بھی لے گئے۔"

آپ بولے "میں نے ان سے جھوٹے ہی کہا کہ نہیں ہیں روپے۔ کہاں سے آ گئے روپے؟"

میں بولی "دلی کتنی بھی اجڑ جائے دیہات تو رہے گی ہی"۔

"مجھے انھوں نے جھوٹا سمجھا ہوگا۔ تب ہی جھیپ کہتے تھے میرے لیے ہوں گے تمھارے لیے چاہے نہ ہوں۔"

میں نے کہا "تو مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ نہ کر چکے ہیں۔ ویسے بھی انھیں روپے اور کہاں سے ملتے؟ میرے گھر پر چھونا چھیتو پڑا ہی رہتا ہے۔"

آپ بولے "میں بھی اب بے فکر رہا کروں گا"

"میں تو تمھیں ہمیشہ فکروں سے پرے رکھتی ہوں۔ اور کب تم بوجھوں تلے دبے رہے؟"

"تمھارا شکر گزار ہوں۔"

بنارس میں بچے کی تیمارداری

ایک روز کی بات ہے۔ نو چھوٹا تھا۔ ان کا صبح کا اسکول تھا۔ جیسے ہی نو سو کر اٹھا ویسے ہی اسے دو دستیں ایک بڑی قے ہوئی۔ میں نے سوچا یوں ہی ہے کوئی خاص بات نہیں اور وہ اسکول چلے گئے۔ جب تک وہ آئے تب تک اسے کافی دست آ چکے تھے۔ بارہ بجے گھر آنے پر میں ان سے بولی "آج اس بچے کو صبح سے ہی قے ہو رہی ہے"۔ آپ بولے "کھا لوں تو ڈاکٹر صاحب کے پاس جاؤں"۔ خیر تب تک میں نے چلم چڑھائی۔

آپ اس بچے کو لیے کھڑے تھے۔ ۱۹۲۳ کی بات ہے۔ اسی حالت میں بچے نے قے دست دونوں کیے۔ آپ کے دونوں کپڑے سامنے اور پیچھے سے خراب ہو گئے۔ جب میں آئی تو بچے کو مجھے دے کر انھوں نے کپڑے بدلے اور ترنت ڈاکٹر کے یہاں چلے گئے۔ ڈاکٹر کو لے کر آئے۔ ڈاکٹر نے دوا دی۔ اس دن ایک بجے دوپہر سے ہم دونوں بیٹھ کر دس دس منٹ کے وقفے سے اسے دوا دے رہے تھے لیکن قے دست دونوں برابر جاری تھے۔ کوئی چار بجے کے بعد اس کو کچھ آرام ہوا تب انھوں نے اپنی کمر سیدھی کی۔

ایک بار اس طرح مجھے بھی دست آئے۔ آپ اور کملا پاؤنڈر ساری رات بیٹھ کر دوا دیتے رہے۔ تیمارداری ان کی حقیقی عبادت تھی۔ کسی کو بھی بیمار نہیں دیکھ سکتے تھے۔

بستی سے الہ آباد

ایک بار کی بات ہے۔ میں بستی سے الہ آباد جا رہی تھی۔ میری گود میں بچی کملا سوا سال کی تھی۔ سرجو (گھاگرا) پار کرنا تھا۔ اسٹیمر میں ہم بیٹھے تھے۔ اوپر کی بنچ پر آپ تھے نیچے ان کے پیر کے پاس میں۔ لڑکی ان کی گود میں تھی اور وہ کسی مہاشے سے گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک بیس پچیس برس کا نوجوان وہاں آیا۔ وہ جیسے جیسے میری طرف بڑھ رہا تھا ویسے ویسے میں آپ کے پیر کے پاس کھسکتی جا رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ بالکل میرے قریب آ گیا ہے تو آپ کا پیر دبا کر میں بولی ''آپ اس بدمعاش کو دیکھ نہیں رہے ہیں؟ میری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔''

اس بدمعاش کی یہ حرکت دیکھ کر آپ کو بھی غصہ آ گیا۔ بچے کو میری گود میں دے کر اس کی گردن پکڑ کر آپ کافی دور تک لے گئے۔ بولے ''سرجو میں پھینک دوں گا۔''

نوجوان بولا ''میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ میں تو بس کھڑا تھا۔''

''کھڑے ہونے کی وہاں گنجائش تھی جہاں تم کھڑے تھے؟ عورتوں کے سر پر کھڑے ہوتے ہو اگر دوسرا لفظ منھ سے نکالا تو جھونک دوں گا سرجو میں۔''

میں نے کہا ''جانے دیجیے۔''

آپ بیمار تھے دوا کرانے ہم الہ آباد جا رہے تھے۔

نوجوان بولا ''بس تم ہی نے کرایہ دیا ہے؟''

آپ بولے ''کسی کے سر پر بیٹھنے کے لیے تم کرایہ دے کر آئے ہو؟''

میں انھیں انتہائی غصے میں دیکھ کر ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر واپس لے آئی۔ اس وقت آپ غصے سے کانپ رہے تھے۔ مجھے خود بعد میں افسوس ہوا کیونکہ اس وقت میں خود ان سے زیادہ تندرست تھی۔ میں نے کہا ''بیٹھ جائیے'' تب آپ ٹھنڈے ہوئے۔

گاؤں میں

آپ گاؤں میں رہتے تو اپنے دروازے پر ہمیشہ خود جھاڑو لگاتے۔ کبھی کبھی میں انھیں اس کام سے

روئی بھی تھی۔ چھوٹے بچوں کو دروازے پر بیٹھا کر چار بجے شام کو ان کے پاس مٹی اکھٹی کر دیتے۔ پتیاں جمع کر دیتے۔ سکٹے (ٹھیکرے) اکٹھا کر دیتے اور لڑکوں کو کھیلنے کے ڈھنگ سکھاتے۔ اس کے بعد جب گاؤں کے کاشت کار اکھٹے ہو جاتے تو ان سے باتیں کرتے اور ان کے جھگڑے نپٹاتے اور ساتھ ہی میں بچوں سے بھی کھیلتے جاتے۔ کوئی نئے قاعدے قانون بنتے تو ان کاشت کاروں کو ان سے آگاہ کرتے' سمجھاتے۔ ان سبوں کے ساتھ تو وہ بالکل کاشت کار ہو جاتے تھے۔ عمر کی بڑائی کے لحاظ سے جس کا جیسا رتبہ یا رشتہ ہوتا تھا ہمیشہ ویسی ہی عزت اسے دیتے تھے۔ چاہتے تھے کہ گاؤں ایک قلعہ بن جائے۔ ناولوں میں دیہاتی زندگی کی خوبصورت تصویریں نظر آتی ہیں چاہتے تھے گاؤں ان ہی کی طرح جیتا جاگتا بن جائے۔ کاشت کاروں کی کمزوری دیکھ کر انھیں بڑا دکھ ہوتا۔ کاشت کاروں کی عورتوں سے بھابھی' چاچی' بہن' بیٹی کا جیسا تعلق ہوتا ان سے سدا اسی طرح کا برتاؤ کرتے۔ ان میں جو بڑے تھے ان کو وہ سلام بھی کرتے۔ ان میں جو بھابھی لگتی تھیں اگر وہ ان سے مذاق کرتیں تو ہنس دیتے تھے' برا نہیں مانتے تھے۔ گاؤں میں رفع حاجت کے لیے بہت دور نکل جاتے تھے اور وہاں سے آم کے دنوں میں لوٹتے ہوئے لونے میں آم بھی لیتے آتے۔ مولی کے دن ہوتے تو مولی بھی توڑ کر لونے میں لیتے آتے۔

۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ

ہندوستانی اکیڈمی جیسی انجمن کھولنے کے لیے آپ اور منشی دیانارائن نگم بہت دن سے کوشاں تھے۔ ہندوستانی اکیڈمی کھلی تو آپ بھی اس کے ایک ممبر بنائے گئے۔ آپ میٹنگ میں پابندی سے جاتے تھے۔ وہاں سے آنے پر میں ہمیشہ پوچھتی۔ ''کیسا کام یہ لوگ کر رہے ہیں؟''

ایک دن آپ نے جواب دیا ''ہم لوگوں کی خواہش جس طرح کی انجمن قائم کرنے کی تھی وہ تو پوری نہیں ہوئی'' میں بولی ''پھر ان لوگوں نے کیا قائم کیا ہے؟''

آپ بولے'' کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہوگا۔''

میں بولی'' پھر آپ لوگوں کو اطمینان کیوں نہ ہوا''؟

آپ بولے'' یہ کام کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ہم تو چاہتے تھے کہ ہندوستان کی ہر زبان کا ایک ایک ادیب اس کمیٹی میں ہو۔ جس کسی مضمون کی کتاب نکلتی وہ پہلے ان ادیب ممبروں کو دکھائی جاتی۔ متعلقہ ممبر ہی کو دیکھنے کا حق ہوتا۔ اس طرح کوئی بھدی کتاب نہ نکل سکتی۔ اس سے ان ادیبوں کے ہنر کے پھلنے پھولنے کو نقصان نہیں پہنچتا۔ اپنے یہاں اب کی ترقی بھی ہوتی اور ساتھ

ساتھ ان ادیبوں کی نشو نما بھی ہوتی۔ جس چیز کی کمی ہوتی اسے پڑھایا جاتا۔ ادیبوں کو ادھر ادھر بھٹکتے نہیں پھرنا پڑتا۔ نئے لکھنے والوں کی خوبیوں خامیوں کی کوئی نشان دہی نہیں کرتا۔ رائے دینے والا "بس" "نہیں ٹھیک ہے" کہہ کر مسودہ لوٹا دیتا ہے۔ یہ انصاف تو نہیں ہے۔ نئے لکھنے والوں میں دلچسپی رکھنے والے دانشوروں کا یہ فرض ہے کہ وہ انھیں ان کی خوبیاں خامیاں سمجھائیں۔ ان کو اس طرح سمجھ کر اکیڈمی اپنے کام چلاتی۔ رہا معاوضے کا سوال۔ رویلٹی پر بھی ان کی کتابوں کو اکیڈمی لے سکتی تھی۔ اور یک مشت قیمت دے کر بھی۔"

میں بولی۔" لکھنے والوں کی تحریریں کہیں پڑی تھوڑا ہی رہتی ہیں۔"

آپ بولے" ایسے ناشروں کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنے ہی پیٹ بھریں۔ لکھنے والوں کو بھی کچھ ملنا چاہیے۔ اکیڈمی اور لکھنے والوں کا تو رشتے داروں کا سا رشتہ ہونا چاہیے۔ آج کل کے لکھنے والوں کی طرح نہیں نہ ہی پبلشروں کی طرح۔ جب تک دونوں میں ایسا رشتہ نہ ہوگا تب تک کچھ بھی نہیں ہونے کا۔ اس طرح جب لکھنے والے کا کچھ بھلا نہیں ہوتا تو وہ ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادب کی بڑھوتری رک جاتی ہے اور ادب کی ترقی ٹھہر جاتی ہے۔"

"ادب کی ترقی اور کس طرح ہو؟" میں بولی۔

آپ بولے" ابھی ترقی نام کی چیز کی تو گندھ (بو) تک نہیں ہے۔ بلکہ کہنا تو یہ چاہیے کہ کام سے زیادہ آپس میں تو تو میں میں ہے۔ میں میں میں کہیں کام ہوتا ہے؟"

میں بولی" تب کیسے کام آگے بڑھے گا؟"

آپ بولے جب تک یہاں کے ادب میں ترقی نہیں ہوئی تب تک سماج اور سیاست بھی سب کے سب جوں کے توں پڑے رہیں گے۔"

میں بولی" تو کیا آپ ان تینوں کو ایک مالا کی طرح پرونا چاہتے ہیں؟"

آپ بولے" اور کیا۔ یہ چیزیں مالا جیسی ہی ہیں۔ جس زبان کا ادب اچھا ہوگا اس کا سماج بھی اچھا ہوگا۔ سماج کے اچھا ہونے پر مجبوراً سیاست بھی اچھی ہوگی۔ یہ تینوں ساتھ ساتھ چلنے والی چیزیں ہیں۔"

میں بولی" یہ کوئی ضروری ہے کہ تینوں کو ایک ساتھ لے کر چلا جائے؟"

آپ بولے" ان تینوں کی منزل جو ایک ہے۔ ادب ان تینوں چیزوں کے اگنے کے لیے ایک بیج کا

کام دیتا ہے۔ادب' معاشرہ اور حکومت کا اہم رشتہ ہونا بالکل اٹل ہے۔معاشرہ آدمیوں کے مجموعے ہی کو تو کہتے ہیں۔معاشرے میں جو فائدے نقصان' اور سکھ دکھ ہوتا ہے وہ آدمیوں پر ہی ہوتا ہے نا؟ حکومت میں جو برا بھلا ہوتا ہے وہ آدمیوں ہی کے سر پڑتا ہے۔ادب سے لوگوں کو بالیدگی ملتی ہے۔ادب سے لوگوں کی خواہشیں اچھی اور بری بنتی ہے۔ان ہی آرزوؤں کو لے کر آدمی جیتا ہے۔اوران تینوں چیزوں کی روئیدگی کا باعث انسان ہی ہے۔''

میں بولی'' آپ شاید جڑ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کررہے ہیں۔''

''جڑ کی ہی حفاظت سے تو سب کچھ ممکن ہے۔بنا جڑ کی حفاظت کیے کچھ نہیں ہوگا۔''

''ان لوگوں کے دماغ میں یہ باتیں کیوں نہیں آئیں؟''

''بڑے لوگوں کے دماغ میں یہ باتیں کیوں آئیں۔''انھوں نے کہا'' غریبوں کی مشکلات کی طرف ان کا دھیان جاتا ہی کہاں ہے۔جب تک خود ان پر نہیں بیتے گی تب تک کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ان سبوں کو سدھارنے کے لیے ادب ہی ایک ذریعہ ہے اور جب تک کوئی اِسے اپنے ہاتھ میں نہیں لے گا۔یہ نہیں سدھر سکتا۔'' آپ کو رات دن ادیبوں کا خیال رہتا تھا۔آپ نے ستیہ جیون درما کے تعاون سے ''لیکھک سنگھ'' (ادیبوں کی یونین) نام کی ایک سوسائٹی بھی کھولی تھی۔اس کے بعد بھی وہ ہمیشہ اس موضوع پر گفتگو کیا کرتے تھے۔سنہ ۱۹۳۵ میں انجمن ترقی پسند مصنفین (پرگتی شیل لیکھک سنگھ) کھولی تھی اس کے پہلے صدر آپ ہی ہوئے تھے۔

وہ کام ایسی ناسور گھڑی میں اٹھایا گیا کہ اس کا اٹھانے والا ہی اٹھ گیا۔سوچیے تو وہ ادب کے لیے کتنے سرگرم عمل رہتے تھے۔ابھی حقیقت میں وہ کچھ بھی نہ کر پائے تھے کہ چل دیے۔اس خیال سے کہ سب ہی صوبائی زبانیں (پرانتیئے بھاشائیں) ایک مالا کی طرح گتھی رہیں انھوں نے بھارتی ادبی بورڈ کو 'ہنس' دے دیا تھا۔انھیں یقین تھا کہ ان کے اس عمل سے سب ایک خاندان کی طرح ہو جائیں گے۔اسی میں ان کو دیش کی تمام سیاسی (راج نیتی) گتھیوں کے سلجھ جانے کا یقین تھا۔ان کی زندگی ہی میں ہنس کو بورڈ نے الگ کر دیا تھا۔وہ اپنی کٹھن بیماری کے دوران بھی 'ہنس' کو نہیں بھولے تھے۔گورمنٹ نے ان سے ضمانت بھی مانگی تھی۔لیکن جب ادبی بورڈ نے ضمانت نہیں دی تو 'ہنس' بند کر دیا گیا۔

آپ بیمار پڑے تھے مجھ سے بولے ''ہنس کی ضمانت تم جمع کرادو۔میں اچھا ہو جانے پر اسے سنبھال لوں گا۔''

خود ان کی بیماری کی وجہ سے میں پریشان تھی اس پر ان کی 'ہنس' کی فکر اس پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی۔

میں بولی ''اچھے ہو جایئے پھر سب کچھ ہو جائے گا۔''

'بولے ''نہیں ضمانت داخل کرادو۔ میں رہوں یا نہیں رہوں۔ 'ہنس' چلے گا۔ یہی میری یادگار ہوگا''
میرا گلا بھر آیا۔ دل تھرّا گیا۔ میں نے ضمانت کے روپے جمع کروا دیئے۔

آپ نے سمجھا شاید دھنو ضمانت نہ جمع کرایائے۔ منشی دیا نارائن جی نگم کو تار دیا۔ وہ آئے پہلے بڑی دیر تک انھیں پکڑے وہ روتے رہے۔ وہ بھی روتے رہے میں بھی روتی تھی۔ منشی جی بھی روتے تھے۔ منشی جی نے کئی بار رونے کی کوشش کی پر آپ بولے ''بھائی اب شاید دوبارہ ملاقات نہ ہو۔ اس وقت تم سے سب باتیں کہہ دینا چاہتا ہوں۔ تم کو بلوایا ہے۔ 'ہنس' کی ضمانت جمع کروادو۔''

میں بولی ''دھنو جمع کر چکا ہے۔''

وہ جس چیز کو چاہتے دل سے چاہتے۔ اگر وہ میرے تھے تو ادب کے بھی تھے۔ آج وہ نہیں ہیں۔ جن کاموں پر میں ان سے الجھتی تھی' نکتہ چینیاں کرتی تھی انھیں کی آج تعریف کرتے تھکی جا رہی ہوں اور انھیں سے مجھے پریم بھی ہے۔ مجھے اپنے سے زیادہ ان چیزوں سے پریم ہے جو ان کی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں بھی اپنے خون سے سینچ کر اس پودے کو ہرا رکھنا چاہتی ہوں جو انھوں نے لگایا تھا۔ میرا اپنا علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ میں لکھ نہیں پا رہی ہوں کہ میری ہستی کیا ہے۔ اپنے اندر ان دردوں کو میں اس لیے چھپائے ہوں کہ انھیں ہرا بھرا رکھ سکوں۔ جو لوگ اس ادب کو ہرا بھرا رکھیں گے وہ جیسے ہماری سیوا ہی کر رہے ہیں۔ یہی ان کی بھی سچی سیوا ہے۔ بس مجھے یہی کہنا ہے۔

مہاراجہ صاحب الور

سنہ ۲۴ کا زمانہ تھا۔ آپ لکھنؤ میں تھے۔ رنگ بھومی (چوگان ہستی) چھپ رہی تھی۔ ریاست الور سے راجہ صاحب کا خط لے کر پانچ چھ صاحبان آئے۔ راجہ صاحب نے اپنے پاس رہنے کے لیے آپ کو مدعو کیا تھا۔ راجہ صاحب ناول اور کہانیوں کے رسیا تھے۔ اور انھوں نے ۴۰۰ روپے ماہانہ نقد' موٹر کار اور بنگلہ دینے کی پیش کش کی تھی۔ سپری وار بلایا تھا۔ ان صاحبان کو یہ کہہ میں بہت باغی آدمی ہوں' اسی وجہ سے میں نے سرکاری نوکری چھوڑی ہے۔ راجہ صاحب کو خط لکھا۔

''آپ کا میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ میں نے اپنی
زندگی ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں

اسے آپ پڑھتے ہیں اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ جو
اعزاز مجھے دے رہے ہیں اس کے لائق نہیں ہوں۔ میں اتنے ہی کو اپنی
خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ آپ میرے لکھے کو توجہ سے پڑھتے ہیں۔ اگر ہو سکا
تو آپ کے درشن کے لیے کبھی حاضر ہوں گا۔

ایک ادب کا خدمت گار
دھنپت رائے''

میرے پاس آ کر بولے''الور کے راجہ صاحب نے مجھے بلایا ہے۔''

میں نے پوچھا''کس لیے۔''

آپ نے جواب دیا''مجھے پرائیویٹ سیکریٹری بنانا چاہتے ہیں۔''

''راجوں مہاراجوں کے یہاں جا کر کیا کیجیے گا؟''میں نے کہا''کیوں؟ موٹر ملے گی'۴۰۰ روپے نقد ملیں گے۔ بنگلہ ملے گا۔ اس میں برا کیا ہے؟''

''آپ کی کسی سے پٹے گی بھی۔''

''تم مجھے لڑاکا سمجھتی ہو؟''

''سمجھنے کی کیا بات ہے' سامنے دیکھنے کی بات ہے۔ گورکھپور میں انسپکٹر نے ذرا سا مغرور کہہ دیا تو آپ اس پر کیس چلانے کو آمادہ ہو گئے۔ مہوبے کا کلکٹر دھمکی دے رہا تھا کہ اگر مسلمانی راج ہوتا تو تمھارا ہاتھ کٹوا دیا جاتا تو آپ سے برداشت ہی نہیں ہوا۔ بھلا راجوں مہاراجوں سے آپ کی کیونکر پٹ سکتی ہے؟ غیر ممکن! ایک دن بھی وہاں نہیں گزار سکتے۔ آپ کے لیے سب سے بہتر ہے مزدوری۔ راجوں مہاراجوں کے یہاں وہی ٹھہر سکتا ہے جو ان کی جوتیاں سیدھی کرتا رہے۔ جسے تھوڑا سا بھی اپنی عزّت کا پاس ہو گا وہ راجاؤں کے یہاں نہیں ٹھہر سکتا آپ بولے''میری تو مرضی ہے۔ چلوں' کچھ دن تو اپنا بنگلہ موٹر کا شوق تو پورا کراوں۔ میری کمائی میں تو اس کی گنجائش نہیں۔''

میں ہنس کر بولی''یہ تو اسی طرح ہے جیسے کوئی عورت (ویشیا) اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے چکلے میں جا بیٹھے۔ پھر جس نے مزدوری کرنا ہی اپنا دین ایمان سمجھ لیا ہو اسے موٹر بنگلے کی چاہت کیسی؟

آپ بولے''مجھے چاہت نہ ہو تمھیں تو ہو سکتی ہے۔''

''مجھے اگر ان چیزوں کی خواہش ہوتی تو آپ سے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دینے کو نہ کہتی۔''

''اور اگر بچوں کی خواہش ہو تو۔''

میں جھنجھلا کر بولی' بچے اپنی خواہش خود اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر پوری کریں گے۔ پھر بچوں کو بھی آپ جیسا بننا چاہیے۔''

''اگر نہ بنیں تو مار مار کر بناؤ گی؟''

''اگر یہ ویسے نہ بنیں تو میں سمجھ لوں گی یہ میرے بچے ہی نہیں ہیں۔''

تب آپ ہنس کر بولے''میں پہلے ہی وعدہ بتا چکا ہوں۔''

''آپ کو مجھے چڑھانے میں مزہ آتا ہے؟''

''میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تمھاری خواہش ہو تو میں اسے بھی پوری کر دوں۔''

''آپ ناولوں کہانیوں کے کردار خوب تخلیق کر لیتے ہیں۔ پر مجھ کو پہچاننے میں اتنی غلطی کیوں ہے؟''

''ناول کہانیاں تو اپنی پسند کے مطابق بنتی ہیں مگر کسی آدمی کو اپنی پسند کے مطابق کیوں کر بنایا جائے؟ جبراً کسی کو کچھ سنانا بھی نہیں چاہیے۔''

''میں اپنی پسند کے الٹ آدمیوں کے ساتھ رہ ہی نہیں سکتی۔''

تب آپ بولے''میں مانتا ہوں کہ میں جو چاہتا ہوں' تم بھی وہی چاہتی ہو۔''

پریس میں کام کی زیادتی

اُسی سنہ کا ایک اور واقعہ ہے۔ (میں گاؤں میں تھی) کنوار کا مہینہ (ستمبر۔ اکتوبر) تھا۔ آپ کو پیچش ہو گئی تھی۔ دو مہینے بیت گئے اچھی ہونے ہی میں نہیں آتی تھی۔ دوا کے لیے جو پیسے دیتی انہیں پریس میں خرچ کر آتے اور ادھر ادھر کے غیر ذمے دار ویدوں سے دوا لیتے۔ دوا کھاتے کھاتے دو ڈھائی مہینے گزر گئے۔ طبیعت اچھی نہیں ہو رہی تھی۔

جب میں جان گئی صحت جلدی اچھی نہیں ہو گی تو میں نے کہا''چلیے آپ دیہات''

آپ بولے''پریس کا کام کون دیکھے گا؟''

''یہاں جب طبیعت اچھی نہیں ہو رہی ہے تو کیا کیجیے گا؟ میں نے کہا۔

آپ بولے ''مگر کام بھی مجھے بہت کرنا ہے۔''

میں نے جھونجھل کھا کر کہا'' کام جائے بھاڑ میں' ایک نہ ایک تو سدا لگا ہی رہے گا۔''

''کیا بھاڑ میں کام چلا جائے گا؟'' آپ نے کہا'' چھٹی تو اسے پورا کرنے ہی سے ہوگی۔''

جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے تو میں نے کہا'' آپ رہیے' میں خود دیہات جا رہی ہوں۔''

بولے'' میرے لیے سامان رکھ کر جا سکتی ہو۔''

''بچے میرے ساتھ جائیں گے سامان تو سب پڑا رہے گا۔''

باہر میرے جیٹھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بیٹی سے کہا'' جا کر بڑے بابو سے کہہ کہ مجھے بھی شام کو گھر لیتے چلیں۔''

بیٹی نے میرا پیغام انھیں پہنچا دیا۔ وہ شام کو آنے کا کہہ گئے۔

آپ جب پریس جانے لگے تو بولے'' سامان سب لیتی چلنا۔ میں بھی چلوں گا۔''

''آپ رہیے' میں نے کہا'' آپ کیوں جانے لگے۔''

آپ بولے میں سمجھتا تھا' میرے ایسا کہنے پر تم نہیں جاؤ گی۔''

میں نے کہا'' مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ میرے بنا یہاں نہیں رہ سکتے''۔

اس دن ہمارے جیٹھ ساتھ میں دو مزدور' ایک ٹھیلا' ایک تانگا لیے تین بجے ہی آ گئے اور سامان وغیرہ رکھوا کر ہمیں لوا لے گئے۔ اسی دن شام کو آپ بھی گاؤں کے گھر پہنچے۔ اگلی صبح روپے دے کر میں نے جیٹھ سے کہا کہ انھیں کسی اچھے ہومیو پیتھ کو دکھلا دیجیے۔

وہ دوا لائے۔ دو تین روز دوا کھانے پر ان کی طبیعت ٹھیک ہوتی نظر آئی اور وہ جلد ہی ٹھیک ہو گئے۔ اس عرصہ میں شہر کا آنا جانا برابر جاری رہا۔

ایک دن گھر سے چلے تو دھوپ تیز تھی۔ میں بولی'' دھوپ تیز ہے۔''

بولے'' تم سے مطلب! موت تو ہماری ہے۔''

مجھے ان کی اس بات پر جھنجھلاہٹ آ گئی۔ میں نے کہا'' خبردار اس سے آگے جانا نہ ہو سکے گا۔ آپ بیٹھیے میں پریس جا رہی ہوں۔ اور جو جو سامان وہاں سے آنے والے ہیں' بتا دیجیے میں لیتی آؤں گی۔''

آپ بولے ''چھوڑو جانے دو۔''

''میں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ آپ پھر وہی بات کہیں گے۔ میں یہ دھونس کیوں سہوں۔''

آپ بولے ''بھائی پھر سننا تو خوب ڈانٹ لینا۔ غلطی ہوئی۔''

''آپ یہاں آ کے اچھے ہوئے کہ نہیں یہ بتایئے۔ وہاں ہوتے تو روگ جیوں کا تیوں رہتا۔ مجھے بیماری نہیں پسند۔ روپیوں کا کیا ہے، ہوئے نہ ہوئے۔''

آپ بولے ''مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔''

''جتنا اپنے سے ہو سکے گا۔ اتنا ہی کیا جائے گا جب آپ کھاٹ پر پڑ جائیں گے تو کام کیسے چلے گا!''

''تو نہ جاؤں؟''

''دھوپ تیز ہے مت جایئے۔ کام تو ہوتا ہی رہے گا۔''

میں نے جوتے پیروں سے اتار کر رکھ دیے۔ آپ اسی جگہ چارپائی پر لیٹ گئے۔ پھر کوٹ اتار کر بولے ''اب خوش ہو؟''

میں نے جواب میں کہا ''بہت ٹھیک۔ آرام کیجیے۔

۱۹۲۴ء

سنہ ۲۴ کی بات ہے آپ بیدار صاحب کے یہاں پریاگ (الہ آباد) گئے ہوئے تھے۔ 'مادھوری' آفس کی کچھ کتابیں بورڈ میں منظور کرانے کے لیے گئے تھے۔ بیدار صاحب شراب خور تھے۔ خود پی' آپ کو بھی پلائی۔ وہاں سے لوٹے تو نشے میں چور تھے۔ اسی دن میرے کان کا پھوڑا پھوٹا تھا۔ میں اپنے کان میں روئی لگا کر سو گئی تھی۔ نہ معلوم آپ دروازے پر کب سے آواز دے رہے تھے۔ مجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔ جب بچوں کے کان میں آواز گئی تو دھنو' بیٹی کے ساتھ دروازہ کھولنے دوڑا۔ مجھے اس کی بھی خبر نہیں۔ بچوں کو دیکھ کر کتے کی سی آواز میں ڈانٹنے لگے۔ ان کے ڈانٹنے کی آواز میری کان میں آئی۔ میں نے پوچھا ''بیٹی' کتا کدھر سے آ گیا؟'' بیٹی بولی ''تم سن نہیں رہی ہو بابو جی آئے ہیں۔ مجھے اور بھائی کو ڈانٹ رہے ہیں بابو جی'' میں نے پوچھا ''کیا بات ہے؟'' بیٹی بولی ''بابو جی بڑی دیر سے آواز دے رہے تھے' ہم نے سنا نہیں'' میں بولی ''دیکھو بیٹی کیا بجا ہے؟'' اس نے کہا ''ڈیڑھ بجا ہے۔'' میں اٹھنے لگی۔ کہ چل کر انھیں پانی وانی دوں اور پوچھوں کہ بچوں کو اس طرح کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟

بٹی بولی ''تم نہ جاؤ' بابو جی شراب پیے ہوئے ہیں تمھیں بھی ڈانٹیں گے''۔

میں بولی ''یہ نیا نشہ سیکھا ہے۔''

مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں سو رہی۔ صبح اٹھی تو ان کا نشہ اتر چکا تھا۔ میں بولی ''بچوں کو اس طرح ڈانٹنا چاہیے۔؟''

بولے ''مجھے آدھ گھنٹے تک چلّانا پڑا تھا تمھیں خبر بھی ہے؟''

''سنتا کون؟ بچے رات بھر جاگتے رہتے''؟

''اگر بچے نہ جاگ سکتے تھے تو بچوں کی ماں تو جاگ سکتی تھی''

میں بولی '' مجھے کل ذرا سا آرام ملا۔ میں بھی سو گئی۔ پھر اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ شراب پی کر آئے ہیں تو میں معلوم ہونے پر بھی دروازہ نہیں کھولتی۔ آخر آپ نے شراب کیوں پی؟''

آپ بولے'' بیدار صاحب مانے ہی نہیں۔''

''آپ بچے تو تھے نہیں کہ بیدار صاحب نے زبردستی آپ کے منہ میں انڈیل دی۔ آئندہ اگر آپ پی کر آئے تو میں جاگتی ہوئی بھی دروازہ نہیں کھولوں گی۔''

''مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں وہیں سو رہتا۔''

''تو کیا آپ مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ میں وہاں شراب پیوں گا۔ ان بری لتوں میں آپ پھنستے کیوں جا رہے ہیں؟''

''وہ مانا نہیں۔''

''آپ کو منوانا چاہئے تھا اس سے۔''

''اس کے پھیر میں پڑتیں تو شاید تم بھی پی لیتیں۔''

''میں ایسوں کے پھیر میں پڑنے والی ہستی نہیں ہوں۔

''خیر اب نہیں پیوں گا'' انھوں نے کہا۔

مگر اس کے ۵'۶ روز کے بعد پھر انہی کے یہاں سے پی کر آئے۔ اس دن آٹھ بجے کے لگ بھگ ہی لوٹ آئے۔ رات کو دو بار قے ہوئی۔ میں تو اٹھی نہیں۔ میری بھاوج نے اٹھ کر پانی وانی دیا۔

انھوں نے ہی رات کو قے بھی صاف کی۔ صبح جب نشہ اترا تو بولے ''رات کو میری یہ حالت تھی۔ تم کہاں تھیں؟''

میں بولی ''میں ان عادتوں کے چکر میں پڑنے والی نہیں، میں اسی دن آپ سے کہہ چکی ہوں۔''

آپ بولے ''بے چاری دلہن نہ ہوتی تو مجھے پانی دینے والا کوئی نہیں تھا۔''

''میں اس کے لیے پہلے ہی بتا چکی ہوں۔''

''تمھارا دل بڑا سخت ہے۔''

''آج آپ نے سمجھا؟''

اس کے بعد سے انھوں نے کبھی شراب نہیں پی۔

ساہس (حوصلہ)

سنہ ۴۴ کی بات ہے میری پہلی کہانی 'ساہس' شائع ہوئی۔ اُسے میں نے ان سے چھپا کر لکھا اور چھپنے کو بھیجا تھا۔ اس زمانے میں چاند کے ایڈیٹر آر سہگل تھے۔ اس کہانی میں غلطیاں تھیں۔ انھوں نے میرا لحاظ کرتے ہوئے اسے درست کر کے چھاپا تھا۔ اس شمارے کی ایک کاپی انھوں نے مجھے بھیجی اور ان کے نام ایک مبارک باد کا خط جس میں لکھا تھا' آپ تو ناول کے شہنشاہ تھے ہی آپ کی دیوی بھی لکھنے لگیں اس کے لیے مبارک باد قبول کیجیے۔ حالانکہ دیوی جی نے مردوں ہی کو اس کہانی میں جوتا مارا ہے۔ پھر بھی میں انھیں بدھائی دے رہا ہوں۔ جہاں ہماری کمزوری انھوں نے بتا دی وہاں اس کا انجام بھی دکھایا ہے۔ آپ دونوں بدھائی کے مستحق ہیں'' آپ نے دفتر سے واپسی پر وہ شمارہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''آپ مصنفہ بھی بن گئیں۔ لو یہ تمھاری کہانی چھپ کر آئی ہے۔ کہانی لکھی تو اس میں بھی مردوں پر طنز۔ سارے دفتر میں لوگ شور مچا رہے تھے۔ سب کہہ رہے تھے مردوں پر حملہ کیا ہے۔''

میں بولی ''کہانی کیا تھی ایک مذاق تھا۔''

''مرد اپنی کھوپڑی سہلا رہے ہیں تم اُسے مذاق بتا رہی ہو۔''

میں نے کہا جو مرد اس طرح کا برتاؤ کرتے ہوں گے وہی اپنی کھوپڑی سہلا رہے ہوں گے۔ سبھوں کو نہیں کھلے گی۔ مردوں کو چاہیے کہ ایسی حرکت ہی نہ کریں جو کھوپڑی سہلانی پڑے۔''

''مگر تم پھر بھی باز نہیں آؤ گی۔''

''باز آتے رہے ہیں۔ کب تک باز آتے رہیں۔''

اس کہانی کے چھپنے کے چار پانچ مہینے بعد ایک پنجابی صاحب میرے یہاں آئے اور ان سے بولے'' کیا آپ نے یہ کہانی خود لکھ کر دیوی جی کے نام سے چھپوائی ہے۔؟''

آپ بولے'' میں ویسی کہانی لکھ سکتا ہوں؟''

وہ صاحب بولے اس کہانی کا جواب نس کی چال چلا تو کوآنام سے ایک صاحب لکھ رہے ہیں۔''

آپ بولے'' دیکھیے ان کی ایک کہانی میرے پاس اصلاح کے لیے آئی ہے۔ آپ اطمینان کر سکتے ہیں کہ میں ان کے لیے نہیں لکھتا'' اور یہ کہہ کر کہنے لگے'' ہمارے یہاں کے آدمیوں کے دل بہت تنگ ہیں۔ بنا پوری بات جانے ہی اوٹ پٹانگ بک دیتے ہیں۔ اسی پر غور کر لیا ہوتا کہ ایسی کہانی بھلا ایک مرد لکھ سکتا ہے؟''

جب وہ صاحب چلے گئے تو آپ مجھ سے بولے'' تم کہانی کیا لکھنے لگیں کہ میری جان کو آفت کر دی۔ تمھیں سوجھی کیا تھی آرام سے رہ رہی تھیں مفت کی بلا اپنے گلے لگا لی۔ آگے بہتر یہی ہے کہ مت لکھو۔''

''اب ہٹنے سے تو اور کام بگڑ جائے گا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ چوری پکڑی گئی تو چین پڑا۔ خود تو عزت کما ہی رہے تھے اپنی بیوی کی عزت کے بھی بھوکے تھے'' میں نے کہا تس پر آپ بولے'' تم اس میں سکھ کیا پاتی ہو؟ رات دن بیٹھے بیٹھے اپنا خون جلاتی ہو۔''

''اگر یہ خون جلانا ہی ٹھہرا تو آپ اپنا خون کیوں جلاتے ہیں'' میں نے جواب دیا۔ اپنے خون کو میں آپ کے خون سے مہنگا نہیں سمجھتی۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ لکھنا بھی ایک نشہ ہے شاید ویسی ہی میں مجھے بھی نشہ ہو گیا ہے۔''

آپ بولے ''ناحق خود کو پریشانی میں ڈال رہی ہو۔''

میں نے کہا'' ان کے ڈر سے میں لکھنا چھوڑ دوں؟ جب لوگوں کو حقیقت معلوم ہو جائے گی تو خود جھوٹا دوش لگانے پر پچھتائیں گے۔''

جب بنّو کھو گیا تھا

سنہ ۲۴ کی بات ہے بنو ساڑھے تین سال کا تھا۔ ایک دن آپ چار پائی لینے بازار جا رہے تھے۔

دھنو کو ساتھ لیے بنو بھی چل پڑا۔ دونوں کو نیچے چھوڑ کر آپ دکان کے کوٹھے پر چڑھے تو دھنو خود اوپر پہنچ گیا اور نیچے بنو اکیلا رہ گیا۔ ساتھ میں کسی کو نہ دیکھ کر وہ ادھر ادھر ہو گیا۔ آپ نیچے اترے تو اسے نہ دیکھ کر گھبرا گئے۔ آس پاس کے آدمیوں سے پوچھنے لگے ''کوئی لڑکا تو آپ نے نہیں دیکھا؟'' لوگوں نے کہا ''ہم نے نہیں دیکھا۔'' آپ گھبرا کر دھنو سے بولے ''بیٹا گھر جا' پر اپنی ماں سے نہ بتلانا کہ بنو کھو گیا ہے۔ جب دھنو گھر پہنچا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ گلا بھرا ہوا تھا میں نے پوچھا ''تمھارے بابو جی بنو کو لیے ہوئے کہاں گئے؟''

دھنو روتا ہوا بولا ''بنو کھو گیا ہے۔ اسے بابو بھی ڈھونڈ رہے ہیں۔'' میں بولی ''کھویا کیسے''؟ دھنو نے پورا قصہ سنایا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد آپ بنو کو لیے آ گئے۔ میں نے پوچھا ''یہ لڑکا کہاں گم ہو گیا تھا؟''

آپ بولے ''لڑکا اگر آج نہ ملا ہوتا میں زندہ نہ ملتا۔ جب دھنو اور میں دکان کے اوپر چڑھ گئے تو یہ گھومتے گھومتے ایک دکان کے پیچھے پہنچا اور وہیں زور زور سے رو رہا تھا۔ میں خود رو ہانسو ہو رہا تھا کہ بچے کو ڈھونڈنے کہاں جاؤں؟ میری تو ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کیا جواب تمھارے سامنے دوں گا ''آج یہ اگر نہ ملتا تو میں بھی گھر نہ لوٹتا۔''

''کیسے آپ نے دیکھا اسے؟'' میں بولی۔

بولے ''میں چاروں طرف ڈھونڈ رہا تھا اور کان لگائے تھا کہ کہیں سے رونے کی آواز تو نہیں آ رہی ہے۔ یہ وہاں کھنڈر میں کھڑا ابری طرح رو رہا تھا۔ اس کے رونے کی آواز مجھے سنائی پڑی۔ میں وہاں گیا۔ یہ تو کھڑا کھڑا وہاں رو ہی رہا تھا اسے دیکھ کر میں بھی رو پڑا۔ میں نے اسے گود میں لے لیا۔ بڑی دیر کے بعد اس کی سسکیاں بند ہوئیں۔''

اس دن کے بعد آپ کبھی چھوٹے بچے کو لے کر بازار نہیں گئے۔

کہاری کا چھوٹا بچہ

میرے دونوں لڑکے الہ آباد میں پڑھ رہے تھے۔ ان دونوں کو الگ الگ خط لکھنے کی تاکید تھی۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے' کہیں دھنو بنو پر حکومت نہ کرتا ہو۔ میں جواب میں کہتی' تو اس میں برا کیا ہے۔ وہ اس سے بڑا ہے۔ آپ بولے ''تم نے سمجھا نہیں۔ بچوں کے دل مرجھا جاتے ہیں اور اپنے باپ کے لیے کڑھتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ اپنی ذمہ داری لڑکوں پر کیوں چھوڑی جائے۔ کیونکہ انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ جائز ناجائز سب طرح کا راج کرتے ہیں۔ پریم کا راج تو بہت بھلا ہے۔ مگر وہ

کس میں ہے؟ آج کل کولج میں پہنچتے ہی لونڈوں کا جھوٹا فخر جاگ اٹھتا ہے۔ اسی لیے دونوں کو آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا ''تو اس سے کیا حکم چلانے کی عادت رک جائے گی؟''

''کیوں نہیں رکے گی؟ اسے وہ تکلیف دے گا تو مجھے وہ (بنو) لکھے گا۔ میں پوچھوں گا۔''

میں بولی ''بہت سے باپ تو اپنی ذمے داری چھوڑ بیٹھتے ہیں۔''

''وہ نالائق ہوتے ہیں۔ کوئی لائق باپ کب اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈالے گا۔ اگر اس میں ذمہ داری اٹھانے کی سکت نہ ہو تو کسی کو دنیا میں لانے کا کیا حق ہے؟''

''دنیا میں آدمیوں کا آنا کب رکتا ہے۔''

''تو پھر یہ سمجھنا چاہیے کہ ایسے نالائقوں کی دنیا میں کمی بھی نہیں۔ سب کچھ انسان کرتا ہے عزت کے لیے۔ جب اپنے ہی گھر میں عزت نہ حاصل کر سکا تو کیا پایا؟ مجھے اُن باپوں سے ہمدردی نہیں ہے جو دوسروں پر اپنی ذمہ داری ڈال دیتے ہیں۔''

میں بولی ''دنیا میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد کوئی دیکھنے آتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟''

''زندگی ہی میں مر جانا تو اچھا نہیں۔''

''سبھی اسی طرح سوچنے لگیں تو کیسے کام چلے''۔

وہ اپنے بچوں کو خود پڑھاتے تھے۔ ٹیوٹر رکھنا انھیں پسند نہیں تھا۔ دو تین گھنٹے کا وقت وہ روزانہ لڑکوں کو پڑھانے میں لگاتے۔ وہ بچوں کو آدمی بنانا چاہتے تھے۔

ایک بار کی بات ہے۔ میں بنارس میں تھی۔ میری کہاری (برتن دھونے اور پانی بھرنے والی) کا چھوٹا بچہ آگ سے جل گیا۔ اس کے سارے بدن پر مرہم پتا ہوا تھا۔ کپڑے بھی گندے ہو گئے تھے۔ میرا چھوٹا لڑکا بنو اسے کہیں باہر پا گیا اسے دیکھ کر بنو کو دیا آئی اور وہ اس بچے کو دونوں ہاتھوں کا گھیرا بنا کر زینے پر سے اندر لایا۔ اس وقت بابوجی میرے پاس بیٹھے تھے۔ بنو بولا ''اماں اسے کچھ کھانے کو دو۔'' اس بچے کا جسم دیکھ کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ڈری کہ کہیں اسے دھکا نہ لگ جائے' نہیں تو سارا بدن لہولہان ہو جائے۔ بنو کا اس بچے پر پریم دیکھ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ مجھ سے بولے ''جلدی دو نا کچھ کھانے کو۔'' میں نے اسے مٹھائی اور پھل دیے اور بنو سے بولی ''اسے اب کیسے واپس پہنچاؤ گے؟ ذرا بھی دھکا لگا تو اس کا جسم رنگ جائے گا۔ تم باہر ہی کچھ لے جا کر دے سکتے تھے۔''

بنو بولا ''میں اسے آسانی سے لے جاؤں گا۔'' اسی طرح وہ بچے کو نیچے پہنچا آیا۔ آپ بولے ''یہ لڑکا بڑا رحم دل معلوم ہوتا ہے۔ نجانے کیسے اسے وہ اوپر لایا۔ میری بھی ہمت اسے لانے کی نہ پڑتی۔ میں تو چوٹ لگنے سے ڈرتا۔ بھگوان اسے زندگی دے۔ تم دیکھنا تمھارا نام یہ روشن کرے گا۔''

پھر بولے ''لڑکا گھناؤنا بھی تو بہت تھا۔ بس اس کی ماں ہی اسے چھو سکتی تھی۔''

میں نے کہا ''گدھا ہے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ اس میں روح ہے'' انھوں نے کہا۔

یوں تو وہ سبھی کو پیار کرتے تھے مگر چھوٹے کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ کوئی بچہ بیمار پڑتا تو انھیں بڑی چنتا ہو جاتی۔

ایک بار بنو بیمار تھا۔ اسے چیچک نکلی تھی۔ اسے کوٹھے پر لے جانا تھا۔ تیرہ برس کے بچے کو گود میں لیے لیے آپ زینہ چڑھ رہے تھے تو خود بھی گرنے کو ہوئے۔ میں پیچھے پیچھے تھی۔ دونوں کو سنبھالتی ہوئی بولی ''بچے کو اتارو'' اور بنو سے کہا ''بیٹا خود چلو؟''

آپ بولے ''دونوں گرتے جو تم نہ بچاتیں۔ کیسے تم پہنچیں؟''

''مجھے پہلے سے ہی اس کا خطرہ تھا۔''

بنو چیچک کی حالت میں، رات میں اٹھ کر میری چارپائی پر چلا آتا۔ ایک دن اسے سمجھا رہے تھے ''ماں کے ساتھ مت سویا کرو، اگر انھیں بھی ماتا نکل آئی تو بڑی مصیبت ہوگی۔ کوئی پانی دینے والا بھی نہیں ہوگا۔'' آپ دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میں وہاں پہنچ گئی۔ میں نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ میں بولی ''آپ بھی خوب ہیں۔ یہ بیماری مجھے نہیں ہوگی۔''

آپ بولے ''یہ چھوت کی بیماری ہے۔ تمھیں کیوں نہیں لگ سکتی؟''

میں بولی ''تو آپ بھی تو پرے رہیے۔ آپ کو بھی تو پکڑ سکتی ہے۔''

''مجھے تمھاری بیماری کی زیادہ فکر ہے کیونکہ اگر تم ایک دن کے لیے بھی پڑ جاؤ تو میرا کیا حال ہوگا سوچو تو۔''

''میں اپنے کو اتنا اہم نہیں سمجھتی ہوں۔''

''تمھیں کیا'' آفت تو مجھ پر آئے گی۔''

میں بولی ''خیر میں بیمار نہیں پڑوں گی۔ آپ گھبرائیے نہیں۔''

''مجھے اسی کی فکر ہے کہ دونوں ہا تک باری پوری کر چکے۔اب کہیں تم بھی نہ پڑ جاؤ۔''

میں نے کہا ''بڑے آدمیوں کو کم نکلتی ہے۔''

گھر میں کوئی بیمار پڑے تو میں انھیں اس کے لیے زیادہ فکر مند نہیں ہونے دیتی تھی کیونکہ میں انھیں کسی بھی روگی کی اصلی حالت نہیں بتاتی تھی۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج تو میں خود کر لیتی تھی اور انھیں نہیں بتاتی تھی کیونکہ وہ بہت جلد گھبرا جاتے تھے۔

وہ اکثر مجھ سے کہتے کہ جس دن میں کچھ لکھتا پڑھتا نہیں میں سمجھتا ہوں میری زندگی کا وہ دن رائگاں گیا۔

جہاں تک ہوسکتا ہے میں انھیں گھر گرہستی سے الگ رکھتی۔ وہ جب تک خود زیادہ بیمار نہ ہو جاتے ان کا لکھنا پڑھنا جاری رہتا۔ ہاں میں جب زیادہ بیمار پڑ جاتی تب ان کا قلم رک جاتا۔ یہاں تک کہ ایک بار میں چھ مہینے تک بیمار رہی آپ ان دنوں روزانہ ایک لائن بھی نہیں لکھتے تھے۔ میں ان دنوں گاؤں میں تھی۔ گاؤں کی عورتیں ہر وقت میرے پاس بیٹھی رہتیں۔ آپ باہر بیٹھے بیٹھے جھنجلاتے۔ عورتوں کی وجہ سے اندر آ نہیں سکتے تھے۔ اور باہر طبیعت لگتی ہی نہیں تھی۔ مجھ سے اکثر پوچھتے یہ عورتیں تمھیں کیوں گھیرے بیٹھی رہتی ہیں؟''

''تو کیا برا کرتی ہیں۔'' میں نے کہا ''بے چاری اپنا کام دھندا چھوڑ کرآتی ہیں' میرا کیا بگڑتا ہے۔''

''آپ بولے میری طبیعت باہر نہیں لگتی۔''

''آپ اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟ آخر کہانیوں کا اتنا سخت تقاضہ رہتا ہے۔ اسے پورا کیوں نہیں کرتے؟''

''میں سب کے تقاضے پورے کر چکا ہوں۔ تمھاری طبیعت ٹھیک ہو جائے پھر لکھوں گا۔ نہیں تو لکھنا بھاڑ میں جائے۔''

میں نے کہا ''میں کیا مری جا رہی ہوں۔''

''تمھارے صحت یاب ہونے پر میں پہلے کی طرح لکھا کروں گا۔ لوگوں کا اصرار ہے کہ یہاں علاج کے لیے لائیے مگر تم چلتی ہی نہیں ہو۔''

مجھے سنگرہنی (کبھی دست، کبھی قبض، پیچش) تھی۔ ان سے تو ان کے گھبرانے کے خوف سے بتا نہ سکی

لیکن مجھے لگتا تھا کہ اس بار نہیں بچوں گی۔ اس لیے میں باہر جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ ان سے بولی
''دوا تو یہاں ہو رہی ہے، وہاں جانے سے کیا فائدہ۔''

''مگر اچھا کیا ہو رہا ہے اچھے ہونے کے آثار مجھے نہیں دکھائی دے رہے ہیں۔''

میں بولی ''کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ مان لو میں مر ہی جاؤں تو کون کوئلے کی ناؤ ڈوب جائے گی!
بیٹی اور دھنو، سیانے ہیں ہیں، بنو کی پرورش کر لینا۔''

اس پر آپ آنکھوں میں آنسو لیے بولے ''کوئلے کی ناؤ تو نہ ڈوبے گی پر میں ڈوب جاؤں گا۔''

ان کے آنسو دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔ اپنے کو سنبھالتے ہوئے بولی ''میں نے تو مذاق کیا تھا۔ آپ
سچ مان گئے۔''

تم کتنا ہی چھپاؤ، مگر مجھے تو خدشہ ہے۔''

''نہیں بالکل نہیں چھپا رہی ہوں۔ اچھی ہو جاؤں گی۔''

ان دنوں وہ ناشتہ پانی خود ہی بناتے تھے۔ جب میری طبیعت کچھ کچھ اچھی ہونے لگی تو میرے
بھائی آ کر اپنے ساتھ لوا لے گئے۔ آپ بھی ساتھ گئے اور دو مہینے وہاں رہے۔ جب میں کافی ٹھیک
ہو گئی تو میرے بھائی نے آپ سے کہا بہن کو چھوڑ جائیے میں انھیں دیہات لے جاؤں گا وہاں کی
آب و ہوا انھیں موافق آئے گی۔

آپ بولے ''دیہات پہنچا دو مگر دیکھ بھال میں کوتاہی نہ ہو۔ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔''

میں نے کہا ''اس سے آپ بے فکر رہیے۔ جب تک آپ کے پاس تھی تب تک آپ کی ڈیوٹی تھی۔
اب بھائی کی ڈیوٹی ہے۔''

آپ بولے ''میری ڈیوٹی سدا ہے۔ تمھارے بھائی شریف ہیں اس لیے ان کی ڈیوٹی لگا رہی ہو۔''

چھوٹے بھائی پاس ہی بیٹھے تھے بولے ''اس میں شرافت کی کیا بات ہے۔ ہمارا ان کا خون ہی
ایک ہے۔ ہم لوگوں کو آپ نے خبر ہی نہیں دی''۔

آپ بولے ''میں سمجھتا تھا آپ کو خبر ہوگی۔''

بھائی بولے ''بالکل خبر نہیں تھی۔ جیسے ہی خبر ملی میں دوڑا آ گیا۔''

اس کے بعد آپ بنارس لوٹ گئے۔

میں نے سب جیجا کو دے دیے

۱۹۲۴ کی بات ہے ہم لکھنو میں تھے۔ میری سب سے چھوٹی بھانجی کی شادی تھی۔ بنو کو خون کے دست آرہے تھے۔ وہاں جانے کی پوری تیاری کر چکے تھے۔ آپ شش و پنج میں پڑے تھے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھ سے بولے ''بتاؤ کیا کروں؟ بنو کی یہ حالت ہے اور وہاں جانا بھی ضروری ہے۔'' میں نے جواب دیا ''آپ نہ جائیں تو اچھا ہے'' آپ بولے 'بہن مر چکی ہے۔ تینوں لڑکیاں روئیں گی۔ ایک تو ماں نہیں دوسرے میں بھی وہاں نہ پہنچوں تو غضب ہو جائے گا۔ لڑکیوں کے رونے کا سوال آتے ہی خود ان کا گلا بھر آیا۔ میں بولی'' آپ جائیے۔ جو ہوگا میں دیکھ لوں گی''۔

آپ گئے تو لیکن دھیان بنو کی طرف لگا رہا۔ چوتھے دن جب لکھنو لوٹے تو بنو کی طبیعت کو سدھرتے پایا۔ بنو کو دیکھ کر بولے ''بھگوان اچھا ہی کرتا ہے۔''

میں نے کہا'' آپ بھگوان کی اپاسک (پجاری) کب سے بن گئے؟''

آپ بولے'' دیکھو بنو کتنا بیمار تھا۔ بے چارہ اچھا ہو گیا''۔

میں نے کہا'' شادی ٹھیک ہو گئی؟''

''ہاں شادی تو ہو گئی'' آپ نے کہا' مگر لڑکیوں کا بدائی بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ چھوٹی بچی کو بدا کر ہی لے گیا۔ ایک تو اس گھر میں خود نہیں جایا جاتا۔ دوسرے لڑکیاں رونے لگتی ہیں تو عجیب حالت ہو جاتی ہے۔''

میں بولی'' مرزا پور ہی میں تو شادی ہوئی ہے''۔

کہنے لگے'' کچھ بھی ہو برداشت نہیں ہوتا۔''

میں بولی'' جو رسمیں ادا کرنے کو میں نے کہا تھا انھیں پورا کر دیا؟''

''بھائی یہ سب تو مجھے نہیں آتا'' آپ بولے'' میں نے سب جیجا کے سپرد کر دیے۔''

۲۳ راگست سنہ ۲۴ کا واقعہ ہے' مقام لمہی گاؤں۔ آپ کسی کام سے لکھنو گئے ہوئے تھے۔ میں گھر پر ہی تھی۔ ہمارے یہاں ان کے چھوٹے بھائی کے لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اور اس کے کچھ ہی مہینے پہلے دونوں الگ ہوئے تھے۔ اور کچھ آپس میں کبیدہ خاطری بھی ہوئی تھی جس روز بچہ ہونے کو تھا اسی رات مجھے خبر ہوئی اور صبح دس بجے بچہ پیدا ہوا۔

میرا نوکر روزانہ رات کو گھر چلا جاتا تھا۔ چونکہ مجھے شام کو ہی خبر ہوگئی تھی اسی روز میں نے اس خیال سے اسے روک لیا تھا کہ رات کو دائی بلانے کون جائے گا۔ خیر صبح ہمارے جیٹھ جی نے نوکر کو بھیج دیا۔ دائی تو چھ بجے آ گئی مگر نوکر غائب رہا۔ جب ۸ بجے کے قریب وہ پلٹا تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم اب تک کہاں تھے؟''

نوکر نے جواب دیا ''بڑے بابو نے دائی بلانے کو بھیجا تھا۔''

میں بولی ''دائی تو چھ بجے آ گئی' تم کہاں تھے'' پھر میں نے ڈانٹ کر کہا ''تم اتنے بڑے گنوار ہو کہ ہمارے گھر میں ذرا سا پانی بھی نہیں ہے۔''

نوکر خاموشی سے گھڑا لے کر نیچے چلا گیا۔ میری ڈانٹ کو نیچے جیٹھ جی اپنے دروازے پر سن رہے تھے۔ انھوں نے الٹا مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا اور جہاں تک ان سے بن پڑا میرے اوپر خوب گرجے۔ مجھے بھی غصہ آ رہا تھا مگر اس ڈر سے کہ میں بھی کچھ نہ کہہ بیٹھوں اپنے دونوں کانوں کو بند کیے بیٹھے رہی۔ مجھے رونا بھی آ رہا تھا کیونکہ میں بے گناہ تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ میں کسی کی ڈانٹ پھٹکار سننے کی عادی نہ تھی۔ کئی گھنٹے وہ مجھ پر برستے رہے۔ اس کے بعد وہ تو خاموش ہو گئے لیکن میں دن بھر ہیجان کی حالت میں رہی۔

کوئی چار بجے وہ لکھنؤ سے آئے۔ دن بھر روتے رہنے سے میرے سر میں درد بھی تھا۔ مجھ کو دیکھ کر بولے ''تمھاری طبیعت کیسی ہے؟'' میں بولی ''سر میں درد ہے'' آپ بولے ''کیا دھوپ میں گھومی ہو؟'' ان کا یہ پوچھنا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے میں کمرے کے اندر چلی گئی۔ مگر ان کو معلوم ہو گیا کہ کوئی ایسی ہی بات ہے جس سے یہ رنجیدہ ہے۔''

میرے پیچھے وہ بھی اندر آ گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگے۔ ان کا پوچھنا غضب ہو گیا' میں رو پڑی بولے '' سچ بتاؤ تمھیں ہوا کیا ہے؟ جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنی قسم بھی کھلائی اور کہا کہ بولو بات کیا ہے؟ تب میں نے سارا قصہ اُن کے آگے اگل دیا۔ وہ بولے۔

''میں ابھی جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ آخران کو حق کیا ہے کسی کے گھر کی عورتوں پر بگڑنے کا؟

اس پر میں نے کہا ''یہ ان کی کچھ عادت ہی ہے۔ بھابھی پر بھی تو بگڑا کرتے ہیں۔''

بولے ''بھابھی پر بگڑیں۔ بھابھی پر ان کو بگڑنے کا حق ہے۔ وہ ان کی بیوی ہیں' لیکن دوسروں کی بیوی پر بگڑنے کا انھیں کیا حق ہے؟''

''جانے دیجیے'' میں نے کہا عادت کی کوئی دوا نہیں ہوتی۔''

آپ بولے ''نہیں میں ان کو سمجھا دوں گا۔''

میں نے کہا ''میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں' ان سے کچھ نہ کہنا نہیں تو وہ کہیں گے آتے دیر نہیں ہوئی کہ لگائی بجھائی کر دی۔ اپنے گھر میں سبھی جس طرح جی چاہتا ہے کہتے ہیں۔ کہنا کوئی جرم نہیں ہے۔ وہ پھر اسی طرح تم پر بگڑیں گے۔''

''اور جب ہی بگڑتے ہیں جب میں گھر پر نہیں ہوتا ہوں۔ انھیں مجھ پر بگڑنے کا حق ہے' تم پر نہیں۔ میں ان لوگوں کی عورتوں پر برسنے نہیں جاتا۔ اور تمھیں اسی وقت کہہ دینا چاہیے تھا کہ نوکر اپنے آرام کے لیے رکھے ہیں دوسروں کے لیے نہیں۔'' انھوں نے کہا۔

میں بولی ''یہ میں کیسے کہہ سکتی ہوں۔ آخر وہ بڑے ٹھہرے۔''

''جب بڑا اپنا بڑپّن نہیں رکھتا ہے تو ہم بھی مجبور ہیں۔''

میں نے پھر کہا ''میں ہاتھ جوڑتی ہوں' ان سے کچھ مت کہیے۔ تم کو میرے سر کی قسم۔''

آپ بولے ''اگر یہی بات ہے تو تم نے مجھ سے کہا ہی کیوں؟''

''میں تو نہیں کہنا چاہتی تھی مگر آپ ہی نے اپنی قسم کھلا دی۔''

آپ بولے ''تو تم مجھ ہی سے شیر ہو' اور کسی سے نہیں۔''

میں بولی ''شیر ہونے کی بات نہیں ہے۔ وہ مجھے ڈانٹ رہے تھے۔ پاس پڑوس کے آدمی سن رہے ہوں گے میں بولتی یا آپ اگر کچھ کہیں گے تو سننے والے کہیں گے دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ یہ تو اچھا نہیں ہے۔ انھیں ہی بڑا ہو جانے دیجیے۔ یہ باتیں کہنے سننے کو باقی رہ جاتی ہیں۔''

وہ بولے ''تو میرے ڈانٹنے پر تمھیں کیوں غصہ آئے گا؟ اب میں بھی ڈانٹ پکار کیا کروں گا؟''

''آپ کا ڈانٹنا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

بولے ''آخر میں بھی عمر میں تم سے بڑا ہوں۔''

میں بولی ''بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ آپ کا ڈانٹنا میں نہیں سہہ سکتی۔ اور پھر میں جب قصور ہی نہیں کروں گی تو پھر مجھے ڈانٹے گا ہی کون؟''

''تو تم نے صبح کیا قصور کیا تھا جس کے لیے تم پر ڈانٹ پڑی تھی۔'' انھوں نے کہا۔

گلپ سمیلن، رائے بریلی (کہانی کانفرنس)

سنہ ۲۵ء کی بات ہے، شاید فروری کا مہینہ تھا اور ہم لکھنؤ میں تھے۔ رائے بریلی کے اسکول میں گلپ سمیلن تھا۔ لڑکوں نے آپ کو چیئرمین (سبھاپتی) منتخب کیا۔ مجھ سے ایک دن کا وعدہ کر کے آپ وہاں گئے، لیکن ایک دن کی جگہ انھیں وہاں چار دن لگ گئے۔ چوتھے دن جب لوٹے تو میں ان پر برس پڑی، آپ جہاں جاتے ہیں وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آپ کو یہ خیال نہیں آتا کہ آپ کی آنے میں دیر کا گھر والوں پر کیا اثر پڑتا ہوگا۔ آپ تو وہاں موج کر رہے ہوتے ہیں یہاں میں پریشان ہوتی ہوں کہ آخر بات کیا ہے کہ آئے نہیں۔"

آپ بولے "تم مجھ سے ناانصافی کر رہی ہو کہ مجھے کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ میں خود یہ سوچ کر پریشان تھا کہ تم پریشان ہو رہی ہوگی۔ مگر میں مجبور تھا۔ جاتا تو کہنے کو میں ایک کام سے ہوں مگر جہاں جاتا ہوں وہاں والے چار کام میرے لیے پہلے ہی سے تیار کر رکھتے ہیں۔ اب جب میں گیا ہی ہوں تو بلانے والوں سے یہ کہتے بن نہیں پڑتا کہ میں کسی طرح نہیں رکوں گا۔ بھاگ کھڑا ہوں گا، اور اگر میری جگہ پر تم ہوتیں تو شاید میری طرح تم بھی ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتیں۔ میں خود ہی گھر سے نہیں نکلنا چاہتا پر کیا کروں فرض کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ میں تو کبھی کبھی خود سوچتا ہوں کہ اگر میں بیمار رہوں تو سب سے اچھا رہوں۔ میری اس کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ مگر کیا کروں گھر پر ٹھہرنا بھی تو نہیں ملتا۔ اس پر تم کہتی کہ میں باہر موج کرتا ہوں۔ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ قلم دوات ہو، کاغذ ہو، اور تم اور ہم ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ دس بیس برس کے لیے اسی کمرے میں کوئی بند کر دے تو میں باہر جانے کا ایک بار بھی نام نہ لوں۔"

میں بولی "عورتوں کی طرح گھر میں رہنا پڑے تو معلوم ہو، ابھی تو جہاں ہوتا ہے گھومتے ہی رہتے ہیں۔"

بولے "اچھا تم ہی بتاؤ جب تک مجھے کوئی باہر کا کام نہ ہو اسی شہر میں کہیں باہر جاتا ہوں؟ اور جس کو تم موج اڑانا کہتی ہو میں اس سے ہمیشہ جلد سے جلد پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں جیسے کوئی قیدی سے قید چھوٹتے ہی میں گھر کی طرف بھاگتا ہے۔ اس طرح میں بھی بھاگتا ہوں۔ میں اپنے دوستوں میں گھر گھسو (گھر گھسنا) مشہور ہوں۔"

" یہ تو سب تمھارے کہنے کی باتیں ہیں۔ جب کانپور میں تھے تب آپ کبھی دس کے پہلے گھر نہیں آتے تھے۔"

آپ بولے ''جب میں دس کے پہلے کبھی گھر نہیں آتا تھا تب تمھی کون بیٹھی میری انتظاری کر رہی ہوتی تھیں! زیادہ تر تو تم ان دنوں اپنے گھر رہتی تھیں یا کانپور میں بھی رہتی تھیں تو شاید میری زیادہ فکر تمھیں نہیں رہتی تھی۔ تم تھوڑی بھی میری فکر کرتیں تو شاید میں گھر سے باہر نکلنے کی قسم کھالیتا۔ تمھارے اس رویے پر بھی مجھے اگر ۲۴ دن کا دورہ کرنا پڑتا تو مشکل سے ۱۴ دن کا دورہ کر کے گھر لوٹ آتا تھا اور ۱۵ دن میں کانپور کے آس پاس ہی دورہ کرتا تھا۔ دور کے گاؤں میں جاتے جیسے میری نانی مرتی تھی۔ اس پر بھی تمھاری شکایت!''

میں نے کہا ''جب میں تمھاری پرواہ نہیں کرتی تھی تو پورا دورہ کیوں نہیں کرتے تھے؟''

وہ ہنسے اور بولے ''تم بے وقوف تھیں جو میری پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ میں تو سمجھدار تھا اس لیے تمھاری پرواہ بھی کرتا تھا اور تمھیں چاہتا بھی تھا۔ تم تو ہمیشہ کی پاگل ہو؟''

''میں پاگل ہوں یا بے وقوف ہوں ان سب باتوں کو جانے دو'' میں نے کہا ''یہ بتاؤ تم نے مجھے دو تین دن پریشان کیوں کیا؟''

بولے ''پاگل رام سنو۔ مجھے کئی جگہ لوگ پکڑ لے گئے۔ جب کہیں پہنچ جاتا ہوں تو سب کو ضرورت نکل آتی ہے۔ میں خود پچھتاتا تھا اور پریشان تھا کہ تم پریشان ہوتی ہوگی۔ اس سے کہیں بہتر تو یہ ہوگا میں جہاں جایا کروں تم میرے ساتھ چلا کرو۔ تم کو بھی شانتی ملے گی اور شاید اس سے زیادہ میں خود خوش رہوں گا۔''

آج انھیں باتوں کو سوچتی ہوں اور بیٹھی بیٹھی افسوس کرتی ہوں۔ سب باتیں تو بھول گئیں اور بیت گئیں ہاں ایک بات مجھے یاد ہے کہ میں پاگل ہوں اور شاید مرتے دم تک مجھے یاد رہے گا کہ میں پاگل ہوں کیونکہ ان کو تو قید خانے میں بھی قلم دوات کاغذ کی اور میری ضرورت تھی۔ مگر میں تو پاگل پنے کی نشے میں ایسی پاگل ہوں کہ سب کچھ لکھ کر بھی جیوں کی تیوں بیٹھی ہوں۔

موٹے رام شاستری

سنہ ۱۹۲۶ کا واقعہ ہے۔ آپ 'مادھوری' کی ادارت کر رہے تھے۔ آپ تھے اور پنڈت کرشن وہاری مشر تھے۔

آپ نے 'موٹے رام شاستری' نام کی ایک کہانی لکھی۔ اس کہانی پر ایک شاستری مہاشے (پنڈت جی) نے دونوں پر کیس دائر کر دیا۔ دونوں نے پانچ پانچ سو روپے کی ضمانت داخل کی۔

آپ لوگوں کے ساتھ وشنو نارائن بھی تھے وہ 'مادھوری' کے مالک تھے اور کہانی سے خوش تھے۔ تاریخ کے دن وہ بیرسٹر دہرہ دون سے آتے تھے۔ جونو' نوسو روزانہ لیتے تھے۔ میرے بھائی اور بہنوئی بھی جاتے تھے۔ کانپور کے سارے وکیل اور بیرسٹر تاریخ پر آجاتے تھے۔ کچہری لوگوں سے کچھا کھچ بھری رہتی تھی۔ بحث وغیرہ کے بعد مجسٹریٹ نے فیصلہ سنایا' دونوں بری ہو گئے۔

مجسٹریٹ صاحب موٹے رام شاستری سے بولے'' آپ کو اور کچھ کہنا ہے؟ اب تو سب سے بہتر یہی ہے کہ آپ چپکے سے کھڑکی کے راستے باہر نکل جایے۔''

جیسے ہی مجسٹریٹ صاحب نے یہ کھڑکی والی بات کہی دونوں (جواب دہی کرنے والے) آدمی مسکرا دیے۔ اس کے بعد 'مادھوری' کا وہ شمارہ سب کا سب بک گیا۔

وید جی (؟) گھر آئے تو بولے'' چاہے پہلے' موٹے رام شاستری کو پہلے کوئی نہ جانتا ہو لیکن مقدمے کے بعد ساری دنیا جان گئی ہے۔''

مادھوری اوفس میں اس بات کا مہینوں چرچا رہا۔

کنواں بنوایا

آج سے پندرہ سال پہلے ایک دن کہاری پانی بھرنے آئی اور گھڑے لے کر کنویں پر گئی۔ کنویں کی جگت پکی تھی اور پھول کر گراری سمیت کنویں میں جا پڑی۔ کہاری روہانسو ہو کر آئی اور بولی۔'' بابو جی آج میں کنویں میں گرتے گرتے بچی۔ چلیے چل کر دیکھیے سب کچھ کنویں میں جا پڑا۔ میں بچ گئی ورنہ میں بھی اندر ہوتی۔''

آپ یہ باتیں سن کر بجائے اندر آنے کے سیدھے بھٹے پر جا کر ۴۰۰۰ اینٹوں کا آرڈر دے آئے۔ میں گھر میں ناشتہ لیے بیٹھی تھی۔ آپ وہاں سے ساڑھے نو کے لگ بھگ لوٹے۔

میں نے کہا'' آپ ناشتے کے وقت کہاں چلے گئے تھے؟''

بولے'' تم نے کنویں کی حالت نہیں دیکھی؟ مہری اس میں گرنے سے بچی۔''

میں نے کہا'' پہلے یہ بتایئے آپ تھے کہاں اب تک؟''

بولے'' میں اینٹوں کے لیے کہنے گیا تھا۔ آخر تین مہینے کے بعد اچھا ہوا ہوں۔ کچھ تو دان دینا ہی پڑے گا۔''

میں نے کہا'' کنواں تو پنچایتی ہے۔''

آپ ''بولے'' سب کو دکھائی نہ پڑے تو میں بھی ان کے ساتھ اندھا ہو جاؤں ۔ اور کہیں آج تمھاری مہری کنویں میں گری ہوتی تو سب سے پہلے تم ہی روتیں اس وقت اگر میں تم سے پوچھتا کہ اتنی ساری عورتیں تو ہیں ہی ایک تم ہی اکیلی کیوں رونے بیٹھ گئیں؟ تب تمھیں کیسا لگتا؟ نہ گاؤں بھر کی عورتیں روتیں نہ گاؤں بھر کے مردوں کو وہ کنواں دکھلائی پڑتا ۔ اس لیے تم مجھ سے کچھ کہہ نہیں سکتیں ۔''

''خالی اینٹوں سے کنواں بن جائے گا؟'' میں نے کہا ''اس میں تین ساڑھے تین سو روپے خرچ ہوں گے ۔ کم سے کم سو روپے کا تو پتھر ہی لگے گا۔''

آپ کے منھ سے نکلا ''نہیں ۔نہیں ایسی بات نہیں ہے ۔''

''میں حساب جوڑ کر بتاؤں گی تو پتہ چلے گا ۔ جب دروازے پر اینٹ آجائے گی تو اسے پورا کرنا میرا کام ہوگا ۔''

بولے ''میں تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ کام پورا ہو ۔''

۲۔۳ روز کے بعد 'مادھوری' آفس سے بلاوہ آیا ۔ آپ وہاں ادارت کرنے چلے گئے ۔ کنواں میں نے بنوایا ۔ بنوائی میں ۳۷۵ روپے لگے ۔ جب وہ آئے اور ان کے سامنے میں نے حساب رکھا تو بولے ''خیر یہ کام بھی ہو گیا ۔ میں نے اگر اینٹیں نہ منگوائی ہوتیں تو یہ کام نہیں ہو پاتا ۔''

میں بولی '' آپ کی یہ عادت ہے کہ ایک نہ ایک بلا میرے سر پر آئے دن منڈھتے رہتے ہیں'' آپ بڑے زور کی ہنسی کے ساتھ بولے '' مجھے یقین رہتا ہے کہ میں جس کام میں ہاتھ ڈالوں گا اسے تم پورا کر دو گی ۔''

''اور میرا کام ہے ہی کیا؟ میں نے جواب میں کہا۔

بولے ''تم بہادر آدمی ہو ۔''

''میں ایسی بے وقوف نہیں ہوں کہ تمھارے اوپر بوجھا نہ لاد سکوں' پر کیا کروں مجھے تمھارے اوپر ترس آتا ہے ۔ آپ نوکرانیوں سے کبھی کام نہ لیتے تھے ۔ وہ ایسے تھے کہ اگر کوئی وزن اٹھانا ہو تو خود اٹھا لیں ۔ اگر گھر میں نوکر نہ ہو نوکرانی ہی ہو تو اپنی دھوتی خود دھو لیں ۔ ان کو بابو بننا بہت برا لگتا تھا ۔ ایسی حرکتیں دوسروں کو کرتے دیکھ کر ہی انھیں سخت غصہ آتا تھا ۔ بچوں کے آلسی ہونے کے ڈر سے وہ زیادہ نوکر نہیں رکھتے تھے ۔ ان کے دل میں بڑے چھوٹے کا لحاظ بھی بہت تھا ۔

بہنوئی

میرے بہنوئی نے دوسری شادی کی حالانکہ ان کے پہلی بیوی کے بچے تھے۔ انھوں نے دوسرا بیاہ رچایا اور ساری دولت دوسری بیوی کے نام کردی۔ کوئی تین لاکھ کے لگ بھگ ان کے پاس تھے۔ اسی بات پر ہم دونوں کی بحث ہو رہی تھی۔

''انھوں نے اچھا نہیں کیا۔'' میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

آپ بولے'' کیا کرتے آپ کے خیال میں؟''

''بچوں کو بھی کچھ دیتے۔''

''بچوں کے ہاتھ پیر ہیں' کماتے ہیں۔''

''اگر کچھ نہ ہوتا تو وہ کیا کرتے؟ تب تو دوسری بیوی بھی بچوں ہی کے ذمے پڑتی۔''

''ہونے پر یہ کوئی نہیں سمجھتا۔ جب نہ ہوتا تو دیکھا جاتا۔ پھر یہ بھی کون سی یقینی بات ہے کہ بچے بیوی کا خرچہ اٹھاتے۔''

''تب ہی آپ نے بیٹوں والی بیوہ نام کی کہانی لکھی تھی۔''

''میں آئے دن اسی طرح کے کیس دیکھا کرتا ہوں۔''

''آپ کیسے سب کے دل کی باتیں سمجھ لیتے ہیں؟''

''تم تو خود لیکھیکا ہو' سمجھ سکتی ہو۔ بہت کم ایسے لڑکے ہوتے ہیں جو اپنے پتا کے برابر اپنی ماں اور بہنوں کو پیار کرتے ہیں۔''

''آپ تو سوتیلی ماں (وماتا) ہی کے لڑکے تھے۔ وماتا میں ماتا کا سا ذرہ برابر پیار نہیں تھا۔ پھر بھی آپ تو انھیں ماتا ہی سمجھتے رہے۔''

''کیا اسی طرح ہمارے لڑکے بھی ہیں؟ تم دیکھتی ہی ہو کبھی کبھی وہ بے دھڑک تمھارا حکم ٹال دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ بری مجھے کوئی اور بات نہیں لگتی۔ اسی لیے مرضی یہی ہوتی ہے کہ بچوں کو کچھ کرنے کے لیے کبھی نہ کہا جائے۔ اسی طرح سوچ لو انھوں نے دوراندیشی کی ہوگی۔ وہ وکیل ہیں' سمجھدار ہیں' دولت بھی رکھتے ہیں۔ پھر جسے زندگانی میں سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اسے

مرنے کے بعد کس کے سہارے چھوڑیں! کوئی بھی شریف آدمی یہی کرتا۔ مرنے پہ اپنا اختیار تو ہوتا نہیں۔ نہیں تو کوئی جیون ساتھی چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا'' بہت سے تو عزت چھوڑ ڈنڈے سے خدمت کرتے ہیں۔''

بولے'' وہ جانور ہیں اور گھر کی زندگی کا کوئی بھی مزہ انھیں نہیں ملا ہے۔ نہیں تو ایسا کون چاہے گا۔ پھر دوسروں پر اپنی ذمے داری ڈالنے کا کیا مطلب؟ لیکھک یا تو دیکھا ہوا لکھتا ہے یا جو اس نے لکھ رکھا ہے اسے ضرور دیکھے گا۔ انھوں نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ میں ان کی تعریف کرتا ہوں۔ ہر مرد کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

میں بولی'' بیوی کون سی ہوشیار ہے۔ تب بھی تو وہ بیٹوں ہی کے ذمے رہے گی۔ ان لوگوں کے اطوار تب تک اور برے ہو چکے ہوں گے۔''

آپ بولے'' تم تو بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ جب انھوں نے ایسا کیا ہے تو کوئی جج بھی مقرر کر جائیں گے۔''

میں نے کہا'' جج کوئی ہر وقت پاس کھڑا رہے گا۔ گھر میں تو بچے ہی ہوں گے۔''

جج اپنے اشارے ہی سے سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پولیس بھی دلوا سکتا ہے۔ وہ مجھ سے بھی کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنے گھر کے لیے ایک جج بھی مقرر کیا ہے۔ ان کی بیوی کو زبان تک ہلانی نہیں پڑے گی۔ جج سب انتظام کر دے گا۔''

میں نے کہا'' تو شادی کر کے انھوں نے کیا حاصل کیا؟''

'' ان کی خوشی۔ انسان اپنی ریاضت کا پھل کھانا چاہتا ہے۔ یہ کیا کہ سب کچھ بچوں ہی کے لیے کرو۔ انھیں تعلیم دلا دینے تک انسان کا دھرم ہے۔ وہ تو دوسروں تک کا بندوبست کر سکتے ہیں۔''

'' بچوں کے پاس جوان کی پونجی جائداد رہتی تو کیا وہ دوسروں کی ہو جاتی؟'' میں نے پوچھا۔

بولے'' ان کے مرنے سے ان کی بیوی بیوہ ہوگی نہ کہ بچے۔ وہ تو مرنے کے بعد خوش ہوں گے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو ان کی ساری جائداد پونجی ان کے چھوٹے بچے اور ان کی بیوی ہی کو دیتا۔''

'' اور اگر جائیداد پونجی نہ ہوتی تو چھوٹے بچے اور بیوی کس کے کھاتے میں جاتے؟''

'' جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو انھیں مشکل بھی تو اٹھانی پڑتی ہے۔ آنکھ کھول کر دیکھو۔''

''ایسے میں قرضہ تو لڑکوں ہی کو دینا پڑتا ہے۔''

''جس کے پاس دولت ہوگی بھلا اس کے ذمہ قرضہ ہوگا؟'' آپ بولے۔

''قرضہ اگر نہیں ہے تو ٹھیک ہے'' میں نے کہا۔

''میری بات سنو'' آپ بولے ''میں بالکل سچ کہتا ہوں۔ ان کا یہ کام مجھے بہت پسند آیا۔ میری نگاہ میں ان عزت بڑھ گئی۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو میں انھیں دھوکے باز سمجھتا۔''

۱۹۲۸ء

ان دنوں ہم لکھنؤ میں تھے۔ ایک دن ہمارے گھر کالا کنکر راجہ اودھیش سنگھ آئے۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی آدمی تھے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ آپ نے بیٹی کو آواز دی۔

''بیٹی پان دے جا۔''

میں نے پان اور الائچی بھجوا دیے۔ جب وہ چلے گئے تو آپ اندر آکر بولے۔

''کل مجھے آٹھ بجے کالا کنکر کی کوٹھی جانا ہے۔''

میں نے پوچھا ''نئے صاحب کون تھے۔''

''راجہ صاحب خود تھے۔ کیا بتاؤں کل بٹھایا؟''

''جہاں میں بیٹھا تھا۔''

میں بولی ''یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔ میں نے بیسوں بار آپ سے کہا ہے کہ دو چار کرسیاں آپ لا کر رکھ لیں۔ ان لوگوں نے کیا سوچا ہوگا۔ اور آپ کو یہ سب کیسے اچھا لگتا ہے؟''

آپ بڑے زور سے ہنستے ہوئے بولے ''تو کیا میں راجا مہاراجاؤں کے لیے انتظام کرتا پھرتا ہوں۔ میں تو مزدور ہوں۔ آج تک جو موٹا جھوٹا کھانے پہننے کو ملا کھایا' پہنا۔ میری گدی تو زمین ہے۔ اب ان لوگوں کو اچھا نہ لگے تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔''

میں بولی ''تو اس سے کیا؟ ہمیں تو خود چاہیے کیا ہر آدمی اپنے کو اچھا نہیں دکھلانا چاہتا؟''

آپ بولے ''تمھارا کہنا ٹھیک ہے۔ پر یہ یوروپ نہیں ہے۔ یہ ہندوستان ہے جہاں لوگوں کی

آمدنی چھ پیسے روز کی ہے۔ بہتوں کو تو بھر پیٹ روٹی بھی نہیں ملتی۔ تم کیا کہہ رہی ہو! یہاں کا عام آدمی عیش وعشرت کے اسباب کہاں سے جوڑ سکتا ہے۔ اور اگر لوگ مرمر کر جوڑتے ہیں تو یہ غریبوں کے حق میں ناانصافی ہے۔"

میں بولی "محض آپ ہی کے کرنے سے سب کچھ ٹھیک نہیں ہو جائے گا۔"

وہ بولے "تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بھی اوروں کے ساتھ کنوئیں میں کود پڑوں۔ اپنا اپنا طور طریقہ الگ ہوتا ہے۔ میں اسی میں خوش ہوں۔ نہ کوئی چنتا نہ کوئی فکر۔ ہمیں کسی بھی چیز کی فکر نہیں ہے۔ کرسی میز منگالوں تو کل تم کہو گی قالین بھی چاہیے۔ پھر نوکروں کی فکر ہوگی۔ ایک کے بعد ایک فکر لگی ہی رہے گی۔ جوان کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں انہیں انہی سے فرصت نہیں ملتی۔ اسی عیاشی کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگوں کو غلام ہونا پڑا۔ آج کتنا ہی ہاتھ پیر مارنے پر کچھ بن نہیں پڑتا۔ انھی لوگوں کے گناہوں کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ غلام ہیں اور اگر اب بھی گناہ کرتے رہے تو نجانے کیا نتیجہ نکلے گا۔"

میں بولی "آپ بھی خوب ہیں۔ ذرا ذرا سی بات میں نجانے کیا کیا سوچ بیٹھتے ہیں۔"

آپ بولے "یہاں والوں کو بہت سادے ڈھنگ سے گزر بسر کرنی چاہیے۔ ہم لوگوں کو اپنے سے چھوٹوں کو دیکھنا ہے۔ ان کو دیکھو اور ان میں ملنے کی کوشش کرو۔ یہی ہم لوگوں کو کرنا چاہیے۔"

"آج اپنی حکومت (سوراج) کی آواز لگانے والے یہی کرسی میز والے ہیں۔ غریبوں کے دماغ سے یہ پودا نہیں اُپجا ہے۔ ننگے اور بھوکے بھلا کر بھی کیا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

تب آپ بولے "جس طرح موٹے آدمیوں نے آزادی کھوئی اس طرح وہ آزادی پانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ ہمارے اوپر یہ لوگ کوئی احسان نہیں کر رہے ہیں۔ انسان ہمیشہ پستی میں نہیں رہ سکتا۔ یہ سرکاری دھوکے کا جال نہیں ہے۔ روح کی للکار کو آدمی کہاں تک نظر انداز کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے چور ڈاکو بھی اپنے جرم کو کبھی نہ کبھی سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

میں بولی "یہ سب قسمت کی بات ہے۔ بھگوان بھی ان کے ساتھ رحم نہیں کرتے۔ آپ کتنا ہی ہائے ہائے کریں اس سے ہوتا کیا ہے۔ ہم کو کچھ مل تھوڑی جاتا ہے۔"

آپ بولے "میں ہی کیا رحم ان کے ساتھ کر سکتا ہوں۔ ان کا بھلا تو اسی وقت ہوگا جب ان میں طاقت آئے گی۔"

"تب بھگوان کو چاہیے ان غریبوں میں طاقت بھر دے۔"

بھگوان ایک طرح سے انسان کے من کا بھوت ہے جو اسے کمزور کر دیتا ہے۔ یہ دنیا خود پر اعتماد کرنے والے انسان کی دنیا ہے۔ اندھے اعتقاد میں پڑنے سے تو رہی سہی عقل بھی ماری جاتی ہے
''گاندھی جی تو دن رات ایشور ایشور چلاتے رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ان کا یہ کہنا ایک طرح کی علامت جتنا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ عوام ابھی زیادہ بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ پھر جو عوام صدیوں سے بھگوان پر وشواس کرتے چلے آ رہے ہوں وہ ایکا ایک اپنے خیالات کیسے بدل سکتے ہیں اگر کوئی ایکا ایک عوام کو بھگوان سے الگ کرنا چاہے تو ایسا کرنا ممکن بھی نہیں۔ اسی وجہ سے شاید وہ بھی بھگوان کا سہارا لے کر چل رہے ہیں''

میں نے کہا'' آپ بھگوان کو چاہے نہ مانیں لیکن ساری دنیا تھوڑی منکر ہو سکتی ہے۔''

''میرا کہنا جھوٹ نہیں ہے،'' انھوں نے کہا'' تم سچ مانو' جو بھی آج دھرم کے نام پر ہو رہا ہے سب اندھا اعتقاد ہے۔ یہ سب کم عقلوں کو بہکانے کے طریقے ہیں۔ تم خود سوچ سکتی ہو؟ تمام عورتوں پر دھوکے کا جال چلتا ہے۔ اسی کا نام اندھا اعتقاد ہے۔''

''کیا عورتوں کے حصے میں کم عقلی ہی آئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بولے''اس میں ناراض ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اور میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ عورتیں پیدائشی کم عقل ہوتی ہیں۔ مرد ذات نے انھیں کم عقلی کا سبق پڑھایا۔''

''مردوں نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسی طرح جس طرح برٹش گورمنٹ نے ہم لوگوں کو۔ جس طرح ہمارے بے وقوف ہونے ہی میں سرکار کا فائدہ ہے اسی طرح عورتوں کے بے وقوف ہونے میں مردوں کا فائدہ ہے۔''

میں بولی'' سرکار کو تو خیر بہت سے فائدے ہیں پر آپ لوگوں کو اس سے کیا فائدہ ہوا؟ عورت مرد تو ایک دوسرے کے انگ ہیں۔ آدھا انگ کٹ جائے تو کیا۔ دوسرا آدھا انگ (خوش) زندہ رہ سکتا ہے۔ تس پر مرد لوگ سمجھداری کا دم بھرتے ہیں۔''

آپ ہنستے ہوئے بولے'' یہ پرانی باتیں ہیں۔ جتنی سرکاریں آئیں۔ انھوں نے یہاں کی پبلک کو بے وقوف بنانا چاہا۔ مرد ذات سے بھی زیادہ عورتیں کمزور تھیں۔ مرد تو کسی طرح اپنے کو سنبھال لے گیا لیکن عورت اپنے کو نہ سنبھال پائی۔ تم دیکھتی ہی ہو کہ مندر اور مسجد کے جھگڑے میں گورمنٹ کتنی دلچسپی لیتی ہے۔ اسی طرح یہاں کے مرد بھی دلچسپی لیتے رہے ہوں گے۔''

میں بولی ''پھر آپ لوگ عورتوں کو کیسے بے وقوف بناتے ہیں؟ مرد ذات خود بے وقوف ہے جو عورتوں کو بے وقوف بنانے چلا ہے۔ یہ تو اسی طرح ہوا کہ دوسروں کی بدشگونی کے لیے اپنی آنکھیں پھوڑ لے۔ سمجھداری اسے نہیں کہتے۔''

آپ بولے ''عورتیں کیوں نہیں وقت کے ساتھ چلتیں۔''

میں بولی '' چلیں گی تو ' پر مرد انھیں چلنے تو دیں ۔ مرد کو خود اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔''عورتوں کو ترقی کی راہ پر خود قدم اٹھانے چاہیے'' انھوں نے کہا۔

''مردوں نے ان کی طاقت ختم کردی ہے۔ اسی وجہ سے انھیں عزت پانے اور بے عزتی ہونے کا خیال بھی زیادہ نہیں ستاتا ہے۔''

آپ بولے ''نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔''

میں بولی '' ہے کیوں نہیں۔''

یہ باتیں کرتے ہوئے ان کے چہرے پر فکر کے بڑے گہرے آثار تھے۔ میں رہ رہ کر ان کو دیکھ رہی تھی لیکن جس طرح وہ بحث کر رہے تھے۔ اس میں فرق نہیں آیا۔

میں نے ۵۰ روپے کا فرنیچر منگوایا اور کمرے میں سجادیا۔ لیکن ان کا زمین پر بیٹھنا جاری رہا۔ زمین پر ایک ڈیسک رکھ لیتے اور ایک ڈیسک بچے کے لیے ہوتا۔ اس بچے کو روز صبح آپ پڑھاتے تھے۔ ہاں اگر کوئی آجاتا تو اسے اس کمرے میں لے جاتے۔ روزانہ اس کی صفائی وہ خود کرتے۔ میں اپنے دل میں سوچتی یہ کیا فرنیچر منگوا کر میں نے ان کی باؤں میں اور اضافہ کردیا۔ جھاڑنا پونچھنا ان کا وقت خراب کرنے لگا۔

ایک دن ان کے پاس جاکر میں بولی'' آپ صفائی مت کیا کیجیے۔ میں خود اس کی صفائی کروں گی۔''

آپ بولے ''نہیں' میں اپنے آپ صاف کرلیا کروں گا۔ تمھاری مدد کی ضرورت نہیں۔''

میں بولی ''میں آپ کی کیا مدد کروں گی!

جب میں نے ان کے ہاتھ سے جھاڑن چھین لیا تو آپ پیار سے بولے'' تم یہ سب کام مت کیا کرو۔ کوئی اگر آگیا تو کیا سوچے گا! اپنے دل میں سوچے گا اچھے رئیس ہیں۔ بیوی صفائی کر رہی ہے۔ آپ کھڑے دیکھ رہے ہیں۔''

میں بولی ''تو اس میں کون سا گناہ ہے۔''

آپ بولے ''آج کل کی تہذیب کے خلاف ہے۔''

میں بولی ''آپ کا صفائی کرنا مجھے بھدا لگتا ہے۔''

آپ بولے ''اپنا کام کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔''

اس دن سے میں خود اس کمرے کو صاف کرنے لگی اور ان سے کہہ دیتی نوکر نے صاف کیا ہے۔ اسی طرح جوتے پالش کرنے سے انھوں نے مجھے منع کیا تھا۔ یہ سب باتیں یقیناً معمولی ہیں لیکن سوچیے ان کے اندر کتنا لحاظ تھا۔ میرے دل میں بار بار آتا ہے کہ وہ کسی بھی پارسا سے کم نہیں تھے۔ میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ وہ میرے تھے اور میں ان کی ہوں۔

لکھنؤ: مہاتما جی کے درشن

سنہ ۲۸ کی بات ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کی میٹنگ تھی اور پریاگ (الہ آباد) ہی میں ورکنگ کمیٹی کی بھی میٹنگ تھی۔ مہاتما گاندھی بھی ان دنوں پریاگ آنے والے تھے۔ آپ کو مہاتما گاندھی سے ملنے کی بہت دنوں سے خواہش تھی۔ یہ بات سندر لال جی کو معلوم ہوئی۔ ان کا خط آیا۔ آپ اکیڈمی کی میٹنگ سے دو دن پہلے آ جایے۔ مہاتما گاندھی سے ملاقات ہو جائے گی۔

آپ مجھ سے بولے ''میں آج جاؤں گا۔''

میں نے کہا ''آپ تو کہتے تھے چوتھے دن جانا ہے پھر آج کیوں جا رہے ہیں؟''

آپ بولے ''میں دو دن پہلے جا رہا ہوں۔ مہاتما جی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

میں بولی ''جس دن آپ کو جانا تھا تب تک کیا مہاتما جی چلے جائیں گے؟ اکیڈمی کی میٹنگ میں تو جانا ہے ہی۔''

''ممکن ہے، تب تک مہاتما جی چلے جائیں۔ زیادہ دن وہ کہیں ٹھہرتے بھی تو نہیں۔''

''تو پھر جایے۔'' میں نے کہا۔

بولے ''لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوتا ہے کہ میں ابھی تک مہاتما جی سے نہیں ملا ہوں۔''

وہ دو دن پہلے گئے بھی اور اکیڈمی کی میٹنگ کے بھی دو دن بعد لوٹے لیکن پھر بھی مہاتما گاندھی کے درشن نہ کر پائے۔ جب گھر آئے، میں نے کہا ''دو دن پہلے تو گئے اور دو دن کے بعد آئے تب بھی آپ کو مہاتما گاندھی کا دیدار نصیب نہیں ہوا۔''

''آپ بولے''ان بے چارے کوفرصت کہاں۔سیکڑوں آدمی توان سے ملنے والے ٹھہرے۔ان کو ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں۔سیکڑوں توان کوروزانہ چھٹیاں دیکھنی پڑتی ہیں''۔

میں بولی'' آخراورلوگ ان سے کیسے ملتے ہیں' کہ آج ہی ان کوکام پھٹ پڑا ہے۔یہ کام توان کے ہمیشہ کے ہیں۔''

اس پرانھوں نے کہا''لوگ تو ہاتھ دھوکران کے درشن کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔میں صرف دیدار ہی تونہیں کرنا چاہتا تھا۔میں توان سے دس پانچ منٹ وقت لیتا۔اور جو کچھ وہ لکھتے پڑھتے ہیں وہ تو میں کہیں نہ کہیں پڑھ ہی لیتا ہوں۔میں نے سنا ہے مہاتما جی جیسے اورسب باتوں میں ہوشیار ہیں ویسے ہی وہ گفتگو کرنے میں بھی ماہر ہیں۔اپنی اسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں ان سے ملنے گیا تھا۔''

میں بولی''افسوس! چاردن کاوقت بھی گنوایااوروہ خوشی بھی نہیں ملی۔''

ہاں۔اس کومیں اپنی بدقسمتی کہتا ہوں۔'' آپ نے کہا۔

پھران دنوں کے بعد سنہ ۳۵ویں ہندی کاؤنسل' کی میٹنگ وردھا میں ہوئی اس وقت آپ ہنس کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے وردھا گئے۔ہندی کاؤنسل کے سپرد'ہنس' کرنا تھا۔اس کے علاوہ ساتھ ہی ساتھ ہندی اور ہندوستانی کے بارے میں بھی صلاح مشورہ کرنا تھا۔اس میٹنگ میں خودمہاتما جی نے مدعو کیا تھا۔چنانچہ آپ گئے اور چاردن وردھا میں رہے۔جب وہاں سےلوٹے تو مہاتما جی کے بارے میں بتانے لگے''جتنا میں مہاتما جی کو سمجھتا تھا اس سے کہیں بڑھ کروہ مجھے لگے۔مہاتما جی سے ملنے کے بعد کوئی ایسا نہیں ہوگا جوان کا ہوئے بغیر لوٹ آئے۔یا تو وہ سب کے ہیں یا اپنی طرف سب کو کھینچ لیتے ہیں۔ان کی شکل صورت اور باتوں میں اتنی کشش ہے کہ انھیں جو بھی دیکھتا ہے خواہ مخواہ ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔میں کہتا ہوں کہ بڑے سے بُرا آدمی بھی اگران کے نزدیک جائے توان کا ہی ہوکرلوٹے گا۔مہاتما گاندھی کے پاس کوئی کتنا ہی بڑاجھوٹا جائے مگران کے سامنے اسے سچ بولتے ہی بن پڑے گا۔''

میں بولی'' یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔مہاتما گاندھی جنا (جناح) کو کیوں نہیں اپنی راہ پر لے آتے۔جنا کوٹھیک کرنا آسان کام نہیں ہے۔''

''کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب جناح راہ پرآجائیں گے۔کیوں کہ مہاتما گاندھی ایک پہلو کے آدمی نہیں ہیں۔''

''توکیا آپ بھی مہاتما گاندھی کے طرف دار ہوگئے؟''

''تم ان کا طرف دار ہونے کا کہتی ہو میں تو ان کا چیلا ہو چکا ہوں۔ حقیقت میں تو یہ ہے کہ میں ان کا چیلا تو جب ہی ہو گیا تھا جب وہ گورکھپور آئے تھے۔''

''چیلے تب ہوئے تھے درشن اب کر پائے'' میں نے کہا

آپ بولے'' چیلا ہونے کے معنی کسی کی پوجا کرنے کے تو نہیں ہوتے۔ کسی کے چیلا ہونے کا مطلب ہے اس کی خوبیوں کو اپنانا۔''

''تو آپ نے اپنا لیے۔ تم اپنانے کو کہتی ہو تو سنو اس کے بعد تو میں نے پریم آشرم (گوشۂ عافیت) لکھا ہے۔ سنہ ۲۲ میں چھپا تھا۔''

''وہ تو پہلے ہی سے لکھا جا رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

آپ بولے'' اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں مہاتما گاندھی کو دیکھے بنا ہی ان کا چیلا ہو چکا تھا''

''تو اس میں مہاتما گاندھی کی کون سی خوبی ہوئی؟''

آپ بولے'' خوبی یہ ہوئی کہ جو کام وہ کرانا چاہتے ہیں اسے میں پہلے ہی کر دیتا ہوں۔ یعنی یہ کہ میں ان کا بنا بنایا قدرتی چیلا ہوں۔''

میں بولی'' یہ کوئی بات نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی دلیل ہے۔''

بولے دلیل کی یہ بات ہی نہیں ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ دنیا بھر میں مہاتما گاندھی کو سب سے بڑا آدمی گردانتا ہوں۔ ان کی بھی آخری راہ عمل یہی ہے۔ کہ مزدور اور کاشت کار خوش ہوں، وہ ان لوگوں کو آگے لانے کے لیے مہم چلا رہے ہیں۔ میں لکھ کر ان کا ہاتھ بٹا رہا ہوں۔ اگر مہاتما گاندھی ہندو مسلمانوں کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں تو میں بھی ہندی اور اردو کو ملا کر ہندوستانی کو جنم دینا چاہتا ہوں۔''

''بھلا آپ کیسے ہندوستانی بناتے ہیں؟''

''جو کچھ میں لکھتا ہوں ہندوستانی میں لکھتا ہوں۔''

''تو آپ کے لکھنے سے ہندوستانی بن گئی؟''

آپ بولے'' جس کو ہندو مسلمان دونوں مانیں، جس کو عام لوگ سمجھیں وہ ہے ہندوستانی اور میرا خیال ہے راشٹر بھاشا (سرکاری زبان) جب کبھی بھی بنے گی ہندی اور اردو کو ملا کر بنے گی۔''

میں نے اپنی رائے دی ''یہ تو ہندوستان ہے یہاں عام زبان ہندی ہونی چاہیے تھی۔''

''تم نے سوچا یہ ہندوستان نام اس ملک کا کیسے پڑا؟'' انھوں نے کہا ''یہاں جب پہلے مسلمان آ کر آباد ہوئے یعنی جب انھوں نے اس کو فتح کیا تب ہی اس کا نام ہندوستان پڑا تھا۔ نام تو پڑ گیا ہندوستان لیکن اس کی زبان کیا ہوگی یہ جھگڑا ابھی تک مچا ہوا ہے۔ یہ جھگڑا جب ہی ختم ہوگا جب ہندو اور مسلمان ٹھنڈے دل سے سوچ لیں گے کہ ہم دونوں کو ساتھ ہی رہنا ہے۔ اور دونوں کی زبان مل کر ہندوستانی بنے گی۔ جب تک دونوں اپنی اپنی زبان کے لیے روتے رہیں گے تب تک اس مسئلے کا سلجھنا ناممکن ہے۔''

میں بولی ''تو کیا کیا جائے؟ ہندی میں فارسی الفاظ کی بھرمار کر دی جائے یا اردو میں سنسکرت کی؟''

آپ بولے ان دونوں کو ایک دوسرے میں زبردستی داخل کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زبان عام بول چال کی ہو۔ پھر چاہے ہندی میں فارسی کے الفاظ آجائیں یا اردو میں سنسکرت کے ان کو برتنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ پھر جب ملک میں کئی قومیں آ کر ایک ہوگئیں اور آمیزش سے پاک ملک ہی نہ رہا تو آمیزش سے مبرا زبان کیسی؟!''

میں بولی ''اچھا تو پھر کچھ دنوں میں جب شاید روٹی بیٹی کا بھی سوال اٹھے گا۔ تو ہندو لوگ اُس کو کیسے گوارا کریں گے؟''

آپ بولے ''وہ بھی کون سا باقی ہے! بادشاہی زمانے میں تمھارے یہاں کے بڑے بڑے راجاؤں نے مسلمانوں کے ساتھ بڑی خوشی سے اپنی بہنوں بیٹیوں کی شادیاں کی ہیں اور اس میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔ ہاں مسلمانوں کی عورتیں تمھارے یہاں نہیں آئی ہیں۔ اب بھی تمھارے گھرانوں سے جو عورتیں نکالی جاتی ہیں۔ وہ مسلمانوں ہی کے گھر پناہ پاتی ہیں۔ یا چکلے میں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ جو مسلمانوں کی اتنی بڑی قوم ہے وہ سب فارس سے یہاں نہیں آئے تھے۔ اس وقت تمھارے ہندو بھائی کیوں نہیں سوچتے تھے کہ ہمیں اپنا خالص پن بنائے رکھنا چاہیے؟''

میں بولی ''تو کیا آپ مسلمانوں کے حمایتی ہیں؟''

آپ بولے ''میں کسی کا حمایتی نہیں ہوں۔ نہ ہی کسی کا دشمن ہوں۔

''یہ بتایئے آپ رام کو مانتے ہیں یا رحیم کو؟''

آپ بولے ''میرے لیے رام، رحیم، بدھ، عیسیٰ سب ہی عقیدت والے کردار ہیں۔ اور میں ان سب کو مہاانسان سمجھتا ہوں۔''

''آخر آپ ہیں کیا؟'' میں نے کہا۔

آپ بولے'' میں ایک انسان ہوں۔اور جو انسانیت رکھتا ہو انسان جیسا کام کرتا ہو میں وہی ہوں ۔اور انھی لوگوں کو چاہتا ہوں۔ میرے دوست اگر ہندو ہیں تو میرے مسلمان دوست بھی کم نہیں ہیں۔اور ان دونوں میں میرے نزدیک کوئی خاص فرق نہیں ہے۔میرے لیے دونوں برابر ہیں۔''

'' کیسے دونوں برابر ہیں؟ میں بولی'' مسلمان گائے کی قربانی کرتے ہیں اور اسی قربانی کے پیچھے ہزاروں ہندو مسلمانوں کی جان جاتی ہے۔''

آپ بولے'' اس کا الزام ایک ہی فرقے پر نہیں جاتا ہے۔اگر مسلمان قربانی کرتا ہے ایک بڈھی ٹھڈی گائے کی۔جس پر دونوں قوموں میں جھگڑا ہوتا ہے۔تو جب انگریزوں کے یہاں سیکڑوں گائے اور بچھڑے روزانہ مارے جاتے ہیں تو کیوں نہیں ہندوؤں کے خون میں گرمی آتی؟ یہ قربانی میں گائے پر جھگڑا نہیں ہوتا۔حقیقت میں یہ دونوں کے اندر ایک طرح کی رنجش ہے۔کریدن اسی میں پڑ کر جھگڑا ہوتا ہے۔کون سا ایسا دیوی کا مندر ہے جہاں بکروں کی قربانی نہ ہوتی ہو۔کیا بکرے میں جان نہیں؟ پھر کیوں بکرے کی قربانی کی جاتی ہے؟ بکرے کا گوشت آپ بھی شوق سے کھاتے ہیں۔پھر یہ خیال سب سے بڑھ کر دیا کی مورتی ہندو ہیں۔آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ عورتوں پر سب سے زیادہ زیادتی ہندو ہی کرتے ہیں۔ ذرا سی بھول اس سے ہوئی نہیں کہ گھر سے نکال باہر کھڑا کرتے ہیں۔ ہندو اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارتے ہیں۔اس پر اگر سنتے ہیں کہ کسی ہندو کو مسلمان کر لیا گیا تو جی بھر کر شور غل مچاتے ہیں۔اور جب عورت کو گھر سے نکال دیتے ہیں تو یہ نہیں سوچتے کہ آخر یہ جائے گی کہاں؟ اس کے پاس تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ مسلمان ہو جائے۔پھر اس کو کیوں نہیں گھر میں رہنے دیتے؟ اور عورت سے جو غلطی ہو جاتی ہے اس کی ذمہ دار صرف وہی نہیں ہوتی 'مرد بھی ہوتا ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ مرد عورت سے دونا سزاوار نہ بھی ذیوڑھا تو ضرور ہوتا ہی ہے۔ میں کہتا ہوں پھر عورت ہی کو کیوں گھر سے نکال دیا جاتا ہے'مرد کو کیوں نہیں نکالا جاتا؟ اس کا کیوں نہیں بائیکاٹ کیا جاتا؟ اس میں سولہا آنے عورت ہی کو کیوں گناہگار ٹھہرایا جاتا ہے؟ مرد تو شروع ہی سے عورت کے ساتھ زیادتی کرتا آرہا ہے۔اپنی مرضی کے موافق قاعدے قانون بھی تو مرد نے اپنے حق میں بنا رکھے ہیں۔ایک سے زیادہ شادی'بڑھاپے کی شادی بھی مرد کرتے ہیں۔تب آخر اتنی عورتیں کہاں جائیں گی؟ اور سوسائٹی نے ساری ذمہ داری عورت ہی کے سر پر دے ماری ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے شکنجے عورتوں ہی کے لیے ہیں۔اس سے مردوں کو کوئی بحث نہیں ہے۔سارے قاعدے قانون جو اپنے لیے ہیں ان سے

الٹ عورتوں کے لیے بنائے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ان قاعدے قانون کے شکنجے سے بچا کر رکھا ہے۔ اب تم ہی سوچو کہ ہندو مرد عورت کو گھر سے نکال بھی دے اور یہ امید بھی رکھے کہ وہ مسلمان نہیں ہوگی کہاں کا انصاف ہے۔ بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ عورت دنیا ہی چھوڑ جائے۔ بھگوان جانے مرد کیا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا ''اور رنڈیاں جو شہر سے نکالی جارہی ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟''

آپ بولے '' ان کے لیے سوسائٹی یہی چاہتی ہوگی کہ شہر میں نہ رہیں اور تنہائی میں زندگی گزاریں میں تو مبارک باد دیتا ہوں دیانند کو۔ انھوں نے آریہ سماج کا پرچار کر کے عورتوں اور سماج کو بڑی نجات دلائی ہے۔ شاردا بل انھوں نے عورتوں کے لیے پاس کرایا ہے۔ عورتوں کو بھی انھیں مبارک باد دینا چاہیے۔

میرے منھ سے نکلا'' ہم عورتیں اور ان عظیم مردوں کو مبارک باد دیں!''

'' اگر مبارک باد نہ دو تو اس کے معنی ہیں تم لوگ ناشکر ہو'' انھوں نے جواب میں کہا'' عورت ذات کو آگے بڑھانے میں مہاتما جی نے بھی ان کی طرف داری کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اب بھی ہمارا سماج نہیں سمجھتا اور عورتوں کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کرتا تو بہت ممکن ہے وہ دن جلد ہی آنے والا ہو جب ہندو گھرانوں کی لڑکیاں ان ظلم اور زیادتیوں سے گھبرا کر اپنی مرضی کے مطابق اپنی شادیاں کرنے لگیں۔''

'' وہ ٹھیک نہیں ہوگا'' میں نے کہا'' وہ ہماری بدقسمتی کا دن ہوگا جب ہمارے گھرانوں کی لڑکیاں خود اپنی شادیاں کریں گی۔ کیونکہ جس عمر میں شادی ہوتی ہے لڑکے لڑکیوں میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اچھے برے کا فیصلہ کر سکیں۔ اور دھوکے بھلاوے کا بڑا امکان رہتا ہے۔ ایسی شادیاں دیکھنے میں بھاتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں ہوتی ہیں دھوکا۔''

آپ بولے'' چاہے میں، یا تم، یا دنیا بھر اس کو روکنے کی کوشش کرے یہ عمل رک نہیں سکتا۔ ایک وقت آئے گا جب کوئی طاقت اس کو روک نہیں سکے گی۔ ہوا کی رفتار ہم کو یہی بتلا رہی ہے۔ ہم جتنا سوچتے ہیں کہ مغربی تہذیب سے دور رہیں اتنی ہی تیزی سے وہ ہمارے سروں پر سوار ہو رہی ہے۔''

میں بولی'' بھگوان نہ کرے کہ اس دن کو دیکھنے کے لیے میں دنیا میں بیٹھی رہوں۔''

آپ بولے'' یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ تم نہیں پرانی تہذیب سے گھبراتی ہو؟''

''تو میں اس طرح تو اس کو نہیں ٹھکرانا چاہتی ہوں کہ اس کا نام و نشان مٹ جائے۔ جہاں خرابی ہو وہاں اس میں سدھار چاہتی ہوں'' میں نے کہا۔

آپ بولے'' جہاں تم سدھار چاہتی ہو تمھارے لڑکے اسے یقیناً مٹانا چاہیں گے۔ اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ وقت کے بدلنے کے ساتھ قاعدے قانون بھی تو بدلیں گے۔ صدی تو بیسویں ہے اور آپ چاہتی ہیں پہلے والا عہد۔ نہیں۔ بیسویں صدی کے مطابق قاعدے قانون بھی بنیں گے اور بننے چاہئیں۔ جس میں ایک طرفہ ڈگری کرنے کا کسی کو حق نہ رہے۔''

میں بولی'' تو اس میں ہم عورتوں کو سہولت تو ہوگی ہی۔ اس لیے جن جن آزاد منشوں نے ہم پر احسان کیا ہے۔ اور آپ بھی ہماری ہی طرف ہیں۔ ان سب کو تو ہم عورتیں مبارک باد دیں گی ہی مگر میں آپ کو ابھی مبارک باد دیتی ہوں۔''

آپ بولے'' بھائی میں تم لوگوں پر کوئی احسان تو نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو صرف میرے بزرگوں نے جو ظلم عورتوں پر کیے ہیں ان کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔''

''کون جانے کس نے گناہ کیا اور کس نے نیکی۔ روتے تو مرد عورت دونوں ہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں روئیں گے تو دونوں ہی ساتھ ساتھ کیونکہ چاہے عورت ہو چاہے مرد ہمارے جو اعمال ہیں ان کو ہم ساتھ ساتھ ہی بھگتتے بھی ہیں اور ہمیشہ بھگتیں گے'' انھوں نے کہا۔

میں بولی'' اب افسوس کرنے کا کیا مقام ہے۔ اب تو افسوس کرنے کا وقت بھی ہاتھ سے نکل چکا ہے۔''

آپ بولے'' پہلے عورتوں کو مردوں نے زیر کیا' جب عورتیں کمزور ہو گئیں تو ان ہی کی اولاد یعنی ہم بچے بھی غلام بنے۔ اب غلامی کا تاوان ہم لوگوں کو دینا پڑ رہا ہے''۔

''ہم عورتیں اب بھی پس رہی ہیں'' میں نے کہا۔

''وہ تو پسنا ہی پڑے گا'' انھوں نے کہا'' اس کا افسوس چھوڑ دینا چاہیے۔''

ہمارا اس طرح کا بحث مباحثہ کسی نہ کسی موضوع پر سدا ہوتا ہی رہتا تھا۔

بیٹی کی شادی

ذکر ہے سنہ ۲۸ کا۔ بیٹی کی شادی کرنے والے تھے۔ کئی لڑکے لکھنؤ میں دیکھے مگر ایک بھی پسند نہ آیا۔ جس کا گھر گھرانا اچھا ہوتا وہ لڑکا بدصورت نکلتا۔ جس کا لڑکا اچھا ہوتا وہ گھر خالی نکلتا۔ ایک بار میں بولی'' آپ لڑکا دیکھنے گئے تھے پسند آیا۔''

آپ بولے ''لڑکا اچھا ہے پر سانولا ہے۔''

میں نے کہا ''تو کیا ہوا۔ چھلکے میں تھوڑا ہی بٹھانا ہے۔''

آپ بولے ''اس کا یہاں کیا ذکر ہے۔ صورت شکل تو ہونی چاہیے۔''

میں بولی ''جنھوں نے آپ کو وہ لڑکا بتایا تھا وہ تو کہتے تھے بہت اچھا ہے۔''

بولے ''میں کیا کہتا ہوں کہ وہ کوڑا ہے۔ بس مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔''

''تو آپ کو کیسا لڑکا پسند آئے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

بولے ''تمھیں بتاؤ' اگر تمھاری شادی کسی بدشکل سے ہوئی ہوتی تو وہ تمھیں پسند آتا''؟

''جس سے میری شادی ہوئی ہے وہ تو مجھے پسند ہے۔ پہلے بھاتا کہ نہ بھاتا دیو جانے۔''

دوسرا لڑکا فتح پور میں دیکھ کر آئے۔ میں پوچھ بیٹھی ''دیکھ آئے؟''

بولے ''دیکھ تو آیا پر مجھے ایک بھی لڑکا پسند نہیں آتا۔''

ایک لڑکا اناؤ میں دیکھا۔ اس کے گھر بار اچھا تھا۔ لڑکا ذہین تھا۔ پڑھنے لکھنے میں بھی اچھا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ لڑکے کی ماں نہیں ہے۔

آپ بولے ''میں اُس گھر میں اپنی بیٹی کا بیاہ نہیں کروں گا''

میں نے کہا ''پہلے یہ بتاؤ' ماں باپ سے شادی کرو گے کہ لڑکے سے؟''

بولے ''تم نہیں جانتیں۔ جاتے ہی بے چاری کو گھر گرہستی دیکھنی پڑے گی۔ ہم بیٹی کو بلانا چاہیں گے تو وہ کہیں گے کہ گھر کون دیکھے گا۔ کون سی ہماری دو چار لڑکیاں ہیں۔ میں ایسی شادی نہیں پسند کرتا''

ایک اور لڑکا بنارس میں نکلا۔ اسے گھر بلایا۔ وہ ڈی اے وی میں پڑھتا تھا۔ لڑکا خوب صورت تھا۔ وہ دو دن رہا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے یہ محسوس کیا کہ لڑکا شوخ ہے۔ بولے ''اور تو سب ٹھیک ہے لیکن چنچل معلوم ہوتا ہے''

بعد میں پتہ چلا کہ اس لڑکے کی اپنے ماں باپ سے بھی پٹتی نہیں تھی۔

میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ''ماں باپ مورکھ ہوں گے' نہیں پٹتی ہوگی۔ پر لڑکا تو اچھا ہے''

آپ بولے ''تم بھی مورکھ ہو۔ جس لڑکے کی ماں باپ سے نہیں پٹتی ہے اس کی بیوی سے کیسے پٹے گی؟ یہ بھی تو سوچو جو لڑکا اپنے ماں باپ کو پیار نہیں کر سکتا وہ کسی اور کو پیار کرے گا؟''

میں نے کہا'' پٹنا اور بات ہے پیار کرنا اور۔ ممکن ہے ماں باپ سے خیالات نہ ملتے ہوں''

آپ بولے'' جہاں پیار ہوگا وہاں نفرت آ ہی نہیں سکتی۔ مجھے ایسی شادی نہیں کرنی ہے''

میں نے کہا'' جن لڑکوں کو آپ نے رد کر دیا کیا وہ ساری عمر کنوارے ہی رہیں گے''

بولے'' ہماری طبیعت نہیں ہے۔ اوروں کی طبیعت ہو جائے گی۔ میں ایسی شادی کرنا پسند نہیں کرتا۔''

میں نے کہا۔'' تو پھر بیٹھ کر ڈھونڈ ئے سال دو سال۔''

آپ بولے'' ابھی ہماری لڑکی کی عمر کیا ہے۔ ابھی ۲'۴ سال بھی ہم دیکھ سکتے ہیں۔''

جس گھر میں ہم لوگ تھے اس کے ایک حصے میں ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے۔ ان میں اور ہم میں ایک گھر کی طرح کا میل تھا۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ یہ دونوں ایک ہی گھرانے کے ہیں۔ وہ میڈیکل کالج میں ملازم تھے۔ ایک روز میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا'' دیکھو کالج میں کوئی لڑکا ہے۔''

میرے کہنے کے ۵'۱۰ دن بعد ہی ایک لڑکے کا فوٹو اور پتہ انھوں نے مجھے لا کر دیا اور بولے۔ '' دیکھو اماں' یہ پسند ہو تو تجویز کراؤ'' اور ساتھ ہی میں یہ بھی کہا'' یہ بی۔ اے' کے دوسرے سال میں ہے۔'' میں نے فوٹو بابو جی کو دیا اور ڈاکٹر سے کہا'' آؤ' سب باتیں تفصیل میں بتاؤ۔''

ڈاکٹر نے کہا پہلے فوٹو دیکھیے بابو جی' بعد میں' میں سب بتاتا ہوں۔''

آپ فوٹو دیکھ کر بولے'' لڑکا تو اچھا ہے۔'' پھر مجھ سے کہا'' تمھیں کیسا لگا''؟

میں نے کہا'' مجھے تو پسند ہے۔''

اس پر آپ ہنس کر بولے'' شاید اس کی بھی ناک کا آپریشن ہوا ہے۔ بیٹی کی ناک بھی اسی طرح سے ٹھیک ہے۔''

پھر ڈاکٹر سے بولے۔'' اور سب بتاؤ بھائی۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا'' تین ہزار روپے سالانہ کی جائیداد بھی اس کے پاس ہے۔''

آپ بولے'' سب سے پہلے یہ بتاؤ لڑکے کی ماں ہے یا نہیں؟''

میں بولی'' ماں سے شادی کرو گے؟''

''بھائی میں نے ایک لڑکے کو تو چھوڑ دیا ہے ماں ہی کے نا ہونے کی وجہ سے۔ اب دوسرے کے لیے کیوں نہ پوچھوں۔''

ڈاکٹر بولا ''ماں بھی ہے' دو بہنیں ہیں' ایک چھوٹا بھائی ہے۔ وہ بھی پڑھ رہا ہے۔ دونوں بہنوں کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک پریاگ (الہ آباد) میں بیاہی گئی ہے دوسری جبل پور میں۔ جب ان کے پتا مرے تھے یہ محض نو سال کے تھے۔ ان کی عمر اب اس وقت ۲۳ برس کی ہے۔ پتا کے مرنے پر بہنوئی نے آ کر زمینداری کی دیکھ بھال کرنا شروع کی۔ یہ دونوں بھائی جبل پور میں پڑھتے ہیں۔ میں نے آپ کے پوچھنے کے پہلے ہی سب باتیں جانچ کر لی ہیں۔'' آپ بولے ''اس لڑکے کا مزاج کیسا ہے اور ماں کا کیسا ہے؟''

ڈاکٹر نے جواب دیا ''لڑکا خیالات اور مزاج کا بہت اچھا ہے۔ پڑھنے میں بھی ذہین ہے ماں کا بھی مزاج بہت اچھا ہے۔ میں نے تو یہاں تک ان سے کہہ دیا ہے کہ اس بچی کو میں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ اور میں تو یہاں تک کہہ چکا ہوں کہ اگر کسی بات کی شکایت ہوئی تو میں منھ تک نہ دکھا سکوں گا۔''

تب آپ بولے ''ہاں بھائی بہت دور کا معاملہ ہے سب طرح جانچ پڑتال کر لینا چاہیے۔ بعد کو کوئی خرابی ہو تو بے چاری جیون بھر روتی رہے گی۔ اور رونا کیا اس کی تو زندگی چوپٹ ہو جائے گی۔ اور ہم بھی جب تک جیتے رہیں گے۔ روتے رہیں گے۔ یہ سب باتیں سوچ لو۔''

ڈاکٹر نے کہا ''میں تو سب طرح جانچ کر لی ہے۔ آپ بھی خط لکھ کر سب پوچھ گچھ کر لیجیے۔ کون شادی ابھی ہوئی جا رہی ہے۔''

''بھائی' شادی بیاہ کے بارے میں تو میں بہت ڈرتا ہوں۔ اور شادی اس دور بہت مشکل ہو بھی گئی ہے۔ آج کل کے لونڈے ماں باپ کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں دوسروں کو کیا پوچھیں گے' انھوں نے کہا۔

بابو جی ابھی اچھے لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔ ہاں کچھ ہیں جو سر پھرے ہو گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

آپ بولے ''کہیں انھیں میں سے کوئی میرے سر نہ پڑ جائے۔''

میں نے کہا ''اگر قسمت میں یہی لکھا ہوگا تو کیا کرو گے؟''

آپ بولے ''انسان تقدیر اور تدبیر دونوں کو لے کر چلتا ہے۔''

میں بولی ''سب ہی اچھا اچھا کرتے ہیں' مگر برا کون کرتا ہے؟''

آپ نے کہا" اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آنکھ بند کر کے چلیں۔"

میں نے کہا" خیر پہلے خط تو لکھیے۔"

ان باتوں کے بعد انھوں نے لڑکے کے بہنوئی کو شادی کے لیے خط لکھا۔ خط پوسٹ کرنے کے بعد آپ ادھر ادھر پتہ لگانے لگے۔ میرے بھائی کو الہ آباد خط لکھا۔ لڑکے کی بہن جہاں بیاہی تھیں وہاں کی خبر لینے کے لیے میرے بھائی کو بھیجا۔ بھائی کا دو تین دن ہی میں آ گیا۔ لکھا تھا کہ مجھے تو یہی معلوم ہوا ہے کہ لڑکا اچھا ہے۔ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔"

آٹھ دس روز کے بعد لڑکے کے بہنوئی کا خط آیا۔ انھوں نے جائیداد وغیرہ کی پوری تفصیل لکھی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ اسی صوبے کے جالون کے پاس کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں لکھنو اپنے ایک دوست کی بیمار بیوی کو دیکھنے آنے والا ہوں آپ کے ہی یہاں ٹھہروں گا تب جو کچھ آپ کو اور پوچھنا ہو پوچھ سکتے ہیں۔ اور آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ میرے بارے میں جو پوچھنا ہے پوچھو تو اس کے متعلق مجھے یہی کہنا ہے کہ سورج کو چراغ سے نہیں دیکھا جاتا۔ آپ کو تو میں بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ میں ہی کیا لڑکے کے پتا بھی آپ کے ناولوں کے دلدادہ تھے۔"

خط کے آٹھ دس روز بعد وہ خود آئے۔ تین آدمی ساتھ تھے۔ سب ہمارے گھر ٹھہرے۔ اس روز آپ کو اور جو باتیں کرنی تھیں آپ نے کہیں۔ جس روز وہ صاحب آئے اسی روز آپ نے ان سے کہا" اگر لڑکی آپ کو دیکھنی ہو تو آج دکھا سکتا ہوں' بعد میں نہیں دکھا سکوں گا۔"

انھوں نے کہا" آپ کو میں نے دیکھا لڑکی دوسرے رنگ کی تھوڑے ہی ہوگی۔ ہاں لڑکے کی ماں کے لیے فوٹو کی ضرورت ہوگی۔"

میں نے کہا" ماں تو آ کر دیکھ سکتی ہیں۔"

تینوں آدمی آٹھ دس روز ہمارے مہمان رہے۔ تین طرح کے فوٹو کھنچوا کر انھیں دیے گئے۔: ایک میں میں' بیٹی اور بنو تھے۔ ایک میں بیٹی ڈاکٹر کی لڑکی کو لیے کھڑی تھی اور ایک اکیلی بیٹی کا فوٹو تھا۔ تصویریں دینے کے بعد تینوں آدمیوں کو بدائی دے کر رخصت کیا گیا۔

جانے کے آٹھ دس روز بعد پھر ان کا خط آیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ لڑکا اپنے گھر کا مالک ہے۔ اس لیے لڑکے کی بہن اور وہ خود لڑکی دیکھنے آئیں گے۔

یہ خط پڑھ کر آپ کو سخت غصہ آیا۔ گھر آ کر مجھ سے بولے" مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے یہ لڑکا بھی سر

پھرا ہے۔ کیا باپ نہ ہو تو کوئی بزرگ سر پر نہیں رہتا؟ جب اس کا بڑا بہنوئی آ کر دیکھ گیا تو آگے کیا دیکھنا ہے؟ اسے بہنوئی کی بات پر یقین کرنا چاہیے تھا۔ اور بہنوئی بھی کوئی گنوار نہیں ہیں۔ اچھا سمجھدار آدمی ہے۔ اگر لڑکا ایسا ہی ہے تو میں خود اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی نہیں کروں گا۔ میں خط لکھ رہا ہوں مجھے ایسی شادی نہیں کرنی ہے۔ میں مالک کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا لڑکے کے ساتھ چاہتا ہوں۔ جو میرے سامنے آئے لڑکا ہو کر آئے۔ مالک بن کر نہیں۔ آپ کو جو فوٹو میں نے دیے ہیں لوٹا دیجیے۔ اور اب مجھے بیاہ کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھیے گا''۔

وہاں سے دوسرا خط آیا۔ انھوں نے لکھا' میں نے جو یہ کہا تھا کہ لڑکا گھر کا مالک ہے تو یہ غلطی میری تھی۔ میں نے آپ کو اسی لیے لکھا تھا کہ لڑکے کے پتا کے نہ ہونے سے بات طے کرنے کی ذمہ داری میری تھی۔ میں بھی دنیا سے اسی طرح ڈرتا ہوں' جیسے آپ۔ میں چاہتا تھا آگے پیچھے کوئی بات ہو تو میں الزام سے بری رہوں''۔

خط کے ساتھ لڑکے کی رضا مندی کا بھی خط تھا۔ لڑکے واسودیو پرساد نے خط میں لکھا تھا' شادی مجھے منظور ہے۔ اس کا خیال رہے کہ جس گھر میں میری شادی ہو وہ گھر دیوالیہ نہ کیا جائے کیونکہ شادی بیاہ ایک دن کا رشتہ نہیں۔ یہ ہمارا ان کا رشتہ تین پشتوں کا ہوگا۔ اس لیے آپ ان کو دیوالیہ نہ کیجیے گا۔'' یہ خط واسودیو پرساد نے اپنے بہنوئی کو لکھا تھا۔

اس خط کو پا کر آپ بہت خوش ہوئے اور مجھ سے بولے ''لڑکا بہت سمجھدار ہے۔''

وہ خط انھوں نے مجھے دیا۔ ہندی میں تھا۔ میں بولی'' آپ انھیں لکھیے کہ ان کی ماں اور بہنوں میں سے جو بھی آ سکتی ہوں دیکھنے آئیں۔''

بابو جی نے خط لکھا میں خود چاہتا ہوں کہ سمدھن صاحبہ یا ان کی بہن آ کر دیکھ جائیں۔ میری رائے میں سمدھن صاحبہ آئیں تو زیادہ اچھا ہو۔''

خط جانے کے ۱۵ دن بعد ان کے بہنوئی اپنی بیوی کے ساتھ آئے۔ دو تین روز رہنے کے بعد واپس جانا چاہتی تھیں۔ مجھ سے بابو جی بولے ''ابھی مت جانے دو۔ دس پندرہ روز رہ لیں تو جائیں۔ محض صورت دیکھ لینے سے کیا ہوتا ہے' ساتھ رہ کر اس کے خیالات اور مزاج سے بھی آگاہ ہو جائیں۔ صورت شکل اگر بہت اچھی ہو بھی اور مزاج کی اچھی نہ ہو تو کیسا لگے گا۔ جو باتیں انھیں معلوم نہ ہوں تم بتا دو کہ اس طرح دیکھو۔''

میں بولی'' کیا انھیں دیکھنا نہیں آتا جو میں بتلانے جاؤں۔''

آپ بولے'' واسودیو کے خط پڑھنے سے تو میرے دل میں اس کے لیے اپنے لڑکے کی سی محبت پیدا ہوگئی ہے۔ چاہے شادی نہ ہو تو بھی اس کے لیے یہ محبت قائم رہے گی۔''

وہ بیٹی کے ساتھ خوب ہل مل کر رہ رہیں۔ بیٹی کو معلوم تو تھا نہیں وہ بھی خوب کھل کر رہتی تھی۔ ایک دن میں نے واسودیو کی بہن سے کہا'' بیٹی تمھیں جو کچھ کہنا ہو مجھ سے کہو۔''

وہ بولیں'' اماں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ آپ یقین جانو وہ خط بھی آپ کو نہ لکھا جاتا' پر اتنی بڑی ذمہ داری وہ اپنے سر کیسے لیتے۔''

جب میں نے بابو جی کو ساری باتیں کہہ سنائیں تو بولے'' ایک بات تم اور پوچھ لو میرے ایک ہی بیٹی ہے بدائی وِدا میں جھنجھٹ نہ پڑے''۔

میں نے واسودیو کی بہن سے کہا کہ'' یہ بات ہے کہ وِدا کی شکایت کبھی نہ ہو؟''

لڑکی بولی'' اماں اس کی شکایت کبھی نہیں ہوگی'' پھر بھی بابو جی کے پاس جا کر اس نے کہا' اب ہمیں لڑکی والا ہی سمجھیے۔ یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ میری ماں نے مجھ سے کہنے کو کہا ہے۔''

آپ بولے'' یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم لوگ تو ہو ہی میرے۔''

'' بابو جی آپ کے لڑکے ابھی چھوٹے ہی ہیں'' واسودیو کی بہن نے کہا'' آپ لکھیں گے تو بھیا خود پہنچا جایا کریں گے۔ اور جو خط میں لکھا گیا تھا آپ بھول جایے۔ اگر میرے پتا آج کو زندہ ہوتے تو آپ کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔''

اس کے بعد ان لوگوں کو بدا کیا گیا۔

پھر یہ طے ہوا کہ برچھا جانا چاہیے

میں نے کہا'' دور بہت ہے۔ میری ہمت گواہی نہیں دے رہی ہے''۔ آپ بولے'' اگر پاس پیسہ ہو تو دور کیا ہے۔ جب تک ہم لوگ ہیں پیسے کی کمی نہیں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ تمھارے اور کوئی لڑکی نہیں ہے۔ مان لو تم نے لڑکی کا بیاہ پاس میں ہی کیا پر لڑکا کسی کام سے دور بھی جا سکتا ہے نا۔ تب تمھارے لیے دور و نزدیک سب برابر ہوتا۔ پھر واسودیو سا لڑکا ملنا مشکل ہے۔ پتہ نہیں میرے بیٹے اس طرح ہوں گے کہ نہیں۔ مجھے تو واسودیو اپنا ہی بڑا لڑکا لگ رہا ہے۔ خط دیکھو کتنی تہذیب کا ہے۔ لکھتا ہے کہ اس گھر کو دیوالیہ نہ کیا جائے' ہمارا ان کا رشتہ تین پشتوں کا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے

ہمیشہ کا ۔۔ دیکھتی نہیں ہو آج کل کے لونڈوں کو۔ چاہتے ہیں کہ کسی طرح بھی روپے ہاتھ آئیں' چاہے چوری کرنے سے' چاہے ڈاکہ ڈالنے سے۔ اب ایشور کا نام لے کر مجھے جانے دو۔''

میں بھی راضی ہوگئی۔

جب وہاں سے لوٹے تو آپ مجھ سے بولے ''لڑکا بہت اچھا ہے اور میرے ہی خیالات کے اس کے پتا بھی تھے۔ ہمیشہ وہ سودیشی (اپنے ملک کا) پہنتے تھے۔ جن دنوں بنگال کے دو ٹکڑے ہوئے تھے وہ بھی جیل گئے تھے۔ حالانکہ ان کے جیل جانے کے بعد وہاں کی پبلک خوب لڑی اور پبلک نے اس لڑائی میں کوئی چار ہزار روپے برباد کیے۔ (لڑکے کے باپ) دیوری کے لاٹ کیے جاتے تھے۔ یہ سمبندھ بہت اچھا ہوگا۔''

اس کے بعد آپ لکھنؤ سے بیاہ کی سب تیاری کر کے بنارس آئے۔

جب دوار پوجا کا وقت ہوا تو آپ نے اپنے بڑے بھائی کو بھیجا۔ وہ بھی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ براتیوں میں سے کچھ نے اودھر ادھر بتاشے پھینکے۔ یہ انھیں اچھا نہ لگا۔ مجھ سے بولے ''تم دروازے پر پیسے لٹادو۔''

میں بولی ''یہ وقت ان کے پیسے لٹانے کا ہے۔''

آپ بولے ''تم واسودیو کو چھوڑ کر سبوں کو پیسوں سے مارو۔''

میں نے اپنی بھابھی سے کہا ''تھوڑا اکشت (بغیر ٹوٹے چاول کے دانے) ڈال کر پیسے لیتی آؤ۔''

اور ان سے کہا ''آپ لٹائیے۔''

''نہیں تم خود لٹاؤ'' انھوں نے مجھ سے کہا۔

بارات جنوا سے (رات کو ٹھہرنے کی جگہ) گئی۔ میں اس کے بعد بولی ''دوار پوجا آپ کو کرنا چاہیے تھی۔

آپ بولے ''مجھ سے یہ رسمیں نہیں ہوں گی۔''

میں بولی ''ابھی کنیادان تو آپ کو کرنا ہی ہوگا۔''

آپ بولے ''کنیادان کیسا؟ بے جان چیز دان میں دی جاتی ہے۔ جاندار چیزوں میں تو ایک گائے ہی ہے جو دی جا سکتی ہے۔ پھر لڑکی کا دان کیسا؟ یہ مجھے پسند نہیں۔''

میں بولی ''اس رسم کو تو تمھیں کرنا ہی ہوگا۔''

بولے ''تو کیا میں اپنی لڑکی کو دان دے دوں؟ یہ میں نہیں کر سکتا۔''

''بچوں کی سی بات مت کیجیے'' میں نے کہا ''کنیا دان کیا ہوتا نہیں ہے۔''

''تم کو کرنا ہو تو کرو۔ میں نہیں کروں گا۔''

آخر کسی طرح وہ منڈپ میں آئے پر کنیا دان مجھے ہی کرنا پڑا۔ وہ بیٹھے رہے۔ جب شادی ہوگئی تو واسودیو کا نائی بولا ''صاحب مجھے اس وقت نچھاور چاہیے۔''

آپ بولے ''کتنا چاہیے بتاؤ۔''

اس نے کہا ''کم سے کم دس روپے چاہئیں''۔

آپ نے اپنی جیب سے روپے نکال کر بیٹی کے سر پر گھما کر نائی کو دے دیے۔ نائی خوش ہوگیا۔

جولائی میں واسودیو کا خط آیا ''اب آگے میں کیا پڑھوں؟'' خط پڑھ کر آپ بولے ''میری رائے میں تو وہ الہ آباد قانون پڑھنے جائے۔''

میں نے کہا ''میری بھی یہی رائے ہے۔ قانون ہی اس کے لیے اچھا ہوگا۔''

آپ بولے ''ہاں' گھر کا وہ مالگزار ہے۔ ساگر میں وکالت کرے گا۔ اپنی زمینداری بھی دیکھے گا۔ نہیں تو باہر جانے سے زمینداری میں نقصان ہوگا۔''

یہی بات اسے لکھ دی خاص طور پر یہ بھی لکھا کہ خوب محنت سے پڑھو۔

تب سے واسودیو کو بھی اپنے لڑکے سے بھی زیادہ سمجھنے لگے۔ اس کی ضرورتیں باریکی سے آپ دیکھا کرتے۔ ایک بار وہ لکھنؤ آیا۔ ان کو معلوم ہوا کہ لکر گنج سے میور کالج تک اسے جانا پڑتا ہے۔ اسے سائیکل چاہیے۔ آپ نے مجھ سے روپے لیے اور جا کر سائیکل خریدی۔ جب سائیکل گھر لائے تو بولے ''اوپر سے واسودیو کو بلا دو۔ اپنی سائیکل آکر دیکھ لے' اور جو اس میں کمی ہو بتائے۔''

میں نے اوپر آواز دی اور کہا ''واسودیو اپنی سائیکل دیکھ لو' جو کمی ہو بتاؤ۔''

وہ دیکھ کر بولا ''سب ٹھیک ہے۔''

وہ (داماد کے پاس) جس چیز کی کمی محسوس کرتے فوراً خرید کر بھیجتے۔

واسودیوان سے ڈرتا بہت تھا۔ جتنی باتیں آپ پوچھتے بس انھی کا جواب وہ دیتا۔ اس پر آپ مجھ سے کہتے ''یہ لڑکا مجھ سے ڈرتا بہت ہے۔''

میں بولی ''دھنّو اور اس میں فرق ہے۔ وہ لحاظ کرتا ہے۔''

آپ بولے'' مجھے تو دھنّو اور وہ برابر لگتے ہیں۔''

کئی بار واسودیو کے خط آئے۔ انھیں ایک آدھ غلطیاں تحریری ہوتی تھیں۔ ان غلطیوں کو درست کر کے آپ خط اسے واپس بھیج دیتے اور لکھتے ''اپنی انگریزی ٹھیک کرو۔ جب بھی اس طرح کی غلطی انھیں نظر آتی تو خط اسے واپس کر دیتے۔

ایک بار میں بولی ''وہ اپنے دل میں کیا سوچتا ہوگا؟''

آپ بولے'' کیا سوچے گا۔ میں ایسے ہی دھنّو وغیرہ کو بھی لکھا کروں گا۔ کیا وہ اپنا لڑکا نہیں ہے جو اسے اس کی غلطی نہ بتاؤں!''

وہ اردو نہیں جانتا تھا۔ اسے اردو سکھانے کی کوشش کرتے۔ بیٹی کی شادی میں آپ نے اتنے بڑے بڑے پیتل کے پتیلے (بٹولے) دیے کہ اکیلی وہ انھیں نہ اٹھا سکی۔

ایک دن میں بولی'' آپ نے اتنے بڑے بڑے بے مصرف برتن کیوں دیے؟'' کسی دن بیٹی کو انھیں اُتارنا پڑ جائے تو! بیٹی کیسے اٹھا سکے گی۔''

آپ بولے ''بیٹی کو اتارنے کے لیے تھوڑے ہی میں نے دیے ہیں۔ جب تک یہ چیزیں رہتی ہیں تب تک یاد رہتا ہے۔ کئی پشتوں تک لوگ یاد کرتے ہیں۔''

''تو کیا دیکھنے کے لیے دیے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''اور کیا'' آپ بولے'' کسی کام میں آئیں گے۔ روپے تو خرچ ہو جاتے ہیں۔ چیزیں بچی رہتی ہیں''۔

جب واسودیو آتا تو اس کی گھر گرہستی کے بارے میں ضرور پوچھتے۔''

ایک بار کی بات ہے واسودیو بیٹی کو لے جانے آیا۔ اس بار میں نے کہا'' ابھی ودائی نہیں کروں گی۔''

''واسودیو نے میرے سامنے تو کچھ نہیں کہا لیکن میرے گھر میں جو ایک پنڈت جی تھے ان سے بولا ''آپ گھر میں کہہ دیں تو اچھا ہو' کھانا بنانے والا کوئی نہیں ہے۔''

میں نے یہ بات سن کر آپ سے کہا کہ ایسا کہتے ہیں۔

آپ بولے ''ان سے کہہ دو ابھی بنی گھر گرہستی دیکھنے نہیں جائے گی۔ ان کی بہن کہاں گئی؟''

میں بولی ''ان کی وہ بہن بھوپال گئی ہیں۔ وہاں انہیں وثیقہ ملا ہے۔ وہ ان کی خالہ زاد بہن ہیں۔ سال کے سال باہر رہیں گی۔ تو ان کا وثیقہ بند ہو جائے گا۔''

''کتنا وثیقہ ملتا ہے؟ آپ بولے۔

''پچیس روپے ملتے ہیں'' میں نے کہا۔

''ان کا پتہ لے لو۔ پچیس میں بھیجا کروں گا۔ پتہ واسودیو سے پوچھ لو'' انھوں نے کہا۔

''سال دو سال کا معاملہ نہیں ہے' جیون بھر کا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنی زندگی بھر دیتا رہوں گا۔''

میں نے ان کی اس بات کو ہنسی میں ٹال دیا اور واسودیو سے ایسی کچھ بات بنائی کہ وہ چپکے سے واپس چلے گئے۔

لکھنؤ کی ہولی

ہولی کی بات ہے۔ میرے داماد واسودیو پرساد پریاگ (الہ آباد) میں وکالت پڑھ رہے تھے۔ ان کو بھی ہولی پر بلایا گیا تھا۔ بڑا لڑکا دھنو رنگ کے ڈر سے باہر بھاگا۔ واسودیو پرساد اور بنو اوپر جا کر کوٹھے کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے۔ لیکن آپ اپنے کمرے ہی میں رہے۔ جو بھی آتا رنگ اور ابیر ان پر مل جاتا۔

(ابیر ایک طرح کا رنگین پاؤڈر یا برادہ جس سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔ عبیر ایک خوشبودار پاؤڈر ہوتا ہے صندل گلاب مشک وغیرہ کا مرکب جو کپڑوں پر چھڑکا جاتا ہے یا چھڑکا جاتا تھا)

ان دنوں آپ کو کھانسی آرہی تھی جب کئی آدمی انھیں نہلا کر چلے گئے۔ تو میں بولی ''آپ کو کھانسی کا ڈر ہے کہ نہیں؟''

بولے ''دونوں لڑکے اور داماد بھاگ گئے۔ میں بھی ویسا ہی ہو جاؤں۔ آخر یہ لڑکے ہیں کہاں؟''

میں نے کہا ''دھنو تو باہر بھاگ گیا تھا باقی دونوں اوپر کمرہ بند کیے بیٹھے ہیں۔''

آپ نے نیچے سے آواز دی" واسودیو پرساد دھنو کو لے کر یہاں آؤ۔"

جب وہ دونوں سامنے آئے تو بولے" بھائی رنگ کا اتنا ڈر! رنگ ہی تو ہے اور آج کے دن ہندو ہی رنگ کھیلتے ہیں۔ تم لوگ یہاں ہوتے تو تم پر رنگ پڑتا اور میں چھوٹ جاتا۔ دیکھو تم لوگوں کی غیر حاضری میں میں لڑکا بنا بیٹھا ہوں اور ہر کوئی رنگ سے نہلا جاتا ہے۔"

دوپہر تک نہ انھوں نے لڑکوں کو نہانے دیا نہ خود نہائے۔ بولے" تم لوگوں کے دل میں امنگ ہونی چاہیے۔ مجھ میں تو جس طرح کی امنگ لڑکپن میں تھی آج بھی جیوں کی تیوں ویسی ہی ہے۔ تم لوگ لڑکپن ہی میں ہمت اور امنگ اور خوشی سے لطف اندوز ہونا کھو بیٹھے!"

واسودیو سر جھکائے سنتا رہا۔ جب دھنو گھر لوٹا تو اس کو بھی پھٹکارا۔

دروازے کا خوف

سنہ ۲۸ کی بات ہے۔ آپ گوشت لینے بازار گئے۔ لوٹے کوئی ساڑھے نو بجے۔ دونوں بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ میں آنگن میں بیٹھی تھی۔ میرے آگے گوشت رکھ کر بولے" بستر اندر رکھوا دیا نا؟"

میں نے جواب دیا" یاد نہیں رہا اب جا کر خود رکھ آتی ہوں۔"

بولے" تم کہاں جاؤ گی میں خود رکھ آتا ہوں۔"

آپ بستر رکھ کر کمرے کا دروازہ بند کرنے لگے۔ جیسے اسے کھینچا وہ سر پر آگرا۔ اتفاق سے سیخچے لگے تھے اور اس کے نیچے بھی ڈھیلے گرے۔ دروازہ سیخچوں پر گر پڑا۔ بہت زور کی آواز آئی۔ جیسے ہی دروازہ گرنے کو ہوا دونوں پلے کھل گئے۔ آپ بیچ میں ہو لیے پیر میں چوٹ آ ہی گئی۔ مجھے بھی چوٹ لگی۔ خیر مجھے تو اپنی چوٹ محسوس نہیں ہوئی اور میں دوڑی اوپر پہنچی۔ دیکھتی ہوں آپ ایک کونے میں کھڑے کانپ رہے ہیں۔ غشی سی تھی۔ میں نے انھیں سنبھالا۔ جب ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو بولے" بڑی خیریت ہوئی نہیں تو آج ہم دونوں ختم تھے۔"
میں بولی" جب ہونی ہے اس سے پہلے کیا ہو سکتا ہے۔"
اس حادثے کے بعد سے وہ دروازے سے بہت گھبرانے لگے تھے۔

لکھنؤ کی آتش بازی

سنہ ۲۸ کے لگ بھگ کی بات ہے۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ مقام لکھنؤ۔ شاید وائسرائے آنے تھے۔ آپ

دفتر سے آئے۔ مجھ سے بولے" آج لکھنؤ میں کوئی چالیس ہزار آتش بازی اور روشنی پہ خرچ ہوں گے۔ شاید یہ سماں تم نے اپنی زندگی میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔"

میں بولی" کس کو فالتو پیسہ ملا ہے جو اتنی بے رحمی سے خرچ کر رہا ہے؟"

آپ بولے" خرچ کون کر رہا ہے میں پوچھتا ہوں چلوگی دیکھنے؟ چاہو تو بچوں کو بھی لیتی چلو سب کو دکھلا دو۔"

"آپ چلیں گے۔" میں نے پوچھا۔

آپ بولے' کیوں نہیں چلوں گا۔ غریبوں کا گھر پھونک تماشہ دیکھا جائے گا۔ اس میں ہم لوگ بھی اپنی آنکھیں سینک لیں گے۔ اور میں آہ بھر لوں گا اور اپنی بے حیائی کی ہنسی بھی ہنس لوں گا۔ اس کے آگے اپنا بس ہی کیا ہے۔"

میری سمجھ میں تب تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ روپیہ کہاں سے آیا ہوگا اور یہ ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ میں ہنس کر بولی" ابھی تک تو آپ نثر ہی لکھتے تھے' شاعر کب سے بن گئے جو شعروں میں بات کر رہے ہیں؟"

بولے" میں شعروں میں تو بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو اس ملک کی بیماری کا ذکر تم سے کر رہا ہوں"۔

"آپ کی یہ گول مول باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں" میں نے کہا" ذرا مجھے ٹھیک سے سمجھایئے۔"

آپ بولے" پہلے مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلاؤ۔"

میں اندر گئی اور وہاں سے تھوڑا سوکھا میوا اور ٹھنڈا پانی لا کر فرش پر رکھ دیا۔ اور وہیں میں بیٹھ گئی اور تینوں بچے بھی بیٹھ گئے۔ بچے میوہ کھانے لگے۔ آپ چلغوزے چھیل کر ایک ایک کر کے اپنے منہ میں رکھ رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ چلغوزے میں چھیل دوں۔ بولے" نہیں اگر تم چھیل کر دوگی تو میں اکٹھے کھا جاؤں گا۔ یوں میں ایک ایک چھیل کر ہی کھاؤں گا۔ اب سنو آتش بازی کی بات۔ جو راجہ مہاراجہ ہر سال یہاں آتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ اسی لیے یہاں رکھتے جاتے ہیں کہ جب جب وائسرائے اور ولی عہد یہاں تشریف لائیں تو وہ رقم ان کے استقبال میں صرف ہو۔ اور جتنی کمی پڑتی ہے وہ تمھارے یہاں کے کاشت کاروں سے پوری کی جاتی ہے۔ ان غریبوں کے خون کی کمائی کوڑا گھاس کی طرح آتش بازی میں پھونک دی جاتی ہے۔ جس ملک کے انسان کی اوسط کمائی چھ پیسے روز ہو اس ملک میں کسی کو کیا حق ہے کہ ایک ایک شہر میں چالیس چالیس اور پچاس

پچاس ہزار روپے آتش بازی میں پھونکے جائیں۔ جہاں پر تن ڈھانکنے کو کپڑا نہ ہو دونوں جون روکھی روٹیاں بھی نہ ملیں۔ اس ملک میں اس بے رحمی سے پیسہ پھونکا جائے اور اس لیے کہ وائس رائے صاحب خوش ہوں گے اور ان موٹے آدمیوں کو خطابات دیں گے؟"

لڑکوں نے جب روشنی کا نام سنا تو سب آپ کو پکڑ کر شور مچانے لگے کہ چلیے بابو جی چلیے۔ آپ لڑکوں کو تسلی دیتے ہوئے بولے "ابھی نہیں تم جا کر کھیلو۔ رات میں روشنی ہوگی" لڑکے کچھ دیر کے لیے باہر چلے گئے۔ میں بولی "تو یہ لوگ پیسہ دیتے ہی کیوں ہیں؟"

آپ بولے "اگر دیں گے نہیں تو کیا وہ زندہ رہ پائیں گے؟ یہ موٹے موٹے آدمی اُن کو کھا جائیں گے یا چھوڑیں گے؟"

میں بولی "جب انھیں ہر حالت میں مرنا ہی ہے تو کچھ کر کے کیوں نہیں مرتے۔ ایسی زندگی سے تو کہیں بہتر ہے کہ کچھ کر کے مریں۔"

"یہاں ۸۰ فیصد کاشت کار ہیں، ۲۰ فیصد اور لوگ باقی بچتے ہیں، جس میں پڑھے لکھے، مالدار، ملازمت پیشہ (برسرِ روزگار) سب ہیں اگر ان میں اتنی ہی طاقت اور عقل ہوتی تو آج یہ مٹھی بھر انگریز ہمارے دیش میں ڈیڑھ سو سال سے راج نہ کر رہے ہوتے۔ مگر ان میں نہ تو طاقت ہے نہ عقل"۔

"تو کیا سب نکمے ہیں؟"

اس پر آپ بڑی گہرائی کے ساتھ بولے "ہاں یہ سب دیکھ کر تو یہی کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ سب نکمے ہیں۔ اور شاید ملک یہ قدم اٹھانے کے لیے ابھی تیار بھی نہیں ہے۔"

"کیا یہی لوگ تیار ہوں گے؟" میں بولی۔

کہنے لگے "اس میں نہ غصے میں آنے کی بات ہے نہ ہنسنے کی، بلکہ یہ تو آنسو بہانے کی بات ہے۔"

میں نے کہا "سب ہی خوش ہیں۔ کوئی بھی آنسو نہیں بہا رہا ہے۔"

آپ بولے "تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم پہ اتنی بے حسی چھائی ہوئی ہے کہ درد ہی ہم محسوس نہیں کرتے" آپ نے جواب دیا "شاید مہاتما گاندھی کچھ کر جائیں، نہیں تو پھر اسی طرح سہتے سہتے حالت خراب ہوتی چلی جائے گی۔ جب انسان خود مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تب ہی اس میں دوسرے کو مارنے کی شکتی آتی ہے۔"

''جب انسان خود ہی مر جائے گا تو کسی کو کیا کھا کے مارے گا'' میں نے کہا'' ایسے میں تو انسان خود ہی مٹ جائے گا۔''

آپ بولے'' تم کو وہ کہاوت یاد ہے کہ نہیں' مرتا کیا نہ کرتا؟ وہ حالت جب انسان کی ہو جاتی ہے تب وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان کو تھوڑا سا بھی سکھ ملتا رہتا ہے' تب تک اس سے سکھ کا موہ چھوڑا نہیں جاتا۔ آئندہ کی امید بندھی رہتی ہے۔ جب انسان سمجھ لیتا ہے کہ مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تو وہ مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو انگریز یہاں کیا وصول کرنے آتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

وہ بولے'' مانا کہ انگریز وصول کرنے نہیں آتے پر ایک شہ زور ہی تو کمزور کو چوس رہا ہے''۔

میں نے کہا'' جب اپنی حکومت (سوراجیہ) ہو جائے گی تب کیا چوسنا بند ہو جائے گا؟''

آپ بولے'' چوسا تو تھوڑا بہت ہر جگہ جاتا ہے۔ یہی شاید دنیا کا دستور ہو گیا ہے کہ کمزور کو شہہ زور چوسیں۔ ہاں روس ہے جہاں بڑوں کو مار مار کر درست کر دیا گیا ہے۔ اب وہاں غریبوں کو سکون ہے۔ شاید یہاں بھی کچھ دنوں بعد روس جیسا ہی ہو۔''

میں نے کہا'' کیا اس کی کچھ امید ہے؟''

آپ بولے'' ابھی جلد ہی تو اس کی کوئی امید نہیں۔''

میں بولی'' اگر مان لیا جائے کہ جلد ہی ایسا ہو گا تو آپ کس کا ساتھ دیں گے؟''

آپ بولے'' مزدوروں اور کاشت کاروں کا۔ میں پہلے ہی سب سے کہہ دوں گا کہ میں تو مزدور ہوں۔ تم پھاوڑا چلاتے ہو' میں قلم چلاتا ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔''

میں ہنس کر بولی'' اس طرح کہنے سے کام نہیں چلے گا''۔ ویسے وہ تمھارا یقین بھی نہیں کریں گے''

بولے'' تب تک سب پڑھ لکھ جائیں گے۔ کیا روس میں لیکھک نہیں ہیں۔ وہاں کے لیکھکوں کی حالت یہاں کے لیکھکوں کی حالت سے اچھی ہی نہیں' کئی گنا اچھی ہے میں تو اس دن کی دعا مانگتا ہوں کہ جلد آئے''

''تو کیا روس والے یہاں بھی آئیں گے؟''

''روس والے یہاں نہیں آئیں گے' روس والوں کی طاقت ہم لوگوں میں آئے گی۔''

''وہ لوگ یہاں آئے تو شاید ہمارا کام جلدی ہو جاتا۔''

''وہ لوگ یہاں نہیں آئیں گے' ہمی لوگوں میں وہ طاقت جاگ اٹھے گی۔ وہی ہمارے سکھ کا دن ہوگا۔ جب یہاں کاشت کاروں اور مزدوروں کا راج ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ آدمیوں کی زندگی دونی ہو جائے گی۔''

''وہ کیسے ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

آپ بولے'' سنو وہ اس طرح ہوگا کہ ابھی ہم کو رات دن محنت کرنے پر بھی پیٹ بھر آرام سے روٹی نہیں ملتی۔ رات دن' کچھ نہ کچھ فکر لگی رہتی ہے۔''

میں نے کہا'' تو فکر ہم لوگ اپنے آپ ہی تو کرتے ہیں۔ مزدوروں کا راج آجانے پر کیا ہم کو فکروں سے چھٹی مل جائے گی۔؟''

آپ بولے'' کیوں نہیں چھٹی مل جائے گی؟'' ہم کو آج معلوم ہو جائے کہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہمارے بیوی بچوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی' اور اس کی ذمہ داری ہمارے سر پر نہیں' حکومت کے سر پر ہے تو ہمارا سر کیا پھر گیا ہے کہ ہم اپنی جان کھپا کر رات دن محنت کریں اور آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ کاٹ کر اپنے پاس جمع کرنے کی کوشش کریں ؟ ہم کو آج معلوم ہو جائے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے بال بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی تو ایسا کون آدمی ہے کہ آرام سے کھانا پہننا نہیں چاہے گا؟''

میں نے کہا'' میں آپ کے منہ پر ایک درجن نام ایسے گنا سکتی ہوں جنھوں نے بڑھوتی (بڑھاپے) میں شادی کی جب کہ پہلی بیوی سے بھی لڑکا لڑکی دونوں موجود تھے۔ وہ جو کچھ کماتے تھے سولھوں آنے خرچ کر ڈالتے تھے۔ اور مرنے کے بعد انھوں نے اپنے کفن کو بھی ایک پائی نہیں چھوڑی۔ لیکن ان کو کوئی فکر نہیں کھائے جاتی تھی اور بھگوان کے سہارے زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ کئی ایسے آدمیوں کے نام گنا سکتی ہوں جو کافی مالدار ہیں اور ان کے فکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے پھر بھی رات دن کوئی نہ کوئی فکر اپنے سر پر سوار رکھتے ہیں۔''

آپ بولے'' اگر ایسے زمانے میں جیسا آج ہے کہ چاروں طرف کہرام مچا ہوا ہے کوئی اپنی اور اپنے گھر بار کی فکر نہ کرتا ہو۔ اور بھگوان کے سہارے خوش بیٹھا رہتا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پرلے درجے کا بے حیا ہے۔ بال بچوں کے ہوتے ہوئے جو بڑھاپے میں شادی کرے اس کے لیے میرے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ اور جو اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے فکر کرے' جیسے مہاتما

گاندھی تو وہ میری نگاہ میں بہت بڑا مقام رکھتا ہے۔''ہم لوگوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ لڑکے پھر پہنچ گئے اور بولے''چلیے بابوجی۔وقت ہوگیا۔سب لوگ ادھر جا رہے ہیں۔''

سب کو ساتھ لے کر وہاں گئے' ساتھ میں میں بھی تھی۔سب لوگ تو خوش خوش آتش بازی دیکھ رہے تھے آپ ایسے بیزار سے' اداس ایک طرف کو بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے اپنے ہی گھر کی دولت پھونکی جا رہی ہو۔

ایک آدھ گھنٹے بعد سب کو واپس لے آئے۔لڑکے واپس نہیں آنا چاہتے تھے۔آپ بولے۔''میرے سر میں درد ہو رہا ہے''۔

چلے تو آئے مگر آتش بازی کے پھونکے جانے کا مہینوں رنج رہا۔پچیسوں بار گھر میں انھوں نے اس کی برائی کی''ہمارے ملک کا پیسہ ایسی بے رحمی سے خرچ ہوتا ہے کہ ہاتھ مل کر رہ جانا پڑتا ہے۔مگر اپنا بس ہی کیا ہے۔''

میں بولی''تو آپ روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

''ارے بھائی میرے بس کی بات ہوتی تو میں آج زمین ہی پر کیوں رہتا آسمان پر نہ اڑا کرتا! مگر افسوس تو یہی ہے کہ اپنا کوئی بس نہیں ہے۔''

میں بولی''جہاں اپنا کوئی بس نہیں وہاں افسوس کرنا بے کار ہے۔''

بولے''چاہے کچھ بھی ہو۔جس بات کا ہم کو درد ہوتا ہے وہ جلدی بھلا نہیں دی جا سکتی۔''

''بہت لوگوں نے آتش بازی دیکھی ہوگی اور دیکھ کر خوش ہوئے ہوں گے اور آتش بازی کی تعریف بھی کی ہوگی کہ کیسی اچھی تھی اور آپ بیٹھے بیٹھے آتش بازی کی برائی کر رہے ہیں''میں نے کہا۔''اس کا نام بے حسی ہے۔وہی بے حسی تو ہم لوگوں پر چھائی ہوئی ہے کہ اپنا گھر پھونک تماشہ دیکھیں اور خوش ہوں''انھوں نے جواب دیا۔

میں بولی''وہ آپ سے زیادہ سمجھدار ہیں جو خوش ہو رہے ہوں گے۔اور آپ تو اپنا دونا نقصان کر رہے ہیں۔ایک تو آتش بازی میں روپے پھونکا جائے اور آپ رات دن اس کا رونا روئیں۔کسے مزے مزے کی کہاوت کہتے ہیں'

رحیمن چپ ہو بیٹھیے ' دیکھ دِنن کو پھیر
جب نیکے دن آئے ہیں بنت نہ لگیہیں بیر''

(نیکا' اچھا' بھلا)

آپ بولے ''یہاں تمھارے جیسے دماغ کے آدمی رہے ہوں گے تب ہی تو یہاں کی آزادی چھن گئی۔ مجھے تو چھمن جی کی ایک چوپائی بہت اچھی لگتی ہے:

کایر من کر ایک ادھارا

دیو دیو آلسی پکارا''

(چوپائی' چار چھوٹی لائنوں کی نظم' کایر: بزدل' ادھارا: اسفل' گراہوا آدمی' دیودیو: ہائے نصیبہ' قسمت۔ دال پر زبر ہے' آلسی: نکما آدمی) میں بولی ''تو کیا کیا جائے؟ ہتھیلی پر سرسوں بھی تو نہیں جمے گی۔''

آپ بولے ''تمھاری رائے تو یہ ہے کہ خاموش ہوکر بیٹھ رہا جائے''

''سوچ کرنے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔کون مفت کی بک بک کرے'' یہ کہہ کر میں اٹھ کر چلی آئی۔

۱۹۲۹ء ۔ ہولی

کئی مسلمان ادیب آپ سے ہولی ملنے آئے۔ساتھ میں پھولوں کا ہار تھا اور ابیر بھی۔آپ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ان لوگوں نے آپ کو گلال لگا کر پان دیا۔اس ابیر کو ان لوگوں کو لگا کر گلے ملے۔ بڑی دیر تک وہ لوگ بیٹھے رہے۔اس کے بعد انھوں نے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔کھانا کھاتے ہوئے تینوں آدمیوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔میری ایک قربانی نام کی کہانی چھپی تھی۔اس پر ان لوگوں نے آپ کو مبارکباد دی تھی۔اور ہار اور اردو کا پرچا دیا تھا۔جب انھیں چھوڑ کر آئے تو اسی ہار اور اسی گلال سے مجھ سے ہولی کھیلے۔

میں بولی ''آپ نے بڑی دیر لگا دی۔''

آپ ہنستے ہوئے بولے ''کام تم کرو' بدھائی مجھے ملے۔''

میں بولی ''آخر ہے کیا؟ بتاؤ نا!''

آپ بولے ''تم نے جو قربانی نام کی کہانی لکھی ہے اسی پر ان لوگوں نے مجھے بدھائی دی ہے۔''

میں ہنستی ہوئی بولی ''پھر دیکھو' میں اب کی بار ایسی کہانی لکھوں گی جس سے آپ کی بدنامی ہو۔سمجھے نا!''

آپ ہنس کر بولے ''اس میں چڑھنے کی کون سی بات ہے۔مرد بڑے ہیں۔انھیں ہی سب کچھ ملتا ہے۔''

میں بولی ''اس (نئی کہانی) پر آپ کو گالیاں بھی ملیں گی۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ چلو دوسری کہانی نہیں لکھنی پڑے گی۔اسی پر مجھے لوگ بے مذہب بنا ڈالیں گے۔''

آپ بولے ''ہندوؤں کی بات تو نرالی ہوتی ہے۔''

''آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟'' میں نے پوچھا۔

آپ نے ہنس کر جواب دیا ''نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان۔''

میں نے کہا ''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ آپ ہندو تو ہیں ہی۔''

آپ نے کہا ''جس دھرم میں رہ کر لوگ دوسرے کا چھوا پانی نہیں پی سکتے اس دھرم میں میرے لیے گنجائش کہاں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندو دھرم کس پر ٹکا ہوا ہے؟''

میں ان پر چوٹ کرتی ہوئی بولی ''عورتوں کے ہاتھ پر''؟

آپ بولے ''اور ہندو دھرم سب سے زیادہ عورتوں ہی کو چوپٹ کر رہا ہے۔ ذرا سی غلطی عورتوں سے ہوئی اور ہندو سماج نے ان کا بائیکاٹ کیا۔ سب سے زیادہ ہندو عورتیں چکلے خانوں میں ہیں۔ سب سے زیادہ ہندو عورتیں مسلمان ہوتی ہیں۔ یہ آٹھ کروڑ مسلمان باہر کے نہیں ہیں، گھر کے ہی ہیں۔ یہ سب تمھاری ہی بہنیں ہیں۔ اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ ایسے مذہب میں انھیں رہنا بھی نہیں چاہیے۔ پہلی بار جب ہندوؤں کے موجودہ مذہب کی بنیاد پڑی تب مرد کرتا دھرتا تھے۔ انھوں نے اپنے لیے ساری سہولتیں رکھ لیں اور ہندو عورتوں کو چھوٹے سے دائرے میں بند کر دیا پھر وہ (مذہب) کیسے نیک خیالات کا ہوتا۔ وہ عورتیں نہ دیویاں تھیں نہ مٹی کے لوندے۔ جو جو اچھائیاں برائیاں مردوں میں ہوتی ہیں وہی سب عورتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ تو جب تک کہ دونوں دونوں میں برابر برابر نہ بٹی ہوں تب تک کیسے نجات ہوگی۔ مردوں کے وہ آرام، وہ سہولتیں عورتوں کو بھی ملنی چاہئیں۔ تھوڑی تھوڑی غلطیوں پہ بہنوں بیٹیوں کو نکال باہر کھڑا کرتے ہیں۔ پھر وہ نہیں تو کہیں تو ضرور جائے گی۔ ہندوؤں کی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ ان عورتوں کو (گھر سے تو کیا) دنیا ہی سے بدا کر دیا جائے۔ بس سرکار کے خوف سے ذرا چپ رہتے ہیں۔ ادھر مسلمان کا مذہب بہت وسیع ہے۔ ان میں سب کو رکھنے کی طاقت ہے۔

ادھر ہندو لوگ خود اپنے لیے گڑھا کھودتے ہیں، تو پھر اس میں کون گرے گا؟ وہی گریں گے بھی۔ ذرا سوچو اگر کوئی ایسی عورت کو گھر سے نکال دے جو پیٹ سے ہو تو وہ کہاں جائے گی؟ یہ سمجھ لو ایک عورت کو گھر سے نکالتے وقت دو کو تم نے مسلمان کر دیا۔ پھر اس کے جتنے بچے ہوتے جائیں گے سب مسلمان ہی تو ہوں گے۔ تمھارے یہاں جب عورت مرد میں برابری نہیں ہے تب دوسرے مذہب والوں میں کب ممکن ہے؟ بالکل ناممکن ہے۔ مگر ہندو لوگ اپنی ہٹ دھرمی نہیں چھوڑتے۔

پھر میں تو کہتا ہوں کہ اگر ہندو ایسی ہی ہٹ دھرمی میں پڑے رہے تو جب ان کے گھر کی لڑکیاں خود دوسرے کے گھر میں شادی کرنا پسند کریں گی تو کیا تم سمجھتی ہو یہ نقصان تھوڑا ہوگا۔ پھر ان لوگوں میں تو بے وقوفی پن آ گیا ہے۔ دیکھو ذرا سی قربانی کے پیچھے سیکڑوں آدمی سال میں مرتے ہیں۔"

میں بولی "مگر زیادہ ہندو نا!"

آپ بولے "چاہے کوئی ہوں۔ مرتے تو تمھارے ہی بھائی بند ہیں نا؟ تمھی میں سے نکل کر وہ مسلمان ہوئے ہیں اور یہ سب تمھاری کم عقلی کا تاوان ہے۔ پھر میں تو پوچھتا ہوں گائے کے پیچھے آدمی کی قربانی ہونا کیا درست ہے؟ اور پھر یہ کہ وہ گائے تو تمھاری اور مسلمانوں دونوں کی ہے۔ وہ بھی اسی جگہ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ جس جس چیز سے ان کا نفع نقصان ہوگا اسی سے تمھارا بھی ہوگا۔ اگر تم ٹھنڈے دل سے سمجھا دو تو دوسری بات ہے۔ اگر تم سے سمجھاتے نہ بنے تو اسے چھوڑ دو۔ یہاں تو جھگڑا کرنے کا مرض ہے۔"

میں بولی "آپ سمجھدار ہیں تو خود کیوں نہیں سمجھاتے۔"

وہ بولے "جن کو میں سمجھتا ہوں وہ خود سمجھدار ہیں۔ وہ گائے کی قربانی خود نہیں کرتے۔"

"کون پھر کرتے ہیں: کنھیں سمجھایا جائے؟" میں نے کہا۔

"ان لوگوں کو سمجھایا جائے جن کی روزی انھی جھگڑوں پر چلتی ہے۔ اس کام میں پنڈا' ملا' اور پیشوا شریک رہتے ہیں۔ انھی کو اس میں زیادہ مزا آتا ہے۔ اس جھگڑے میں جنتا کا کیا حال ہوگا اس سے انھیں کوئی بحث نہیں۔ ان کو تو واہ واہ ہی ملنی چاہیے اور موج اڑانے کے لیے پیسے۔ جتنا ہم لوگ پنڈوں سے پریشان ہیں اتنا ہی سمجھدار (مسلمان) لوگ ملاؤں سے۔"

"تب آپ لوگ کیوں نہیں ان کو نکال باہر کرتے؟"

"کوئی وقت آئے گا جب وہ لوگ واقعی نکال کر باہر کیے جائیں گے۔ انگریزوں کے یہاں ہزاروں بچھڑے کاٹ کاٹ کر بھیج دیے جاتے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں کہتا کہ ان بچھڑوں کو مت بھیجیو۔ نہ بھیجیں تو جبراً کوئی تھوڑے ہی لے لے گا۔ مگر نہیں' ان سے کور دبتی ہے۔ جہاں لڑنا چاہیے وہاں نہیں جا کر لڑتے۔"

میں بولی "ہم لوگوں کی پوجا کی چیز گائے ہے۔"

آپ بولے "تم لوگ کون کم ہو مسلمانوں سے۔ تم لوگ بھی تو بھیڑ بکری دیوی کی نذر چڑھاتے

ہو۔ کیا اس بکرے میں جان نہیں ہوتی ؟ اسی سے میں کہتا ہوں: کوئی دھرم نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا ۔ انہی ہندوؤں کو میں کہتا ہوں جو گائے کے پیچھے جان دیتے ہیں' وہی ہندو اپنے ماں باپ کو روٹی نہیں دے سکتے ہیں۔ وہی ہندو گھر کی بیٹی بہن کو نکال دیتے ہیں ۔ یہ کیا انسانیت سے دور کرنے والی باتیں نہیں ہیں؟ پھر بھی لوگ بڑے فخر سے کہتے ہیں گائے ہمارے پوجنے کی چیز ہے۔ جو ماں کو روٹی نہ دے سکے وہ گائے کو کیا چارا دے گا؟''

''یہاں سیکڑوں آدمی گائے کے پیچھے ہر سال قربان ہوتے ہیں۔''میں نے کہا۔

آپ بولے' رانی پاگل مت بنو تم سنو۔ وہ گائے کے پیچھے قربان نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی (مسلمانوں کے لیے) خلش کے پیچھے قربان ہوتے ہیں۔ ان کے اندر جو خلش رہتی ہے اسی کو موقع پاکر دونوں نکالنا چاہتے ہیں۔''

''آپ کس مذہب کو اچھا سمجھتے ہیں؟''میں نے پوچھا۔

بولے'' حقیقت یہ ہے کہ میرے لیے کوئی مذہب نہیں ۔ رام' رحیم' بدھ' عیسیٰ سبھی برابر ہیں ۔ ان بڑی ہستیوں نے جو کچھ کیا درست کیا۔ ان کے پیچھے چلنے والوں نے اس کا الٹا کیا۔ کوئی مذہب ایسا نہیں ہے کہ جس میں انسان سے حیوان ہونا پڑے ۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ میرا کوئی خاص مذہب نہیں ہے ۔ سب کو ہی مانتا ہوں اور جو اس طرح کے نہیں ہیں ان سے مجھے کوئی محبت نہیں ۔ یہی میرا مذہب سمجھو۔''

ڈیوڑھے درجے میں

سنہ ۲۷ء کی بات ہے ۔ میں پریاگ (الہ آباد) سے لوٹ رہی تھی ۔ میرے ساتھ بنو تھا اور آپ تھے ۔ ہم تینوں انٹر کلاس میں سفر کر رہے تھے ۔ چیت (مارچ' اپریل) کا مہینہ تھا ۔ اشٹمی تھی ۔ (چاند کے آدھے مہینے کی آٹھویں) ٹرینوں میں بے حد بھیڑ تھی ۔ جب بہت سے دیہاتی مسافر ہمارے ڈبے میں گھس آئے تو آپ بولے''یہ ڈیوڑھا درجہ ہے۔ کرایہ زیادہ لگے گا۔''

دیہاتی لوگ بولے'' کیا کریں بابو جی دورو ج سے پڑے ہیں۔''

آپ بولے'' تم لوگ کہاں سے آرہے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟''

''ہم لوگ شیتلا جی کے درشن کرنے گئے تھے'' دیہاتیوں نے کہا (شیتلا جی: چیچک کی دیوی)

آپ بولے''شیتلا جی کے درشن کرنے سے تمھیں کیا ملا؟ سچ بتاؤ تم لوگوں کا کتنا کتنا خرچ ہوا ہے؟''

''ایک ایک آدمی کے کم سے کم ۱۵ روپے'' دیہاتیوں نے کہا۔

آپ بولے ''اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم لوگوں نے چار چار مہینے کے کھانے کا غلہ بیچ دیا۔ اس سے اچھا ہوتا کہ دیوی جی کی پوجا تم گھر پر ہی کر لیتے۔ دیوی جی سب جگہ ہوتی ہیں۔ وہاں بھی تم پوجا کر سکتے تھے۔ دیوی دیوتا تب ہی خوش ہوتے ہیں جب تم آرام سے رہو۔''

''کیا کریں منوتی (منت) مانے تھے۔ اگر دیوی جی کے یہاں نہ جاتے تو ناراض نہ ہوتیں!؟'' دیہاتیوں نے کہا۔

ٹرین کا ڈبہ بے حد بھرا تھا۔ سانس لینا دشوار تھا۔ گرمی بھی پڑنے لگی تھی۔ اگلا اسٹیشن جب آیا تو میں بولی ''ان سے کہیے اتر جائیں۔ ان نصیحتوں پر عمل کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔''

آپ بولے ''تو بنا سمجھائے بھی تو کام نہیں چلنے کا۔''

میں نے کہا ''پھر کبھی سمجھا لینا۔ میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے۔''

آپ بولے ''انہی کے لیے تو جیل جاتی ہو، لڑائی لڑتی ہو اور انھی کو بنا رہی ہو۔ مجھے تو ان غریبوں پر ترس آتا ہے۔ بے چارے دھرم کے پیچھے بھوکوں مر رہے ہیں۔''

میں بولی ''جو بے وقوفی کرے گا وہ بھوکوں نہ مرے گا تو اور کیا ہوگا۔''

آپ بولے ''کیا کریں۔ صدیوں سے اس اندھے اعتقاد میں مبتلا ہیں۔''

''جو خود ہی مرنے کے لیے تیار ہیں انھیں کوئی زندہ رکھ سکتا ہے؟'' میرے منھ سے نکلا ''ان کے اوپر جبراً کوئی قانون لگا دیا جائے تو ان میں سمجھ آ سکتی ہے۔''

''دھیرے دھیرے سمجھ لیں گے۔ گو اس میں ابھی کافی دیر ہے۔ کوئی کام جبراً کیا جائے گا تو مرنے مارنے کو تیار ہو جائیں گے۔''

''تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بھی نہیں سیکھ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

آپ بولے ''آخر کب سکھایا جائے؟''

''آپ انھی کے لیے تو دفتر کے دفتر لکھ رہے ہیں۔''

''یہ ناول لکھے تھوڑی پڑھتے ہیں۔ ہاں ان ناولوں کی فلمیں تیار کر کے اگر مفت گاؤں گاؤں دکھلائی جائیں تو دیکھ سکتے ہیں۔''

میں نے کہا ''پہلے آپ لکھ ڈالیے پھر ان کی فلمیں تیار کروائیے گا۔''

ہم میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ریلوے پولیس کا آدمی آیا اور ان سبھوں کو دھمکی دینے لگا اور بولا ''ڈیوڑھا درجہ ہے اور کرایہ نکالو۔'' اس پولیس والے کی یہ حرکت دیکھ کو آپ کو سخت غصہ آیا اور بولے ''تم لوگ آدمی ہو یا جانور۔''

''جانور کیوں ہیں'' پولیس والے نے کہا ''تیسرے درجے کا کرایہ دیا اور ڈیوڑھے میں آکر بیٹھے ہیں۔''

''تیسرے میں جگہ تھی جو اس میں بیٹھتے؟ کرایہ تو تم نے لے لیا' یہ بھی دیکھا کہ گاڑی میں جگہ ہے یا نہیں' آدمیوں کو جانور بنا رکھا ہے؟ تم لوگوں نے۔ میں ان کی حمایت میں لڑوں گا۔ یہ راہ زنی کہ کرایہ لے لیں اور گاڑی میں کرایہ دینے والوں کے لیے جگہ نہیں! چلو دو ان کو تیسرے درجے میں جگہ''۔ یہ کہہ کر آپ نے ان آدمیوں سے کہا ''چلو میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں'' اور آدمیوں کو لیے ہوئے پولیس مین کے ساتھ آپ اتر پڑے۔

پولیس مین نے ان آدمیوں کو کسی طرح ایک ایک کرکے تیسرے درجے میں بھرا۔ جب آپ لوٹ کر آئے تو مجھ سے بولے ''دیکھا ان آدمیوں کو؟''

میں نے کہا'' آپ کیوں لڑنے لگے؟''

آپ بولے ''میں کیا کوئی بھی اس طرح کی حرکت ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر کوئی اس طرح کے ظلم ہوتے دیکھ کر چپ رہتا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کے اندر زندگی کی گرمی نہیں ہے۔''

میں بولی'' کانگریس کے آدمی جو لیڈر کہے جاتے ہیں' وہ اے' اور بی میں آرام سے رہتے ہیں اور پتہ نہیں رکھتے کہ تھی' کلاس والوں کو کیا آرام' تکلیف ہے۔

آپ بولے ''اگر یہاں کے سبھی آدمی ذمہ دار ہو جاتے تو یہ ملک اس طرح کا نہ ہوتا۔ ہماری اسی کمی سے سرکار راج کر رہی ہے۔ مٹھی بھر انگریز پینتیس کروڑ آدمیوں پر حکومت کریں اس کے معنی کیا ہیں؟ ہم میں کردار کی طاقت' روح کی طاقت کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی کا تاوان ہم بھگت رہے ہیں اور رو رہے ہیں۔''

میں بولی'' یہ سب کچھ ایک دن میں تھوڑے ہی سنبھلے گا۔''

''تو کیا سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ وہ بھی تو درست نہیں ہوگا۔'' آپ نے کہا۔
''ہوگا' جب ہوگا۔'' میں نے کہا۔

اس پر آپ بولے ''تو تم ناحق جیل گئیں، کانگریس کے پیچھے مرتی رہیں۔ یہ آزادی کا پودا املی کے درخت کی طرح ہے۔ بابا لگاتا ہے تو پوتا پھل کھاتا ہے۔''

رائے صاحبی

میں لکھنؤ میں تھی۔ ہیلی صاحب گورنر ہوکر آئے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست سے جو ہندوستانی تھے کہا ''دھنپت رائے جی کو آپ خط لکھیے میں ان کو رائے صاحبی دینا چاہتا ہوں کیونکہ وہ بھارت کے سب سے بڑے رائٹر ہیں۔'' جن سے گورنر صاحب نے کہا وہ ان کی کتابوں کے بڑے معتقد تھے۔ انھوں نے ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ 'گورنر صاحب آپ کو رائے صاحب کا خطاب دینا چاہتے ہیں۔ آپ ان سے ملیے۔''

وہ خط لیے آپ اندر آئے اور مجھ سے بولے ''گورنر صاحب کا میرے پاس خط آیا ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا لکھا ہے؟''

''صاحب بہادر مجھے رائے بہادری دینا چاہتے ہیں۔''

انھی کا خط ہے یا کسی اور سے لکھوایا ہے؟''

''ہاں، کسی اور سے لکھوایا ہے۔''

''کون بزرگ وار ہیں؟''

''ہیں ایک بزرگ وار۔ 'سر' کا خطاب انھیں بھی ملا ہے۔''

''لیجیے شوق سے رائے صاحبی'' میں نے کہا ''خالی رائے صاحبی دیں گے کہ اور کچھ بھی؟''

''اشارہ تو اور بھی کچھ کے لیے ہے۔''

''تب لیجیے نا۔''

بولے ''کیوں دینا چاہتے ہیں یہ بھی بتادوں؟ تب میں عوام کا آدمی نہ رہ کر گورمنٹ کا ایک پٹھو ہوکر رہ جاؤں گا۔''

''کیسا پٹھو؟''

''اسی طرح جیسے اور بہت سے لوگ ہیں۔ ابھی تک میرا سارا کام عوام کے لیے ہوا ہے خطاب لے کر گورمنٹ جو مجھ سے لکھوائے گی لکھنا پڑے گا۔ تم منظور کرو تو لے لوں۔''

میں نے کہا "ضرور لیجیے۔"

"تمھارا یہی فیصلہ ہے تو لکھوں۔"

میں نے سوچا کہیں سچ مچ نہ لکھ دیں۔ بولی "بڑا مہنگا سودا ہے۔"

تب آپ بولے "ہاں میں ایسا خود نہ کروں گا۔"

"ان کو کیا جواب دیجیے گا؟"

"ان کو شکریہ لکھ دوں گا اور لکھ دوں گا میں عوام کا ایک ادنیٰ خدمت گار ہوں۔ اگر عوام سے رائے صاحبی ملے گی تو سر آنکھوں پر۔ گورمنٹ کی رائے صاحبی کی خواہش نہیں۔ گورنر صاحب کو میری طرف سے شکریہ کہہ دیجیے۔"

لکھنؤ۔عورتوں کا گھر

یہ ذکر ہے سنہ ۲۹ کا۔ مہینوں سے مجھے رات کو ہلکا ہلکا بخار آتا تھا۔ صبح ۴ بجے اتر جاتا تھا۔ کانگریس کا دور تھا۔ صبح سے ۱۲ بجے تک گھر کا کام کرتی، کھانا پکاتی، اس کے بعد مہیلا آشرم یعنی عورتوں کے گھر چلی جاتی۔ آپ بار بار مجھے محنت کرنے سے منع کرتے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ زیادہ تھکن سے بخار ہو جاتا ہے۔

میں اس بخار کو چھپانا چاہتی تھی۔ وہ اگر میری بخار کی حالت جان جاتے تو کانگریس کا کام رک جاتا۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ شراب خانوں پر شراب کی خرید و فروخت کے خلاف دھرنا دیا جاتا تھا۔ میں ۵۰۔۶۰ عورتوں کو لے کر تین چار دن گئی۔ وہاں سے لوٹنے پر نہاتی تھی۔ چوتھے دن مجھے تیزی سے بخار چڑھ آیا۔ دس دن اور دس رات بخار رہا۔ آپ کو یہ دیکھ کر غصہ آیا۔

ان دنوں دیہاتوں میں موہن لعل سکسینہ دورہ کرنے جاتے تھے۔ وہ آئے تو تین دن تک آپ بھی انھی کے ساتھ دورہ کرتے رہے۔ چوتھے دن جب وہ آئے اور میں نے دیکھا کہ میرا بخار نہیں اتر رہا ہے تو میں بولی "آپ دو تین دن کہاں رہے؟"

بولے "جہاں سے تم بخار لے کر آئیں۔ وہاں کا کام کرنے گیا تھا۔"

"آپ تین روز غائب رہے۔" میں نے کہا۔

"اگر غائب نہ رہتا تو کام کیسے چلتا!" انھوں نے کہا۔

''جب میں اچھی ہو جاتی تب آپ جاتے۔ گھر میں چھوٹے بچے ہیں اور میں بیمار پڑی ہوں۔''

''جب کوئی مرنے پر تلا ہی ہو تو میں اسے زندہ رکھ سکتا ہوں؟''

''مرنے پر کون تلا ہے؟ ہاں ذمہ داری سمجھنا ہر ایک کی ڈیوٹی ہے۔''

''اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم مرتی رہو اور میں بیٹھے بیٹھے دیکھا کروں؟''

میں نے کہا ''اور میرے لیے چارہ ہی کیا تھا۔ یہ ۶۰۔۷۰ عورتیں کیسے کام کرتیں؟ ان میں سمجھ دار اور ذمہ داری کو سمجھنے والی تو دو تین ہی ہیں۔ اور وہ دو تین تو آرام سے اپنے گھر رہیں اور باقی سب نوکرانیاں ہیں جو کام کرتی رہیں؟ جنھیں اب تک یہ بھی نہیں معلوم کہ سوراجیہ (اپنی حکومت) میں کیا ملے گا۔ اب تک تو وہ بے چاریاں یہی سمجھ رہی ہیں کہ جو کام میں کر رہی ہوں وہ بھی کر رہی ہیں۔''

آپ نے کہا ''اس کے معنی یہ ہوئے کہ مر بھی رہا ہو تو انسان کام کرتا رہے۔''

''جب مر رہی ہوں تو کھاٹ پر نہیں پڑی ہوں؟'' میں نے کہا ''روزانہ وہ آتی ہیں اور دیکھ جاتی ہیں۔''

''تمھیں دیکھنے آتی ہیں؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ہاں پر ہمدردی کے مارے نہیں۔ یہ دیکھنے کو کہ آرام تو نہیں کر رہی ہیں۔''

''یعنی یہ کہ وہ تم کو بے وقوف بناتی ہیں۔''

''بے وقوف نہیں بناتی ہیں۔ انھی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ سب کام کریں۔ مجھے تو ان بے چاریوں پر ترس آتا ہے۔ نہ وہ کچھ جانتی ہیں نہ سمجھتی ہیں۔ پھر بھی ہمارے ساتھ جان دینے کو تیار رہتی ہیں۔ وہ برابر کا ہمارے ساتھ سر کھپاتی ہیں۔ بہت سی تو اتنی غریب ہیں کہ انھیں اور ان کے گھر والوں کو بھر پیٹ کھانے کو نہیں ملتا۔ پھر جب کام ٹھیک نہ ہوتا رہے گا تو بدنامی تو نام والیوں ہی کی ہوگی۔ اور اگر نیکنامی کے پھول برسیں گے تو ہم ہی لوٹیں گے۔''

''اچھا' تو آرام سے سو ؤنا۔'' آپ بولے۔

دسویں روز جب میرا بخار اترا تو میں نے جوس پیا۔ تب ہی وہ آئیں اور مجھے پکڑ لے گئیں۔ آپ ان عورتوں سے بولے۔

''دو چار روز انھیں آرام کر لینے دو۔ نہیں تو پھر یہ بیمار پڑ جائیں گی۔''

عورتوں نے کہا۔ ''اس کے معنی یہ کہ ہم بھی اپنے گھر آرام کرنے جائیں۔ کیا ہمارے گھر کوئی بیاہ شادی ہے۔''

میں نے بیچ میں کہا ''تم تو ناراض ہوتی ہو۔ میں پھر کام کروں گی۔ آرام کے مارے تھوڑے ہی جان بچا رہی تھی۔ ایک آدھ روز ذرا آرام کر لینے دو۔''

عورتیں بولیں ''آپ جب تک آرام کریں گی تب تک ہم بھی گھر رہیں گے۔ ان عورتوں کے ساتھ تو ہم سے کام نہ ہو سکے گا۔''

میں بولی ''رحم کرو دیکھ تو رہی ہو میں چارپائی پر پڑی ہوں۔ آج تو کہیں جا کر جوس لیا ہے۔''

وہ بولیں ''اچھا جب آپ کام کرنے جائیں تو ہمیں بلا لیں۔''

''بہنو روٹھو نہیں'' میں نے کہا ''میں صبح آؤں گی۔ ابھی تو مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا ہے۔''

بولیں ''ہم آپ سے روٹھتے نہیں ہیں۔ وہاں ہمیں لوگ کہتے ہیں کہ یہ تنخواہ پاتی ہیں۔ ہم کیسے کام کریں آپ ہی بتائیے؟ دن بھر کانگریس کا کام کرتے ہیں' رات کو بیسن پیستے ہیں' دو ہی (دلیہ یا دال بھگونا اور پیسنا) بناتے ہیں تب ہمارا کام چلتا ہے۔ اس پر جسے دیکھیے وہی ڈانٹ بیٹھتا ہے۔ اب تو ہم نے یہی سوچ لیا ہے کہ آپ کام نہ کریں گی تو ہم بھی گھر میں بیٹھ جائیں گے۔''

میں بولی ''بہنو جب تک میں لکھنؤ میں ہوں میری لاج رکھنا۔''

اسی وقت میں نے کپڑے بدلے اور ان کے ساتھ چل پڑی۔ کیونکہ سبھوں کے لیے چار تانگے چاہیے ہوتے۔ آپ بیٹھے ہی تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھا ''میں جا رہی ہوں'' کہتی ہوئی میں چلی گئی۔ مگر دو ہی تین دن کام کر پائی تھی کہ مجھے پھر بخار چڑھا۔ میں خود کپڑے بھی نہیں بدل سکی۔ نوکر نے میرا جوتا کھولا۔ تین دن' تین رات مجھے بخار چڑھا رہا۔ اس پر آپ مجھ پر بہت ناراض ہونے لگے۔ بولے ''کیا جان دینے پر تلی ہوئی ہو؟ میں سوچتا ہوں تم ایسی ہی رہیں تو مہینے دو مہینے میں مر جاؤ گی۔''

''میں بولی'' آپ خود بھی تو دیکھ رہے ہیں۔ کیا کروں؟ کوٹھری میں بند ہو کر بیٹھنا چاہوں تو وہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اس دن تو آپ نے سب کی باتیں سنی تھیں۔ میں مجبور ہو کر گئی تھی۔ اس کے آگے میرے پاس کوئی بھی دوا نہیں ہے۔''

آپ بولے ''اب مہینے دو مہینے تم کھاٹ پر پڑی رہو۔ تب تو لوگ سمجھیں گے کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔''

میں بولی ''بہانا وہاں چلتا ہے جہاں لوگ زبردستی کام کرواتے ہیں۔ جو کام اپنی ذمہ داری سمجھ کر کیا جارہا ہے۔اس سے کیسے منھ موڑوں؟''

آپ بولے ''اس میں ذمہ داری کی کون سی بات ہے؟ مہاتما جی سے تھوڑی کوئی بڑھ جائے گا۔ جب وہ بیمار ہوتے ہیں تو ان سے کوئی نہیں مل پاتا؟''

میں نے کہا ''کیا میں مہاتما گاندھی ہوں۔''

آپ بولے'' آدمی تو ہو ہی ۔مہاتما جی کی ضرورت سارے ہندوستان کو ہے تو تمھاری، تمھارے گھر والوں کو ہے۔ اگر تم نہ مانو گی تو میں ملنے والیوں کا آنا روک دوں گا۔''

''یہ میرے اوپر ظلم ہوگا۔'' میں نے کہا۔

آپ بولے۔'' یہ اسی طرح کا ظلم ہوگا جیسے تم میرا قلم توڑ کر پھینک دیتی ہو۔ جیسے تمھیں میری ضرورت ہے، ویسے ہی مجھے بھی تمھاری ضرورت ہے۔''

اس کے بعد میں دس بارہ روز تک پڑی رہی۔

اسی سال اپریل میں ہم دونوں بنارس آئے۔انھوں نے 'مادھوری' کا کام چھوڑ دیا۔

عورتوں کا گھر-عورت اور مرد

ایک بار کانگریس کی میٹنگ ہورہی تھی۔اس میں کام کرنے والے ۱۴۰ مرد تھے۔ان میں آپ بھی تھے۔عورتیں بس دس تھیں اور اس پر بھی مردوں کو شکایت تھی کہ عورتیں زیادہ تعداد میں ہیں۔اس بات پر آپ مجھ سے بولے'' یہ مردوں کی بھول ہے۔''

میں نے کہا'' تب ہی تو عورتیں مہیلا آشرم سے خوش نہیں ہیں۔مردوں کا کہنا ہے کہ ہم لوگ بہت ہیں، تھوڑے لوگ کام کریں۔ ہماری تکلیفیں تو مردوں کے دھیان میں بھی نہیں آتیں۔ چھ مہینے ہوئے کانگریس دفتر [illegible] دیا گیا۔تب سے سارا بوجھ مہیلا آشرم پر ہی ہے۔اب ان کو سوچنا چاہیے کہ آج عورتیں نہ ہوتی تو کام کیسے چلتا۔''

''تب ہی نہ میں نے کہا کہ ان کی بھول تھی' وہ بولے۔

''آپ بتائیں نا عورتیں کیسے آگے بڑھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''حق بھی بڑی مہنگی چیز ہے۔قربانی دوناس کے لیے ارحم وترس سے کوئی چیز مل بھی جائے تو اچھی نہیں اور ایسی چیز ٹکتی بھی نہیں ہے۔اپنی ہمت سے حاصل کی ہوئی چیز اچھی ہوتی ہے۔''

میں نے کہا''ہم کواپاہج بنانے والا ہے کون؟''

بولے''اس کی شکایت تم نہ کرو۔وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ پیچھے کا رونا رونے سے کام نہیں چلے گا۔اب سنبھلو۔''

میں نے کہا''اس پرانی حالت میں بھی ہم دونوں ساتھ تھے۔اور آج بھی ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ تب آپ کیسے کہتے ہیں کہ مانگنے سے نہیں ملتا۔تم ہی اپنی قربانی دو۔''

بولے''جواب تک عورتوں کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کر پائے ہیں وہ اتنی جلد نیک نفس نہیں بن سکتے۔آج مرد عورتوں سے اس بات پر بہت خوش ہیں کہ آج اگر عورتیں میدان میں نہ آتیں تو کانگریس تو ختم تھی''''تو پھر مرد عورتوں کے گرو کیسے ہوئے؟عورتوں نے بھلا کب اپنے فرض سے منھ موڑا ہے''۔

''جب عورتیں اپنے کو مردوں سے الگ سمجھنے لگیں گی تو یاد رکھو یہ دنیا بڑی ڈراؤنی جگہ ہو جائے گی۔''

تو پھر ناز کس بات پر ہے؟''میں نے کہا''جہاں دیکھیے مرد آگے قدم بڑھائے رہتے ہیں۔''

بولے''نہیں۔وہ تمھاری دیا کے مستحق ہیں۔''اورتم عورتیں اُن پر غصہ مت کرو۔جسے تم نے اپنے ہاتھ سے بنایا وہ تمھارے ہاتھ سے کیسے خراب ہوں۔''

''اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اپنی بربادی کے بل پر پیٹ بھرتے ہیں۔''

وہ بولے''اور کیا سمجھتی ہو؟جو جتنا بڑا ہوتا ہے وہ اتنا ہی گہرا ہوتا ہے۔اسی کے اوپر دنیا ٹکتی ہے۔اسی سے منو بھگوان نے کہا'گرو باپ سے ایک ہزار گنا زیادہ پوجنے کے لائق ہے۔اس جیسی کیا آسانی سے ہو جاؤ گی؟''

میں نے کہا''اس کے آگے کیا کہوں۔لڑائی تو جب ہے جب کوئی برابر کا لڑنے والا ہو۔اس واسطے ہم اپنا سر جھکائے چلے جاتے ہیں اور گھٹ گھٹ کر مرتے بھی ہیں۔''

''اسی سے تم عورتوں کو طاقت کا مقام ملتا ہے۔''

میں بولی''مردوں کو بہلانا خوب آتا ہے۔''

''عورت مرد کا ٹکراؤ کیسا؟ عورتوں سے نفاق میں تو ہم زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔''

''مرد تو عورتوں پر پہلے ہی ڈنڈا لے کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں'' میں نے کہا۔

''وہ حیوانی طاقت ہے جس کی دنیا میں کوئی وقعت نہیں۔ دیوتاؤں اور راکھشسوں میں جھگڑا ہونے پر راکھشس ہمیشہ جیتے ہیں کیونکہ وہ جائز ناجائز ہر حربہ استعمال کر سکتے ہیں۔ اخلاق اور مذہب دونوں سے عاری۔ ایسے وقت آنے پر نیک آدمی ہمیشہ ہیٹھا رہتا ہے کیونکہ اوچھا وہ جو اوچھے کے منہ لگے۔ اسی واسطے وہ نیک آدمی ہمیشہ اونچا رہے گا اور جو بد ہے (دانو) اس سے شکایت کیسی؟ اسی طرح عورت اور مرد ہیں۔ مردوں کو عورتیں اگر مٹانا نہیں چاہتیں تو خود نہیں مٹیں گی تو اور کیا ہوگا؟ مگر وہ ہمیشہ عبادت کے لائق رہیں گی اور یہ مقام ہے بھی ان ہی کے لائق۔''

میرے منہ سے نکلا خوب' اور وہاں سے اٹھ آئی۔

ان کے دل میں عورت ذات کے لیے عقیدت تھی۔ وہ عورتوں کو مردوں پر فضلیت دیتے تھے۔ اگر میں گاؤں میں ہوتی اور شام کو باہر بیٹھنا چاہتی تو آپ مجھے باہر دیکھتے ہی اپنے لیے جھٹ دوسری کرسی لانے چلے جاتے۔ اگر گرمی میں وہ شام کو چھت پر ہوتے اور میں بھی وہاں پہنچ جاتی تو آپ فوراً دوسری کرسی لانے کے لیے نیچے چلے جاتے۔ اگر وہ کھانا کھانے بیٹھتے تو پانی خود لے لیتے۔ میرے لیے بھی گلاس میں پانی رکھ دیتے۔ میرے پاس اگر نوکر نہ ہوتا تو اپنی چارپائی بچھاتے ہوئے میری بھی بچھا دیتے۔ اگر میں گھر میں اکیلی کھانا پکاتی ہوتی تو اسی جگہ باورچی خانے کے پاس وہ پورے وقت بیٹھے رہتے۔ جب میں کھانا پکا چکتی تو مجھے لیے ہوئے وہ اپنے کمرے میں جاتے۔ مجھے پڑھنے کے لیے کوئی اچھی چیز دے کر آپ لکھنا شروع کرتے۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے ان کے پاس بیٹھنا ہی پڑتا۔ چاہے کوئی بھی پکاتا۔ ان کو اکیلے کھانا اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ کھاتے وقت کافی گپ شپ کرتے تھے۔ لیڈر (انگریزی اخبار) وہ روز پڑھ کر مجھے سناتے تھے۔ اگر میں پاس نہ ہوتی تو مجھے بلا لیتے' اور اسے پڑھ کر ہندی میں ترجمہ کر کے مجھے بتاتے جاتے تھے تاکہ میں انگریزی نہ جاننے کی فکر نہ کروں۔ اسی لیے مجھے کبھی اُردو اور انگریزی نہ پڑھ سکنے کی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے شہر ہی میں اگر کہیں جانا ہوتا تو وہ میرے ساتھ وہاں تک جاتے اور دروازے تک مجھے پہنچا کر واپس آتے۔

میرے جیل جانے سے پہلے کے حالات۔ لکھنؤ

پہلے جب میں نے کانگریس میں کام کرنا شروع کیا جولائی کا مہینہ تھا۔ میں چپکے چپکے کام کرتی تھی

اور کیا کام کرتی تھی یہ گھر میں کبھی ظاہر ہونے نہیں دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ڈر تھا کہ ان کو معلوم ہونے پر وہ میرا گھر سے نکلنا مشکل کر دیں گے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جلدی سے جلدی خود جیل چلے جاتے۔ وہ پہلے ہی سے جیل جانے کے لیے تیار تھے۔ جب جب باتیں ہوتیں وہ یہی کہتے تھے کہ اب کی بار مجھے ضرور جیل جانا ہے' اب تم لوگوں کو کھانے کی بھی کمی نہیں ہے۔ اور کچھ نہیں ہوگا تو میری کتابوں کی رولٹی تو مل ہی جائے گی۔ میں پریس منیجر کو لکھتا جاؤں گا تو وہ تم کو کم سے کم سو تو دے ہی دیں گے۔''

میں بولی ''ابھی تک تمھاری رولٹی کی سو کوڑی تو ملی نہیں' سو روپے تو بہت بڑی چیز ہے۔''

''ارے بھائی جب تک کام چلتا رہتا ہے تب تک روپیوں کی طرف کسی کی نگاہ بھی تو نہیں جاتی۔''

میں ایک دن میں کم سے کم دو جلسوں کی میٹنگز اٹینڈ کرتی تھی اور وہاں تقریر کرتی تھی۔ پر میں نے اخباروں میں اپنا نام دینے کی روک لگا دی تھی۔ میں نے اس ڈر سے روک نہیں لگائی تھی کہ گورمنٹ مجھے گرفتار کرے گی بلکہ اس لیے کہ دو ایک عورتوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں ان سے آگے ہوں اور میں جو کام کرتی ہوں اس سے میری ناموری ہوتی ہے۔ میری روح اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ میرا نام ہو اور جو دن بھر میرے ساتھ رہیں اور مجھ سے زیادہ کام کریں ان کا نہ ہو۔ اس کو میں پہلے سے برا سمجھتی تھی اور اب بھی برا سمجھتی ہوں۔ ساتھ ہی اس سے کام کی رفتار کم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے بدلے میں مجھ کو ان عورتوں سے ایک خاص طرح کی ہمدردی تھی جو کہ ظاہر ہے میری چیز تھی۔ اور کام بنا آگا پیچھا دیکھے بنا سوچ بچار کے بڑی تیزی کے ساتھ سب کر گزرنے کو تیار رہتی تھی۔ دوسرے میں ان سے یہ چھپانا چاہتی تھی کہ میں تحریک کے کام کو آگے بڑھانا چاہتی ہوں۔ مگر ان کو اس کا حال کانگریس کے دفتر سے معلوم ہو جاتا تھا۔ میں جب رات کو گھر لوٹتی تو بہت ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوتی تھی اور آتے ہی گھر ہستی کے کاموں میں لگ جاتی۔ گھنٹے دو گھنٹے ان کے ساتھ گپ شپ بھی کرتی۔ انھی دنوں مجھے ہلکا ہلکا بخار بھی رات کو ہو جاتا تھا۔ پر میں بیماری کو چھپاتی۔ اس طرح ہمارا کام چل رہا تھا۔ اس سب کا مقصد یہ تھا کہ میں ان کو جیل نہ جانے دے کر خود جیل جانا چاہتی تھی اور آخر ہوا بھی اسی طرح۔ جب کبھی ان کو میری چالاکی کا پتہ چل جاتا تو مجھ پر خفا ہوتے اور کبھی کبھی جھگڑا بھی کر بیٹھتے تھے۔ میں نے جتنا کام کیا وہ دیش کی سیوا کے لیے تھا' نہ کہ اپنے مطلب کے لیے۔

ہار

اگر وہ کہیں جلسے میں جاتے تو وہاں انھیں جو ہار وغیرہ ملتے انھیں لوٹتے ہی مجھے پہنا دیتے اور کہتے ''لو یہ ہار۔''

میں کہتی ''عوام کی طرف سے ملے ہونے کی وجہ سے تو یہ ہار بڑا قیمتی ہے۔عوام سے آپ کو ملا اور آپ نے اٹھا کر اسے دوسرے کو دے دیا' یہ کیا بات ہوئی ؟ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ ہار کی قیمت آپ نے نہیں سمجھی۔''

''نہیں ۔عوام نے اسے میری نذر کیا' وہ نذر کی ہوئی چیز میری ہوگئی ۔میں جس کا پجاری ہوں اسے اس کا چڑھاوا میں نے دیا۔ یہ ہے اس کی قیمت' جو پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی۔ میں تمھیں اپنے سے کم نہیں سمجھتا۔'' وہ بولے۔

''مطلب یہ ہے کہ' عوام کا دیا ہوا فرض کا بوجھ آپ نے میرے سر پر رکھ دیا۔ میں اگر اس بوجھ کو اپنے کمزور کندھوں پر نہ سنبھال سکوں تو ؟''

بولے'' میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کسی بوجھ کو بھی بغیر تمھارے سہارے کے میں نہیں اٹھا سکتا۔اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میں تم سے الگ خود کو سمجھتا ہی نہیں ہوں۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ کوئی مرد بنا عورت کے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب تک عورت کا ہاتھ کسی کام میں نہ لگے وہ کام پورا نہیں ہوسکتا۔ جب گھر گھر کی عورتیں مرد ہندوستان کی ترقی کے لیے کوشش کریں گے تب ہی نجات ہوگی۔''

میں نے کہا'' خوشامد کرانا ہو تو کوئی آپ کو بلا لے۔عورتوں کو تو اس طرح کی باتوں سے اور گھمنڈ ہو جائے گا۔''

وہ بولے۔'' مجھے یقین ہے اوروں کو ہو نہ ہو تم کو مطلق گھمنڈ نہیں ہوسکتا۔''

''میں کوئی دیوی نہیں ہوں۔ مجھے بھی غرور ہوسکتا ہے۔''

'' مجھے معلوم ہے تمھارے غرور سے بھلا ہی ہوسکتا ہے۔ایسا غرور تو ہونا ہی چاہیے۔اگر ایسا غرور ملک بھر کو ہو جائے تو ہم انسان بن سکتے ہیں۔ جو اپنی قربانی دے کر دوسرے کا غرور بڑھاتا ہے اس کے غرور کی عزت کرنی چاہیے۔''

نمک قانون

۱۹۳۰ء کی لکھنو کی بات ہے۔مہاتما گاندھی نمک قانون توڑنے کے لیے دانڈی (ڈانڈی) گئے تھے۔سب شہروں میں مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے گونج رہے تھے۔ان دنوں ہم لوگ بھی لکھنو میں تھے۔وہ مادھوری کو مرتب کرتے تھے۔اپریل کا مہینہ تھا۔میرے دروازے پر امین الدولہ پارک تھا۔اسی جگہ آ کر والنٹئر روز نمک بناتے تھے اور لگتا تھا وہاں سارا لکھنو اُمڈ آتا تھا۔انھی کے

ساتھ ساتھ اسلحہ سے لیس پولیس بھی پہنچ جاتی تھی۔ کئی جوانوں کو اپنے ہاتھ سے کرتا اور ٹوپی پہنا کر نمک بنانے کو بھیجتے تھے۔ ان کو میں بھی اپنے ہاتھوں سے ہار پہناتی۔ اور جب وہ میرے پیر چھونے لگتے تو دلیری کے احساس سے میری آنکھوں سے آنسو ڈھلک جاتے۔ میں بھی اسی امنگ میں انھیں سینے سے لگا کر آشیرواد دیتی۔

''بیٹا تمھاری فتح ہو۔''

اسی طرح تین مہینے تک یہ کام چلتا رہا۔ اس کے بعد ہم میں اور ان میں باتیں ہوتی تھیں۔

وہ برابر کہتے تھے ''رانی میرے جیل جانے کا وقت آ گیا ہے۔''

میں ان کو جیل نہیں جانے دینا چاہتی تھی کیونکہ صحت ٹھیک نہیں تھی۔ میں سوچتی اگر یہ جیل جائیں گے تو ان کی کیا حالت ہوگی۔ اس خیال ہی سے مجھے کپکپی ہونے لگتی تھی۔ مگر ان کے سامنے انھیں کو منع بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ایسا کرنا بزدلی ہوتا۔ سب ہی کے بیٹے اور شوہر اور بھائی سب کو پیارے ہوتے ہیں۔

اگر سبھی اپنے اپنوں کو چھپا کر رکھنا چاہیں تو کام کرنے والے کہاں سے آئیں گے؟ اس کی فکر مجھے تھی۔ میں خود سوچتی ہوں بچے جیل جانے کے قابل ہی نہیں اور ان کو جیل جانے دینا چاہتی نہیں تھی اور سوال ستاتا کہ آخر جیل جائے تو کون؟ اس صورت میں آگے بڑھنا میرا ہی کام تھا۔

۲۰ جولائی کو سروپ رانی نہرو لکھنؤ آئی تھیں اور ان کا لیکچر سننے میں گئی تھی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے آدمی میرے خیال سے سبھی جیلوں میں جا چکے تھے۔ جواہر لال بھی جیل میں تھے۔ ماتا سروپ رانی نہرو کے لیکچر میں وہ زور تھا، وہ درد تھا، وہ گرمی کہ جو شاید مُردوں میں بھی جان ڈال سکتی تھی۔ مجھ جیسی مردہ دل کو بھی کچھ گرمی ملی اور میں نے بھی اپنے فرض کی طرف قدم اُٹھایا۔ ماتا سروپ رانی نہرو نے عورتوں کے سامنے ان کا جو فرض رکھا اس پر بہت سی عورتوں نے دستخط کیے اور میں نے بھی اپنا نام دیا۔ اسی دن سے میں نے کام کرنا شروع کیا۔ پہلے مہیلا آشرم نہیں تھا۔ انھی دنوں ۱۱ عورتوں نے مل کر مہیلا آشرم (عورت گھر) قائم کیا۔ سب عورتیں بارہ بجتے بجتے آشرم پہنچ جاتی تھیں۔ ان میں، میں اور میری لڑکی بھی ہوتے تھے۔ شروع شروع کا کام تھا، عورتوں میں کافی گھبراہٹ تھی، مجھے بھی کافی گھبراہٹ رہتی تھی۔ مجھے اکیلے گھر لوٹنا ہوتا تھا اور میں گھبرائی ہوئی راستہ طے کرتی۔ پر کہیں وہ مجھے بازار میں دیکھ لیتے تو وہ میرے ساتھ ہو لیتے تھے۔ کہتے ''تم اس قدر گھبرا کیوں جاتی ہو؟'' میں جھینپ جاتی اور کہتی ''میں کیا کروں۔ اکیلے میں میرا جی گھبراتا ہے۔''

وہ کہتے ''اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے۔''

میں کہتی ''مان لو کوئی بدمعاش مل جائے تو کیا ہوگا؟''

''اگر کوئی بدمعاش ہے بھی تو وہ تمھارا کیا بگاڑے گا۔تم چپکے سے اپنے گھر چلی آنا۔''

تب وہ لوٹ کر مجھے دروازے تک پہنچا جاتے اور دوبارہ بازار سے سامان لینے جاتے۔ یہ سلسلہ دو ڈھائی سال تک جاری رہا۔

جیل میں

سنہ ۱۹۳۱ء نومبر کا مہینہ تھا اور گیارھویں تاریخ۔آپ تین دن پہلے سے ہی بنارس گئے ہوئے تھے۔ ۸ بجے کا وقت تھا ایک بہن مہیلا آشرم سے آئیں اور مجھ سے بولیں۔''چلیے آپ کو کانگریس دفتر میں بلایا ہے'' مجھے نہیں معلوم کہ کام کیا ہے۔''

وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ بدیشی کپڑوں کی دکانوں پر ہمارے دس والنٹیر گرفتار ہو چکے ہیں' اور بیوپاری لوگ بدیشی کپڑوں کی گانٹھوں پر مہر نہیں کرا رہے ہیں۔اب آپ لوگ جایئے تب کہیں ان لوگوں کے خون میں حرارت آئے گی۔''

میں گیارہ بہنوں کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر گئی اور کچھ بہنوں کو لوٹتی موٹر میں آنے کے لیے کہہ گئی ۔وہاں پہنچ کر ہم نے پکیٹنگ (دھرنا دینا) کرنا شروع کیا۔کوئی ۱۵' ۲۰ منٹ کے بعد پولیس انسپکٹر وہاں پہنچا۔مجھ سے بولا'' آپ کو ہم گرفتار کر رہے ہیں۔''

میں بولی'' پہلے وارنٹ دکھلایئے۔''

انسپکٹر نے کہا'' نئے قانون کے مطابق وارنٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

میں اپنی چھ بہنوں سے بولی''نعرے لگاؤ'' مہاتما گاندھی کی جے' ہم لوگ گرفتار ہو گئے'' پھر میں نے کہا۔''چلیے۔''

ہم لوگ مہاتما گاندھی اور بھارت ماتا کی جے کے نعرے لگاتے ہوئے لاری میں بیٹھ گئے۔ہم سات بہنیں تھیں۔ایک انسپکٹر'اور سات کانسٹیبل ہمارے ساتھ ہو لیے۔سب بہنیں قومی گیت گاتی ہوئی چلیں۔تھوڑی دور جانے پر پولیس انسپکٹر لاری رکوا کر اتر گیا۔ہمارا گانا اسی طرح جاری رہا۔ مجھے خیال آیا کہ میری گرفتاری سے پہلے کوئی پچاس ساٹھ عورتوں کو پولیس شہر سے باہر ایک بیٹھر مقام پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔جب لاری سے انسپکٹر اتر گیا تو میں نے دیکھا کہ ہماری لاری میں جو

سپاہی بیٹھے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ ان کے دل میں بھی درد ہے۔ وہ مجھ سے بولے ''ماتا جی' یہاں ہم کو بائیس بائیس روپے ملتے ہیں۔ اگر ہم کو دوسری جگہ کوئی دس روپے بھی دیتا تو ہم اس پاپ کی نوکری کو کبھی کے چھوڑ چکے ہوتے''

میں بولی ''بیٹا اس کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب تک تم یہ نوکری کر رہے ہو تمھارا یہ فرض ہے کہ ایمانداری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی دو۔ کیونکہ یہ بھی ایک طرح کی بے ایمانی ہوگی کہ تم ہمارے ساتھ رو رعایت کرو۔ جیسے ہم اپنے لیڈر کی بات مان کر جیل جاتے ہیں ویسے ہی تمھارا فرض بھی ہے۔ بس تم لوگ یہ ضرور کرنا کہ ہم لوگوں کو بجائے کہیں باہر چھوڑ کر چلے جانے کے جیل میں لے جانا''۔

سپاہی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا ''ماتا جی اگر آپ لوگ اتنی مہان نہ ہوتیں تو جیل ہی کیوں جاتیں۔ ہم آپ کو جیل ہی میں لے جا کر چھوڑیں گے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ جن ماؤں اور بہنوں کی ہمیں پوجا کرنی چاہیے تھی انھی کو آج اس پاپی پیٹ کی خاطر جیل لیے جا رہے ہیں۔''

میں نے کہا ''بیٹا تم لوگوں کو ایشور سے پرارتھنا کرنا چاہیے۔ کہ وہ ہمیں اپنا فرض بجالانے کے لیے طاقت دے۔ تم اب بھی میرے بیٹے ہو اور میں تمھاری ماں ہوں۔ ہاں راستے دونوں کے الگ الگ ہیں۔''

یہی کہتے کہتے ہم جیل کے پھاٹک کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں انسپکٹر پہلے ہی سے موجود تھا۔ سپاہی بھی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے لاری سے اترے اور ہم سات عورتیں بھی لاری سے اتریں۔''

ہم جیل کے دفتر میں گئے۔ وہاں سب سے نام گاؤں پوچھا گیا۔ جیل نے اس کارروائی کے بعد جن بہنوں کے جسم پر زیورات تھے اتروا کر رکھ لیے اور ہمیں جیل میں لے جانے کے لیے جمعدارنی سے کہا۔ ''میں جیلر صاحب سے بولی۔

''آپ کانگریس دفتر میں فون کرا دیجیے کہ ہم لوگ جیل کے اندر آ گئے ہیں۔''

جیلر نے کہا ''بہت اچھا' میں فون کیے دیتا ہوں۔''

''شکریہ'' میں نے کہا۔

جس وقت میں جیل کے اندر پہنچی دوپہر کے دو بجے تھے۔ وہاں جو بہنیں پہلے سے موجود تھیں انھیں ہمارے آنے کی اطلاع پہلے ہی سے مل چکی تھی۔ وہ ہمارے استقبال کے لیے آنچلوں میں پھول بھرے ہاتھوں میں مالائیں لیے کھڑی تھیں اور ہم جیسے ہی وہاں پہنچے وہ ہمارے گلوں میں مالائیں

ڈال کر اور ہم پر پھول برسا کر اسی طرح ملیں۔ جیسے مدتوں بعد بچھڑی ہوئی منہ بولی بہنیں ملی ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی۔ وہ چند ہی منٹوں میں دیش کی ساری باتیں سن لینا چاہتی تھیں۔ باہر کی خبریں سناتے سناتے پانچ بج گئے۔

پانچ بجے کے بعد تقریباً چار پانچ سو آدمی جیل پہنچے۔ انھیں میں میری لڑکی اور لڑکے بھی تھے۔ میں دفتر میں بلائی گئی ہم سب بہنیں پھاٹک پر گئیں۔ میرے گھر والے میرے کپڑے اور روز کی ضرورت کی چیزیں لے کر آئے تھے۔ میرا چھوٹا بچہ ۹ سال اور کچھ مہینے کا تھا۔ اسکول جاتے ہوئے وہ مجھ سے کہہ کر جاتا تھا کہ اماں تم باہر کانگریس کا کام کرنے مت جانا نہیں تو گرفتار ہو جاؤ گی۔ جب تم گھر میں نہیں ہوتی ہو تو گھر اچھا نہیں لگتا ہے' روزانہ میں اس سے کہتی' مان لو میں اگر گرفتار ہو ہی جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ کیا مجھ سے معافی منگواؤ گے؟'' اور وہ اپنی ننھی ننھی باہیں میرے گلے میں ڈال کر اور میرے سینے میں منہ چھپا کر کہتا ''نہیں اماں' معافی نہیں منگواؤں گا'' آج اسی کو اپنے سامنے میں دیکھ کر میں خود رو پڑی۔ آنسوؤں کو چھپاتی میری آنکھیں بچوں کے سامنے اٹھ نہیں پا رہی تھیں۔ ڈر یہ تھا کہ میرے چھپے ہوئے آنسو میرے بچے دیکھ نہ لیں۔ ایک بہن میرے بچوں کے ساتھ مجھ سے ملنے کو آئی تھیں۔ ان بہن کو میں نے بچوں کو سونپا اور کہا'' جب تک میرے پتی جی نہ آجائیں تب تک آپ ان ہی کے پاس رہیے گا۔''

اس وقت اپنے بچوں کو دوسرے کو سونپتے ہوئے جو درد میرے دل میں اٹھا تھا اس کے باوجود تمام کوشش کے چھپا نہیں پا رہی تھی۔ آج بھی میں اس درد کو محسوس کرتی ہوں اپنے پتی کی موت پر اور اپنے جیسے جانے پر۔ کیا ان کو ہم لوگوں کو چھوڑتے وقت کم درد ہوا ہوگا! مگر نہیں۔ وقت سب کو سب طرح نچاتا ہے۔ اور انسان اس کے سامنے بے بس رہتا ہے' اور اس درد میں غوطے کھاتا رہ جاتا ہے۔ سب دردوں کو انسان بھلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بھلا نہیں پاتا ہے۔ یہ میری ہی نہیں تمام انسانوں کی کمزوری ہے۔ اب بھی جب میں ان باتوں کو یاد کرتی ہوں تو آنکھوں میں آنسو چھل چھلا اٹھتے ہیں۔

دوسرے دن میرے پتی گھر آئے۔ انھیں پہلے ہی میرے جیل جانے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے جیل آئے۔ میں دفتر میں بلائی گئی۔ آپ پھاٹک پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''اچھا تو تم جیل میں آگئیں'' ان کے منہ سے نکلا۔

میں نے کہا'' جی'' میں جیل میں آگئی ہوں۔ کہیے آپ تو ٹھیک ہیں؟''

آپ بولے'' ہاں میں ٹھیک ہوں' تم اپنی کہو' تم کیسی ہو؟''

میں خوشی کا چہرہ بناتی ہوئی بولی ''جی' ٹھیک ہوں ۔ یہاں ہمارے جیلر کافی آرام دے رہے ہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔اس کے بعد وہ مجھ سے گلے ملے۔ میں نے انھیں گھر کی باتیں بتلائیں اور کہا' 'اچھی طرح سے رہیے گا۔بچوں کا خیال رکھیے گا۔''

اس کے بعد وہ اپنی قدرتی ہنسی ہنستے ہوئے بولے'' تم تو ادھر قیدی ہوئیں ہی'ادھر مجھے بھی قیدی بنا دیا۔''

مجھے ان کی بنارس کی بات یاد آئی جو انھوں نے پریس کے بارے میں کہی تھی کہ ہم تم دونوں ایک ہی ناؤ کے مسافر ہیں۔ ہماری تمھاری فکر مختلف نہیں ہو سکتی۔ اس وقت ان کی بات کے جواب میں میں نے کہا'' اس کا فیصلہ تو آپ سات سال پہلے ہی کر چکے ہیں۔''

اس پر آپ بولے'' اسی کو تم نے پورا کیا ہے؟''

میں بولی'' پورا تو نہیں کیا'ہاں پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' مگر تمھارے بغیر یہ کام میں اکیلے کیسے کر سکتی ہوں۔ میں گھر پر رہتی تو شاید پوری گرہستی چوپٹ ہو جاتی۔ میں وہاں بھی آرام کرتی تھی اور آپ کی کرپا سے یہاں بھی آرام ہی ہے' گھر پر کام ہی کام ہے'یہاں بس آرام ہے۔''

اسی طرح چھ بار وہ مجھ سے ملنے جیل آئے اور میں دیکھ رہی تھی کہ وہ مجھے جیل میں دیکھ کر خوش نہیں تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ مجھے جس دن جیل سے رہا ہونا تھا اس تاریخ سے ایک دن پہلے ہی چھوڑ دیا گیا۔ رہا ہو کر میں اکیلی گھر پہنچی تو اس وقت آپ دفتر میں تھے۔ جب شام کو گھر آئے تو مجھے دیکھ کر مسکرا دیے۔ میں نے اٹھ کر ان کے پیر چھوئے۔ مجھے اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بولے'' کیا تم بیمار تھیں؟''

گلا تو میرا بھی بھر آیا تھا۔ میں بولی'' میں تو اچھی ہوں' آپ بیمار تھے کیا؟''

'' میں بیمار کیوں ہونے لگا۔ میں تو گھر میں آرام سے بیٹھا تھا۔ میرے بیمار ہونے کی تو کوئی وجہ تھی ہی نہیں۔'' وہ بولے۔

ہماری چھوٹی بھاوج بچے وغیرہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ بھاوج بولیں'' آپ کہتے ہیں کہ میں آرام سے بیٹھا تھا۔ جس دن سے آپ جیل گئیں ہیں اس دن سے آپ کے چہرے پر کسی نے ہنسی تک تو دیکھی نہیں۔''

آپ جھینپتے ہوئے بولے'' آپ بھی خوب ہیں۔''

بھاوج بولیں ''میں جھوٹ نہیں بولی، سچ کہہ رہی ہوں۔''

اس پر سب بچوں نے مل کر ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

میری بھاوج اٹھ کر پھل اور میوے لے آئیں۔ سب لوگ کھاتے جاتے تھے اور میری غیر حاضری میں جو جو باتیں ہوئی تھیں بتلاتے جاتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر میں نئی زندگی آ گئی ہے۔ مگر ایک دوسرے کی تندرستی کو دیکھ کر ہم دونوں خوش نہ تھے کیونکہ ۷ پونڈ میرا وزن کم ہوا تھا اور ۱۴ پونڈ ان کا۔

رات کو جب ہم دونوں اکیلے ہوئے تو میں نے پوچھا آخر آپ کا حال کیا ہے؟

''کچھ نہیں، اچھا تو ہوں۔'' آپ بولے۔

''اچھے تو نہیں ہیں۔ جیسا میں چھوڑ کر گئی تھی ویسے بھی نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ویسا کیسے رہ سکتا تھا'' آپ نے کہا ''ادھر تم جیل میں تھیں ادھر میں جیل کو محسوس کر رہا تھا۔''

''جس خوف کو میں کافی مہینے پہلے آپ سے چھپانے کی کوشش کرتی تھی اب دیکھتی ہوں کہ اسے آپ نے گھر بیٹھے ہی پورا کر دیا۔ یہ میرے ساتھ کیا آپ نے ناانصافی نہیں کی ہے؟''

''چاہے میں نے انصاف کیا، چاہے ناانصافی بات اتنی ہے کہ انسان تو انسان ہی رہے گا۔ وہ کیسے اپنی طبیعت کو بدل سکتا ہے؟ میں تمھاری باتوں میں آ جاتا تھا۔ تم مجھ سے چھپا چھپا کر کام کرتی رہیں۔ کیا تم نے یہ پاپ نہیں کیا؟ تم کون ہنی کئی تھیں، دائم المریض تو ہو۔ یہ کہنا چاہیے کہ بس خیریت سے جیل سے لوٹ آئیں۔ مجھے تو رات دن یہی دھڑ کا رہتا تھا کہ شاید جیل سے تمھاری لاش ہی آئے گی۔ تمھیں یاد ہے کہ نہیں جب تمھارے جیل جانے سے پہلے میں نے تمھارا نام ورکنگ کمیٹی کی فہرست میں دیکھا تھا تب ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم جیل جانے کو تیار بیٹھی ہو۔ میں نے موہن لال سکسینہ سے جا کر کہا تھا کہ ان کا نام آپ نے بے کار دیا ہے اور انھوں نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ صاحب میں کیا کروں انھیں عورتوں نے چنا ہے' اس وقت تم نے کہا تھا کہ میں جیل جانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں تو بچ کر رہوں گی۔' پھر جب جیل جانے کی باری آئی تو میں گھر پر موجود بھی نہیں تھا کہ تم میرے واپس آنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئیں۔''

''سات سو عورتوں کی ترغیب بھی تو رد نہیں کی جا سکتی۔ میں بھی مجبور تھی'' میں نے کہا۔

''اور اسے تمھاری چوری نہیں کہوں؟'' وہ بولے'' جہاں جہاں تمھارا کام ہوتا تھا پولیس کی لاری تمھارے ساتھ ہوتی تھی۔ اور تم ہمیشہ مجھ سے بہانا کر کے گھر سے نکل جاتی تھیں۔ تم نے تو یہاں

تک پیش بندی کر رکھی تھی کہ تمھارا نام تک اخباروں میں نہ آنے پائے۔ اب بتاؤ یہ دھوکا تھا کہ نہیں؟''

میں نے جواب دیا ''میں ڈرتی تھی کہ آپ مجھے جانے سے روک دیں گے اور خود جائیں گے۔ اس کو دھوکا بھی کہا جا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ پاپ بھی ہو مگر میں مجبور تھی۔ میرے دل میں ایک طرح کی بے چینی رہتی تھی کہ آخر میرے گھر سے جیل کون جائے' اور کسی نہ کسی کو تو جیل جانا ہی چاہیے تھا۔ بچے اس قابل ہوتے تو میں پہلے ہی انھیں بھیجتی۔ آپ کی تندرستی اچھی نہ تھی کہ آپ جیل جاتے۔''

آپ بولے ''تم جیل گئیں تو میں تندرست ہوں نا؟''

''اچھا برا تو ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ایشور چاہتا ہے۔''

''تو پھر پہلے ہی سے ایشور پر سب کچھ نہ کیوں چھوڑ بیٹھیں؟'' انھوں نے کہا۔

''پہلے ہی سے ایشور پر اس لیے سب کچھ نہیں چھوڑ بیٹھی کہ تقدیر اور تدبیر دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔''

''خیر ٹھیک ہے۔'' آپ بولے۔

''ہاں جیسا بھی ہو ٹھیک ہے۔''

اس رات دو ڈھائی بجے تک اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔

جیل سے لوٹنے کے دوسرے دن جب میں ان کے کمرے میں گئی تو میں نے دیکھا کہ وہاں میرا فوٹو لگا ہوا ہے۔ اور اسے ایک مالا صندل کی اور ایک پھولوں کی پہنائی گئی ہے۔

میں بولی ''یہاں آپ نے میرا فوٹو کیوں لگایا؟ یہاں مرد آتے جاتے ہیں اسے یہاں نہیں لگانا چاہیے تھا۔ ہر طرح کے لوگ یہاں آپ سے ملنے آتے ہیں' یہ تصویر یہاں اچھی نہیں لگتی۔ اسے مجھے اتار کر دے دیجیے۔

آپ ہنس کر بولے ''تو کیا اسے بنانے کے لیے لگایا ہے؟''

میں نے کہا ''یہ یہاں اچھا نہیں لگتا صاحب' کوئی دیکھ لے گا۔''

''تو کیا میں نے اسے چھپا کر رکھا ہے؟ دیکھنے کے لیے تو ہے ہی۔''

''اس پر مجھے تو ایک طرح سے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔''

''نہ معلوم تمھیں کیوں شرم محسوس ہوتی ہے۔ مجھے تو کوئی شرم نہیں آتی۔تمھارے کمرے میں بھی تو میرا فوٹو لگا ہے' پھر میرے کمرے میں تمھیں اپنا فوٹو کیوں برا لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا''مردوں کے کمروں میں عورتوں کے فوٹو اچھے نہیں لگتے۔''

''اس میں برا لگنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ تمھارا فوٹو کہاں لگے جو تمھیں برا نہ لگے' اچھا لگے اور اسے وہاں دیکھ کر تمھیں شرم بھی نہ محسوس ہو''؟

''میرا فوٹو میرے کمرے میں رہے''میں نے کہا''اور میرا بھائی لگائے' میرے بیٹے لگائیں تو مجھے برا نہیں لگے گا۔''

آپ بولے''میں تو سمجھتا ہوں کہ تمھارا فوٹو لگانے کا سب سے زیادہ حق مجھے ہے۔ خیر یہ جو تم نے دو نام لیے ان پر مجھے اعتراض نہیں ہے' مگر میری عمر کا کوئی دوسرا مرد اگر تمھارا فوٹو لگائے اور اس کی پوجا کرے تو شاید میں اس کا جانی دشمن ہو جاؤں گا۔''

''اس میں بیچاری ہونے کی کون سی بات ہے۔ آپ اپنے دوستوں کے فوٹو نہیں لگاتے ہیں۔''میں نے کہا۔

''دوستوں کے فوٹو میں اپنے کمرے میں لگا سکتا ہوں مگر دوستوں کی بیویوں کے فوٹو لگانے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں ماں' بیٹی' بہن کی بات دوسری ہے۔''وہ بولے۔

''اسی طور کے شاید تیسرے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔''

وہ بولے''تم خود سوچ سکتی ہو کہ تمھاری عمر کی کسی دوسری عورت کی تصویر اگر میں اپنے کمرے میں لگا لوں تو کیا تمھیں برا نہیں لگے گا؟''

''میں تو سمجھوں گی کہ ماں بہن کی تصویر سمجھ کر لگائی ہوگی۔ میرے دماغ میں تو کبھی بھولے سے بھی کوئی دوسرا خیال نہیں آئے گا۔''میں نے کہا۔

آپ بولے''تم دو میں سے ایک ہو: یا تو بالکل بے وقوف اور پاگل یا پھر دوسری بات سوچنے کی تم میں ہمت نہیں ہے۔''

میں بولی''اچھا صاحب میں پاگل ہوں' بے وقوف ہوں اور بھی سب کچھ ہوں بس میرا فوٹو اتار کر مجھے دے دیجیے۔ یہ مجھے یہاں اچھا نہیں لگتا۔''

آپ بولے''فوٹو تو میں نے لگایا ہے اور اتارنے کے لیے نہیں۔ ورنہ تم بھی ہمارا فوٹو اتار کر دے دو۔''

میں چڑھ کر بولی'' جاؤ جی' جا کر ہنسی اڑواؤ۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ جو لوگ آئیں گے آپ سے مذاق کریں گے وہاں کیا میں سننے کو بیٹھی ہوں گی۔''

آپ بولے'' تمھاری بلا سے۔ میں ایسا بودا نہیں ہوں کہ ان سے ڈروں گا' اور نہ میں ایسا ہوں کہ خود مذاق نہیں کر سکتا۔ تم اس کی فکر چھوڑ دو۔ مذاق سے تمھاری نانی مرتی ہے' میری نہیں۔''

'' مردوں کو مذاق کیوں برا لگنے لگا۔ ہم عورتوں کو مذاق برا لگتا ہے'' میں نے کہا'' مگر میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ مذاق سے سب سے زیادہ تمھاری نانی مرتی ہے۔''

چڑھ کر میں وہاں سے چلی آئی۔

۱۹۳۱ء '' سی کلاس'' تحریک

نمک قانون توڑا جا رہا تھا۔ کیوں کہ آپ نے اپنے پیسوں سے کھدر کا کرتا' ٹوپی' دھوتی پہنا کر اور میرے ہاتھ سے اس کے گلے میں ہار ڈلوا کر لکھنؤ کے گونگے نواب پارک میں بھیجا۔ بھیجتے ہوئے کہتے تھے جاؤ بہادر' نمک قانون توڑو۔ میں بھی جلدی پہنچتا ہوں۔'' ان لوگوں کو ہار پہناتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہاں مار بھی پڑ جاتی تھی۔ اس وقت کا وہ خوبصورت منظر آج بھی آنکھوں میں آنسو لے آتا ہے۔ آپ بھی کئی بار چلنے کو تیار ہوئے مگر میرے منع کرنے کو وہ ٹالتے نہیں تھے۔ جب جب جیل جانے کی بات آتی میں اسے تسلیم نہ کرتی۔ ان کی صحت سالوں سے گری ہوئی تھی۔ پھر بھی ان کا دل بالکل جوانوں جیسا تھا۔ مجھے یہی لگتا کہ جیل میں ان کی صحت بالکل ہی خراب ہو جائے گی۔ ان کی یہ باتیں سن کر میں آگے بڑھی۔ انھیں میں جیل جانے نہیں دے سکتی تھی۔''

ایک دن کی بات ہے میں مہیلا آشرم گئی۔ وہاں بہت سی بہنوں نے صلاح کر کے مجھے کپتانی کا عہدہ دے دیا۔ میں کیا کرتی سات سو عورتوں کے اصرار کو کیوں کر ٹال سکتی تھی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اسی وقت بابو موہن لال سکسینہ نے مجھے ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی بنایا۔ وہاں پر جو بھی کارروائیاں ہوئیں انھیں انگریزی میں انھوں نے نوٹ کیا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر مجھے گھر پہنچانے آیا اس کے ذریعے انھوں نے بابو جی کو یہ رقعہ بھیجا کہ ان نوٹس کو اردو اور ہندی میں ترجمہ کرنے کا آپ کو اختیار ہے۔

وہ آدمی جب واپس چلا گیا تو آپ میرے پاس آئے اور بولے'' پتہ ہے یہ کپتان گیری اور ورکنگ کمیٹی کی ممبری تمھیں جیل لے جائے گی۔''

میں نے جواب دیا ''میرا کچھ بس ان لوگوں کے سامنے نہیں چلا۔ وہ کسی اور کو چننے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ پھر وہ کوئی نوکر نہیں ہیں۔ جو اپنی ذمے داری زیادہ سمجھتا ہے اسی پر اتنا ہی بوجھ لادا جاتا ہے اور اسے وہ بوجھ اٹھانا بھی چاہیے۔ اور بھائی دو میں ایک کو تو کرنا ہی پڑے گا۔''

آپ بولے ''میں بھی اب جیل جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔''

''میں کہاں جیل میں جا رہی ہوں'' میں نے کہا۔

مجھ سے اتنی باتیں کرنے کے بعد آپ کانگریس آفس جا کر موہن لال سکسینہ سے بولے ''بھائی یہ تم نے کیا کیا۔ انھیں تم نے کپتان اور ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنایا ہے۔ وہ اگر جیل گئیں تو ان کی بس لاش بچے گی۔ وہ ہمیشہ سے اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرتی آئی ہیں۔

سکسینہ نے کہا ''انھیں تو استریوں نے چنا ہے۔ اس پر میرا کیا بس تھا۔ ہاں وہ اتنی عورتوں کے اصرار کو ٹال نہ سکیں۔''

جب میں جیل گئی تو آپ گھر پر نہ تھے۔ دوسرے دن پہنچے۔ گھر پر میری لڑکی، دونوں لڑکے اور نوکر تھے۔

دوسرے دن سب کو ساتھ لے کر میرے پاس جیل پہنچے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

میں نے ان سے کہا ''میں بڑے آرام سے ہوں۔''

انھوں نے کہا ''ٹھیک ہے۔''

اس کے بعد وہ جب جب ملنے کے لیے جیل آئے میں نے ان کی یہی حالت دیکھی۔ کئی دوستوں کی طرف سے بدھائیاں آئیں، تار آئے۔ کئی دوستوں نے منھ پر بدھائی دیتے ہوئے کہا ''بھائی خوب رہے بی بی جیل میں اور آپ مبارک باد لینے کے لیے گھر بیٹھے ہیں'' ''میں نے تو اپنی سب سے قیمتی چیز نذر کی ہے۔'' وہ کہتے۔

جب تک میں جیل میں رہی ہر ہفتے وہ اتنی چیزیں مجھے یہ سمجھ کر بھیجتے تھے کہ سب کے کام آئیں۔ جب میں رہا ہو کر گھر پہنچی تو پتہ چلا کہ اتنے عرصہ نہ وہ ہنسے، نہ انھوں نے بھر پیٹ کھانا کھایا۔ وزن تو مجھ سے ان کا ڈیوڑھا گھٹا۔ ان دنوں سی کلاس کے قیدیوں کو مار پڑتی تھی، بھر پیٹ کھانا نہیں ملتا تھا، اوڑھنے بچھانے کو کمبل نہیں ملتا تھا۔ اس کا گہرا دکھ مجھے تھا۔ ایک دن میں اسی بات کا ذکر اپنے گھر

میں کررہی تھی کہ کتنی بڑی ناانصافی ہے۔اے ,بی کلاس والے تو ہر طرح کی سہولت پائیں اور بے چارے سی کلاس کے والنٹئر کو اتنے دکھ ملیں۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اے,بی کلاس والے کیوں اس ناانصافی کو توڑ نہیں ڈالتے۔جیل میں بھی جیوں کے تیوں رئیس بنے ہوئے ہیں۔میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ اس رئیسی سے نفرت پھیلے گی۔

آپ بولے''اس رئیسی ہی نے تو ہندوستان کو غارت کیا ہے۔''

''اس کے خلاف تحریک چلانے کا میرا پکا ارادہ ہے۔''

''اس بار مجھے جانے دو''آپ بولے۔''

میں ان سی کلاس کے قیدیوں کی حالت کو سوچ کر تھرتھرا اٹھی اور بابوجی سے بولی کہ آپ اسی میں چلے جائیں گے۔ایک آدمی سے کیا ہوگا۔بہت زوروں کی تحریک چاہیے لیکن اس کے لیے کانگریس دفتر تیار نہیں ہے۔میں اس بارے میں کانگریس والوں سے بات کر چکی ہوں۔میں کاؤنسل کے سامنے جلوس لے کر جانا چاہتی تھی لیکن کانگریس والے کہتے ہیں کہ حضرت گنج میں دوبار گولیاں چل چکی ہیں' تحریک چلانے کا یہ موقع نہیں ہے۔یہ بات میں نے وہاں تو کہی لیکن آپ سے میں آج سے پہلے نہ کہہ سکی۔

اس کے دو تین دن بعد ہی ہم سات سو پچاس عورتیں جمع ہوئیں۔انھیں لیڈ کرنے والی صرف چار عورتیں تھیں۔جلوس کے دن گولی ڈنڈوں کے خوف سے میں نے اپنے گھر میں اطلاع تک نہ دی ۔جب ہمارا جلوس حضرت گنج پہنچا تو ایک طرف پبلک تھی' دوسری طرف پولیس۔بیچ میں عورتوں کا لمبا جلوس۔وہاں جب ہمارا جلوس پہنچا تو لوگ اسمبلی بند کر کے اپنے اپنے گھر بھاگ گئے۔ہم عورتوں نے زوروں سے کہا کہ آپ آج بھلے اسمبلی بند کر دیں' دیکھیں کب تک بند رہتی ہے۔ہم کل پھر آئیں گے۔آپ کو جس طرح کی تیاری کرنا ہو کریں۔

دوسری صبح پھر ہم لوگ ویسے ہی جلوس بنا کر چلے۔ہم لوگوں کے راستے میں چار سو کانسٹیبل ہاتھوں میں ہتھیار لیے کھڑے تھے اور چار لاریاں بھی موجود تھیں۔اس کا علم آپ کو مادھوری آفس میں ہوا۔وہاں سے دس پانچ آدمیوں کو ساتھ لے کر آپ ہم لوگوں کو دیکھنے آئے۔پر کرتے کیا! وہاں تو پولیس کے جتھے نے جلوس کو روک رکھا تھا۔میری رائے یہ ہوئی کہ پانچ پانچ عورتیں ٹولیاں بنا کر چلیں۔پہلی ٹولی میں' میں بھی تھی۔موہن لال سکسینہ بولے'' آپ تو ابھی لوٹی ہیں' آپ پیچھے رہیں۔''میں نے جواب دیا'' یہ میری شان کے خلاف ہوگا۔''

نیچے زمین جلتی تھی اوپر سورج تپ رہا تھا۔ ہمارے بہت دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد ہوم ممبر چھتاری نے پوچھا "آپ کا منشا کیا ہے؟"

"سی کلاس کے قیدیوں کے ساتھ آدمیت کا برتاؤ کیا جائے۔ جانوروں کا سا نہیں"۔

چھتاری نے کہا "اچھی بات ہے۔"

"اگر آپ نہ کر سکیں تو صاف کہیے۔ ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ اسمبلی اگر اس سوال کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیتی، ہے تو اُسے توڑ دینا چاہیے۔"

"آپ کل پتا کریں۔ اس کا انتظام فوراً کیا جائے گا۔"

"کل ہی سہی" ہم نے کہا۔

ہمارا جلوس کسی طرح واپس آیا۔ آپ بھی تھے۔ میں مہیلا آشرم گئی۔ کیونکہ شام کو پبلک میٹنگ تھی۔ کانگریس کا اسٹیج غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ مجھ سے ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ میٹنگ امین آباد پارک میں تھی۔ بارہ ہزار کا مجمع تھا۔ کئی حضرات کے لیکچر ہوئے۔ میرے نام کا بھی اعلان کیا گیا۔ میرا نام سنتے ہی آپ دہل گئے۔ میں اسٹیج پر آئی۔ اور کرتی ہی کیا! میں نے لیکچر بڑی گرم جوشی سے دیا۔ ان لیکچروں کا اثر اتنا ہوا کہ پچاس والنٹیر اپنے نام لکھوانے کو فوراً تیار ہو گئے۔ جب میں باہر نکلی اور آپ مجھ سے ملے تو بولے "مناؤ خدا کو کہ خیر ہوئی نہیں تو تم اب تک سینٹرل جیل یا اسپتال میں ہوتیں۔ تم کو معلوم نہیں کہ کانگریس غیر قانونی قرار دے دی گئی ہے۔"

"مجھے معلوم کیوں نہیں تھا۔"

"معلوم ہوتے ہوئے بھی آگ اگل رہی تھیں؟"

میں بولی "میں کیا کرتی۔ جب بولنے کھڑی ہوئی تو کیا چپ رہتی، جب مرنا ہی ہے تو کچھ کر جانا چاہیے تھا۔"

"تم مجھے ہمیشہ دھوکا دیتی رہتی ہو۔ جب جب میں تیار ہوتا ہوں تم پہلے ہی تیار ہو جاتی ہو اور میں رک جاتا ہوں۔"

"دو میں سے ایک ہی تو جا سکتا ہے۔ ہم اتنے مالدار نہیں ہیں کہ ہمارے بچے ہمارے بنا بھی سکھی رہ سکیں۔ پھر آپ ادب کے ذریعے تو اپنا کام کر ہی رہے ہیں۔ خاموش تھوڑے ہی بیٹھے ہیں۔ میں گھر میں بیٹھی بیٹھی کیا کروں۔ آپ گھر میں بیٹھ کر زیادہ ضروری کام کر رہے ہیں یہ ساری ناموری کیا آپ ہی کمائیں گے۔"

جب کبھی تعریف سننے لگی گی تو اپنے حصے کی سب تمھیں دے دوں گا۔"

میں بولی" بڑے دانی ہیں آپ۔ ایسا دل تو عورتوں کو ملا ہے کہ کام کر کے بھی سامنے نہیں آتیں۔ بچے ہمیں ہوں، تکلیفیں ہم اٹھائیں اور نام آپ کا ہو۔"

ہم دونوں میں اس طرح کی چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی۔

میونسپلٹی سے رنڈیوں کے نکالے جانے کی تجویز پاس ہو چکی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ آخر یہ جائیں گی کہاں اور آئندہ انکا پیشہ کیا ہوگا۔ یہ ایسی دھتکاری ہوئی ہیں کہ دنیا میں رہنے کے لیے ان کو جگہ نہیں ہے۔ آخر یہ ہم ہی میں سے تو ہیں۔ میں انھی چنتاؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پاپ کرنے میں کیا صرف ان کا ہی کا حصہ ہوتا ہے؟ مرد سماج کیا اس سے باہر ہے؟ یہ ظلم تو ان ہی لوگوں کی ہوسناکی کا پھل ہے۔

اسی وقت آپ میرے کمرے میں آئے اور مجھے اداس دیکھ کر بولے" کیسی طبیعت ہے؟"

میں بولی" عورتوں کی طبیعت ہوتی ہی کیا ہے۔"

آپ بولے" آخر معاملہ کیا ہے۔"

"پوچھ کر کیا کیجیے گا" میں نے کہا۔ ایشور نے مردوں کو عورتوں کی ذمہ داری سونپی ہے۔ وہ جیسا چاہیں کر سکتے ہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پرماتما عورتوں کو کیوں پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں آکر وہ کیا سکھ پاتی ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید مردوں کے پیروں تلے آکر روندے جانے ہی کے لیے وہ دنیا میں آتی ہیں۔ اور سدا ان سب کی وہ سیوا بھی کرتی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں عورت کو سنسار سے باہر کرتی۔ نہ رہتا بانس نہ بجتی بنسری۔"

آپ زور سے ہنستے ہوئے بولے" بات بتاؤ کیا ہے؟"

وہیں اخبار پڑا تھا۔ ان کے سامنے کر دیا۔ بولی" دیکھیے اپنے لوگوں کے کرامات۔"

آپ اس کو پڑھ کر کچھ گمبھیر ہو گئے بولے" رانی یہ نہ تمھارے بس کی بات ہے، نہ میرے۔ اور ان باتوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ ناحق تم خود کو اداس کر لیتی ہو اور اس کا الزام مجھ پر رکھنے لگتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میرے بس میں یہ سب کچھ نہیں ہے۔"

میں نے کہا" آپ اس پر لکھ اور بول تو سکتے ہیں۔ یہ کیا کہ بات بری بھی لگے اور اسے ویسا ہی مان کر بیٹھ جایا جائے۔"

'' لکھنے کے معاملے میں تو میں کبھی پیچھے نہیں رہا ہوں'' انھوں نے کہا'' ان ہی کی گتھیاں سلجھانے کے لیے میں نے سیوا سدن (بازار حسن) لکھا۔ اور بھی کئی کہانیاں اور ادبی چیزیں لکھی ہیں۔ عمل کرنا نہ کرنا تو ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ تم سارے کا سارا الزام میرے سر منڈھ دیتی ہو۔ خود پریشان ہوتی ہو اور مجھ پر بگڑتی ہو۔''

میں نے کہا'' کوئی علاج ہو تو بتایئے ۔ یہ بات سن کر میرا دل بہت بے چین ہو گیا ہے۔''

آپ بولے'' جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوتا ہے ان کی گتھیاں نہیں سلجھ سکتی ہیں۔ یا پھر کوئی بڑا مہاتما پیدا ہو جو ان کی گتھیوں کو سلجھا سکے۔ صدیوں سے بگڑا ہوا زمانہ ایک دم کیسے سدھر سکتا ہے۔''

میں بولی'' مردوں کی قوم یہ کیوں سمجھتی ہے کہ دنیا میں بس انہیں لوگوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ ان عورتوں کو پہلے مرد لوگ ہی گھر بدر کرتے ہیں۔ وہ عورتیں انھی مردوں کے خراب کرنے کی وجہ سے خراب ہوئی ہیں۔ پھر وہ آخر اس دنیا سے کہاں جائیں؟

'' مرنے پر بھی تو چھٹکارا نہیں۔''

'' آپ بولے'' معلوم ہوتا ہے ان کی میں نے یہ حالت بنا رکھی ہے۔''

میں بولی'' مجھے تم پر غصہ نہیں آرہا ہے۔ مجھے غصہ آرہا ہے دنیا کی ناانصافی پر اور آپ پر تو اس لیے بگڑ رہی ہوں کہ آپ اسے سن کر کوئی کوشش کریں۔''

آپ بولے'' تم یقین کرو یہ بات میرے بس سے باہر ہے۔ سماج سے لڑنے کے لیے عورتیں جتنی بے بس ہیں اس سے کم بے بس مرد نہیں۔

اس پر اپنا کچھ اختیار ہی نہیں ہے تو کیا کیا جائے۔''

'' گاندھی جی بھی ان پر کبھی کچھ نہیں لکھتے۔'' میں نے کہا۔

'' جن موضوعات پر وہ بولتے ہیں انہیں کو کون سا لوگ مان لیتے ہیں۔'' وہ بولے

میں نے کہا۔'' اب تو شاید وہ ہی ان بدنصیبوں کا کچھ بھلا کر سکیں۔''

میرے کہنے پر وہ ہنسنے لگے۔ مجھے اور بھی غصہ آیا۔ میں نے کہا آپ ہنستے کیوں ہیں۔ مجھے بے چاریوں پر دیا آتی ہے اور آپ ہنس رہے ہیں''۔

آپ بولے۔'' لاچاری کی بات ہے۔ زیادہ سر کھپانا ٹھیک نہیں۔''

''ایسے سماج کو تو ختم کر دینا چاہیے۔ معلوم نہیں کہ بھگوان ہے کہ نہیں ۔ ہے تو ایسے ظلم ہوتے کیسے دیکھتا ہے۔ اور پھر شاید وہ بھی تو مرد ہے۔'' میرے منھ سے نکلا۔

آپ بولے ''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ عورتوں کے ساتھ بھگوان نے بھی ظلم کیا ہے ۔ جو بھی دشواری کے کام تھے وہ تم لوگوں کے ذمے کر دیے ۔ اور تب بھی سب سے زیادہ تم ہی لوگ ایشور کے چکر میں پڑی رہتی ہو۔ تب ہی تو کہتا ہوں اا مذہب ہو جاؤ۔''

میں نے کہا'' چلے پر نمک مت چھڑکو۔''

آپ بولے ''تم تو پاگل ہوگئی ہو۔''

''تو یہ قاعدے قانون ایشور نے تھوڑے ہی بنائے ہیں۔ آپ لوگوں ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔''

''یہ سب اسی طرح چلتا رہے گا۔''

''یہ بہت پرانی بات ہے۔ کچھ آج کی نہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولے'' بہت دنوں سے ہو رہا ہے۔ بہت دنوں تک ہوتا بھی رہے گا' ہم لوگوں کے مان کا یہ نہیں ۔ پھر بھی میں کہتا ہوں یہ رنڈیاں ہندوؤں کے ماتھے پر کلنک کی مثال ہیں۔''

''نہ معلوم یہ باتیں آئیں کہاں سے۔''

آپ بولے'' رامائن میں تلسی داس نے بھی تم لوگوں پر ملامت کی ہے۔ انھیں کیوں نہیں کوستیں؟''

میں بولی ''تو ان کا جس ہی کہاں گاتی ہوں۔ پھر تلسی داس جیسے تھے ویسا انھیں عورت نے بنایا تھا۔ تلسی داس نے تمثیل میں آ کر دیا لکھا ہے۔ عورت سے کسی نے انصاف نہیں کیا ہے۔''

آپ بولے'' ہو گا کوئی بے مثال مہاتما۔''

میں نے کہا'' جانے کب کون ہو گا۔ شاید اس دور میں کچھ سدھار ہو۔''

''گاندھی کے عہد میں بھی اگر اس کا سدھار نہ ہوا تو پھر سو برس کے لیے اسے بھول جاؤ۔'' انھوں نے کہا۔

''کون جانے کیسی حالت ہوگی بری یا بھلی۔'' میں نے کہا۔

''حالت تو بہتر ہونی چاہیے۔ تمھاری طرح اوروں کو بھی غصہ آتا ہو گا۔''

سکھ کے دن بیت گئے۔ وہ کہاں چلے گئے پتہ نہیں۔ جانے پھر لوٹیں گے یا نہیں۔ یہ سنسار بھول بھلیاں ہے۔ کیسے میں سمجھوں کہیں ہوں گے۔ اگر ہوتے تو پھر انھیں واپس آنا چاہیے تھا۔

میں ان پر فرض، نافرض سب ڈال دیتی تھی۔ میں ان سے ضد کرتی تھی۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ میں کتنی نادان تھی۔ وہی میں اب بھی ہوں پر کسی کے سامنے منھ کھولنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں خود کو سب کچھ سمجھتی تھی۔ کیوں نہ سمجھتی؟ میرے لیے انھیں چھوڑ کر اور تھا ہی کون؟ آخر میں اپنے سکھ دکھ کی کہانی کسے سنایا کرتی؟ وہ ہی ایک طرح سے میرے ناؤ کھویا تھے۔ میں اپنا بوجھ ان ہی پر ڈال دیتی تھی۔ شاید اسی لیے میرا ان پر پورا حق تھا۔ ہم ساری باتیں سب سے نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے تو دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے تھے۔ تب ہی انھیں ہمیشہ میری فکر رہتی تھی۔ اور اسی لیے میں منھ بھی پھلاتی تھی۔ اب تو جیسے بدل گئی ہوں۔ اور کیوں نہ بدلتی۔ جب وقت ہی بدل گیا تو مجھے بھی بدل جانا چاہیے تھا۔ ویسی ہی کیسے رہ سکتی ہوں۔ جب ناؤ چلانے والا ہی نہیں رہا تو مسافر کی عافیت کہاں۔ اسی طرح میں بھی ڈوبی ہوئی ہوں۔ دیکھنے میں تو میں (یہاں) بیٹھی ہوں پر حقیقت میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ قریب قریب ایک ڈوبے ہوئے آدمی کی طرح ہوں۔ میرا دل اسی سے ٹوٹ گیا تھا جس سے انھوں نے دم توڑا تھا۔

دلّی: ہولی

کئی سال کی بات ہے۔ میں الہ آباد گئی ہوئی تھی۔ میری بھابھی ہولی کے دن مجھے روکنا چاہتی تھیں۔ آپ بولے ''میں اکیلا ہوں۔ کیسے چھوڑ جاؤں۔ ہاں، میں دلّی جانے والا ہوں، دلّی والوں نے مجھے بلایا ہے وہاں سے دو تین دن بعد لوٹوں گا، تب آپ دونوں ہولی خوب کھیلیں''

دلّی میں ہولی خوب رہی۔ میں ان کے ساتھ تھی۔ وہاں ان کے سارے کپڑے خراب ہو گئے جس وقت ہم واپس الہ آباد پہنچے بارہ بجے تھے۔ آپ بولے ''آؤ مہا دیوی سے ملنے چلیں''۔ ہم مہا دیوی کے دروازے پر پہنچے میں اندر گئی آپ تانگے میں بیٹھے رہے۔ میں فوراً لوٹنا چاہتی تھی مگر مہا دیوی مجھے روکنا چاہ رہی تھیں۔ بولیں ''میں انھیں بھی بلا رہی ہوں۔''

جب ایک دیوی انھیں بلانے گئیں تو آپ ان سے التماس بھرے لہجے میں بولے ''جا کر ان کو بھیجئے۔''

وہ مہا دیوی کے پاس یہ پیغام لے کر آئیں۔

مہا دیوی نے کہا ''وہ خود آکر لوا لے جائیں۔ ہم انھیں جانے نہیں دیں گے۔''

اسی طرح وہ دو گھنٹے تانگے میں بیٹھے رہے۔ بالآخر وہ خود اتر کر اندر آئے اور بولے ''اب بھی نہ جانے دیں گی؟''

سب ایک آواز میں ہنسیں اور بولیں 'چلیے آپ کی ہار تو ہوئی۔''

''میں تو آپ لوگوں سے کبھی کا ہارا ہوا ہوں۔'' انھوں نے کہا۔

''تو پہلے ہی کیوں نہ آ گئے۔''

آپ بولے ''میں سوچتا تھا انھیں جلدی چھٹی مل جائے گی۔''

دیویاں بولیں '' آپ اپنی چالاکی میں تھے۔''

اس کے بعد ان لوگوں نے ناشتہ کروایا۔ ہم لوگ اسٹیشن ہی سے کھا پی کر چلے تھے ناشتہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ان لوگوں نے وہی پرانی (نہ جانے دینے کی) دھمکی پھر دی۔ ناچار آپ کو کھانا پڑا۔''

اس سے پہلے میں الہ آباد عورتوں کی کانفرنس میں شریک ہوئی تھی۔ اور وہ اس کا راستے کا خرچ مجھے دے رہی تھیں۔ میں لے نہیں رہی تھی۔ وہ میری شکایت کرتی ہوئی بولیں '' بابو جی دیکھیے یہ سفر خرچ نہیں لے رہی ہیں۔''

''ان کو ضرورت ہی کب رہتی ہے۔ اور میں آپ لوگوں کے بیچ میں کیوں بولوں۔ آپ سب ایک ہیں۔''

لکھنؤ: وشوامتر کی ایک تحریر

ہم اکثر ادبی، سماجی، اور سیاسی موضوعات پر بحث کرتے تھے۔ میں ان بحثوں میں ہمیشہ عورتوں کی طرف داری کرتی تھی۔ کبھی کبھی میں عورتوں پر مردوں کی لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ کر جھلا اٹھتی تھی۔ اور ان سے کہتی تھی کہ آپ ان کا جواب دیجیے۔ نہیں تو میں خود ان کا جواب دوں گی۔ اس صورت حال سے دو چار ہونے پر یا تو وہ خود اس کا جواب لکھتے اور اگر وہ ایسا نہ کر پاتے تو مجھے ایسا کرنے سے روکتے تھے۔ ''عورتوں کا خود اپنی صفائی پیش کرنے لگنا کچھ اچھا نہ لگے گا'' وہ مجھ سے کہتے۔ میں کہتی ''پھر کون جواب دے گا؟''

ایک دفعہ میں نے 'وشوامتر' میں عورتوں کے بارے میں ایک تحریر پڑھی۔ یہ کوئی پندرہ سال پہلے کی

بات ہے۔نجانے کیوں وہ صاحب عورتوں سے خار کھائے ہوئے تھے۔میں اسے پڑھنے پر ان سے بولی ''اس کا جواب آپ لکھیے۔اگرنہیں لکھتے ہیں تو خود میں اس کا جواب دوں گی۔''

اس پر آپ بولے ''بہت سی عورتیں ہیں وہ لکھیں گی''۔

''آپ کے ایسا کہنے سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔جو اس تکلیف کو محسوس کرے وہ کیوں اس سے نظریں بچا جائے۔''

''کسی مرد کا جواب اچھا ہوگا،تمھارا نہیں۔''

''مردوں میں سب سے بڑے لیکھک تو آپ ہیں پھر کیوں جواب نہیں دیتے؟''

آپ بولے ''میں کسی کو بلا دوں،جیسا تم کہوگی وہ لکھ دے گا۔شاستری جی کو بلا دوں؟''

''بلا دیجیے۔''میں نے کہا۔

شاستری جی تو پڑوس ہی میں تھے۔آئے۔اور آتے آتے ہی بولے ''کہیے میری کیا ضرورت پڑ گئی؟''

آپ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''آپ نے جناب کو بلایا ہے۔''

وہ پتریکا میرے ہاتھ ہی میں تھی۔اسے ان کو تھماتے ہوئے بولی ''ذرا اس مضمون کو دیکھیے۔''

اس مضمون کا عنوان تھا: آج کل ہماری دیویاں کدھر جارہی ہیں۔

ان سے میں نے کہا ''اچھی طرح پڑھ کر اس پر ایک مضمون لکھیے۔اور اگر نہ لکھ سکیں تو بتائیے ان حضرت نے اگر ذرا بھی ٹھنڈے دل سے لکھا ہوتا تو انھیں خبر پڑتی کہ دیویاں جارہی ہیں یا دیوتا جارہے ہیں۔ہاں یہ بات ضرور ہے کہ دیویاں لکھنے والی کم ہیں،دیوتا بہت ہیں اس لیے بازی ان کے ہاتھ رہ سکتی ہے۔اور ٹھنڈے دل سے سوچتے تو یہ بھی پتہ چلتا کہ اس کی اصل وجہ دیویاں ہیں یا دیو۔آج کل بھی ترقی کی اصل وجہ دیویاں ہیں۔اگر سو میں سے سو مرد بد نکلیں گے تو عورتیں محض پانچ نکلیں گی۔یہ میں ضرور کہہ سکتی ہوں کہ مغل راج کے بعد سے عورتوں پر ظلم کے بڑھ جانے نے انھیں کمزور کردیا ہے۔اس میں قصور صرف وقت کا ہے۔جیسا وقت آنے والا ہوتا ہے ویسی ہی ہماری عقل بھی ہو جاتی ہے۔پھر اس میں الزام کس پر دھروں؟ نگران صاحب نے مکمل جانبداری سے یہ مضمون لکھا ہے۔اس طرح سارا الزام اگر عورتیں ان پر ڈال دیں تو لاحاصل ہوگا اور سماج کے لیے یہ بات بہت ہی نقصان دہ ہوگی۔جنم سے مرن تک عورتوں ہی کے ہاتھ مرد رہتے ہیں۔ماں کے روپ میں،بہن کے روپ میں،استری کے روپ میں،بیٹی کے روپ میں عورت ہی سیوا

کرتی ہے۔کون ایسا وقت ہوتا ہے جب وہ عورتوں سے الگ رہتے ہیں؟ دونوں کی ذات ایک ہی ہے۔کیا عورت ذات اگر مرد ذات سے دشمنی کر لے تو وہ زندہ رہ سکتی ہے؟ یہ صاحب شاید عورت سے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔یا پھر انھیں عورتوں کا پیار نہیں ملا؟''

میں نے دیکھا ان باتوں کو سنتے سنتے آپ کی آنکھوں میں آنسو چھل چھلا آئے۔

شاستری جی کو بھی ناگوار گزرا اور وہ کہنے لگے''میں ابھی اس کا منہ توڑ جواب لکھتا ہوں۔''

آپ بولے''جلدی لکھ ڈالیے میں اسے مادھوری میں شائع کردوں گا۔''

شاستری جی بولے''آپ تو ایسے کہتی ہیں جیسے ہم سب کے سب عقل گم کردہ ہوں۔''

آپ بولے''بھائی سزا تو ہمیں بھگتنی پڑی۔وہ تو لکھ کر پرے ہو گئے۔''

چار پانچ دن بعد شاستری جی اس مضمون کو لکھ کر لائے۔میں نے کہا''پہلے آپ اسے سنا دیجیے۔''

اس پر آپ بولے''لکھا تو گیا ہی ہے،پڑھ لیجیے گا۔''

''اگر اس میں سے ایک لفظ بھی کٹا تو آپ جانیں۔''میں نے کہا۔

مضمون مجھے بہت اچھا لگا۔مادھوری میں شائع ہوا۔مردوں میں اس پر بڑا شور رہا۔مگر کسی کو جواب دینے کی ہمت نہ پڑی۔عورتوں نے مبارک بادھی دی۔اس کے مصنف کو۔میں نے پنڈت جی کو شاباشی دی۔مادھوری نے انھیں معاوضہ دیا۔

میں لکھنو میں تھی جو مہاراجن ہمارے یہاں کھانا پکاتی تھی وہ ایک دن شام کو نہیں آئی۔جب وہ اگلی صبح آئی تو میں نے پوچھا رات کہاں رہ گئی تھیں؟''

مہاراجن رو رہی تھی۔بولی''میرا لڑکا کل سے غائب ہے۔''

میں نے پوچھا''تلاش کیا؟ کہاں گیا؟''

وہ بولی''کل صبح جب میں آپ کے یہاں کھانا پکانے آئی تھی تو وہ موجود تھا۔اس کے بعد میں نے سارا شہر ڈھونڈ ڈالا کہیں پتہ نہیں لگتا۔کچھ لوگوں سے پتہ چلا ہے کہ دو تین لڑکوں کے ساتھ کہیں بھاگ گیا ہے۔''

جب مجھ میں اور مہاراجن میں یہ بات ہو رہی تھی تو اس وقت آپ کمرے میں کام کر رہے تھے۔

ہماری باتیں سن کر وہ باہر آ گئے۔ مجھ سے زیادہ انھیں اس کی فکر رہتی تھی کیونکہ اگر وہ کام پر نہ آئیں تو کھانا مجھے پکانا پڑتا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر آپ بولے ''کل کہاں غائب رہیں''؟

وہ ان کے سامنے بھی روتی ہوئی بولی ''بابو جی میرا لڑکا جانے کہاں کھو گیا۔ میں رات دن اسی کے لیے مرتی ہوں اور وہ اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے مجھ سے اس کا کوئی ناتا نہ ہو۔''

آپ بولے ''وہ اتنا نالائق ہے تو تم ہی کیوں مرتی ہو اس کے لیے۔ جانے دو۔ جب اس بدمعاش کو خیال نہیں کہ میں ہی بیوہ ماں کے لیے سب کچھ ہوں تو تم ہی کیوں اس کے لیے جان دیے دیتی ہو۔ کماؤ' کھاؤ' پڑی رہو۔ وہ تم کو کبھی آرام نہیں دے سکتا۔ تمھیں تکلیف ہی دینے کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔''

مہاراجن بولی ''ماں کا دل ہے' نہیں مانتا۔ کل سے چلا گیا ہے' رات دن بیت گیا منھ میں پانی تک نہیں گیا۔ کچھ بھی کھانے کو جی نہیں کر رہا ہے۔''

''آپ بولے ''یہ تمھاری بے وقوفی ہے کیونکہ وہ تو اپنی خوشی سے گیا ہے اور خوش بھی ہوگا۔ تم ناحق مرتی ہو۔''

''اس کی طرح یہ تو خود کو نہیں بنا سکتی نا'' میں نے کہا ''یہ ماں ٹھہری۔ بیٹے کا دکھ نہیں سہا جاتا۔''

''یہ ماں ہیں ٹھیک بات ہے' پر اس کی بھی تو طبیعت ماں جیسی ہونی چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا'' وہ تو ان کا پچھلے جنم کا دشمن ہے۔ وہ دشمنی کا حساب لڑکا ہو کر چکا رہا ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ ماں اس طرح پریشان ہوتی ہے تو بھی بدمعاشی کرنے سے باز نہیں آتا۔ بلکہ اس کی ہمت اور بڑھتی جا رہی ہے۔ میں تو کہتا ہوں مہاراجن تم آرام سے رہو۔ جب وہ لوٹ کر آئے تو گھر میں رہنے بھی مت دو۔ وہ خود ٹھیک ہو جائے گا۔

''ماں اتنی جلدی ایسی بن بھی تو نہیں سکتی۔'' میں نے کہا۔

''جب ایسے بیٹے ہوں تو ایسی ماں بھی بن جانا چاہیے۔ بغیر بنے کام نہیں چل سکتا۔ ورنہ لڑکوں کی ہمت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ ماں اگر کڑے دل کی ہو جائے تو وہ لڑکا بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اگر اسی طرح رو رو کر مرنا ہے تو میرے خیال میں وہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

میں بولی ''سبھی لڑکے ایسے نہیں ہوتے۔''

آپ بولے ''اس زمانے میں تو زیادہ تر ایسے ہی لڑکے دیکھنے میں آتے ہیں۔ دیکھ تو رہی ہو پندرہ

سولہ کا ہو گیا اور یہ ہے اس کی حرکت ۔ ماؤں کی زندگی بس اسی میں گزرتی ہے ۔ جیسے کالجوں میں بہت سے لڑکے پڑھتے ہیں تو انھیں بس یہی خیال رہتا ہے کہ ہم اونچے سے اونچے عہدے پر جائیں گے ۔ مگر سو میں دو چار ہی کو اونچے عہدے ملتے ہیں ۔ بالکل اسی طرح دو چار ہی ماؤں کے بچے لائق نکلتے ہیں ۔ جیسے باقی ماندہ لڑکے (کالج سے) نکلنے کے بعد ٹھوکریں ہی کھاتے ہیں اسی طرح زیادہ تر مائیں لڑکوں کے پیچھے رات دن مرتی ہیں ۔ میں تو کہتا ہوں ایسے لڑکوں کو جلد سے جلد مر جانا چاہیے ۔"

میں نے کہا "نہیں 'یہ بات نہیں ہے ۔ ماں کی طبیعت ہے ۔ خود غرضی تو مردوں میں ہوتی ہے ۔ عورتوں میں جس دن یہ باتیں آ جائیں گی اس دن یہ دنیا 'دنیا نہیں رہ جائے گی ۔ یہ ماں کا پریم ہی ہے جو ہمیشہ بے چاریوں کو رلاتا رہتا ہے ۔ اسے کما کر انھیں کھلانا چاہیے تھا ۔"

آپ بولے "جب بھوکوں مرے گا تو خود لوٹ آئے گا ۔ ان کی بات مانتا ہوتا 'نیک ہوتا 'تو پریم کرتیں ۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے پریشان ہیں ۔ کہتی سب کچھ ہو پھر آشا لے کر ہی مرتی ہو ۔

مہاراجن کو معلوم ہو گیا تھا کہ بابو جی کے دفتر میں ایک جیوتشی ہے ۔ مجھ سے بولی "آپ اس جیوتشی سے پچھوا دیں تو کچھ پتہ چل جاتا ۔"

میں نے کہا "ہاں پچھوا دوں گی" مہاراجن بولی "میں نے سنا ہے کہ جیوتشی ہیں" میں نے جیوتشی سے پچھوانے کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی ۔ اسی وقت جا کر ان سے بولی "آپ اپنے دفتر میں ذرا ان سے پوچھیے گا ۔"

آپ بولے "تمھیں بھی جیوتشیوں اور پنڈتوں کا چکر لگ گیا ۔"

میں نے کہا "میں مانتی ہوں یا نہ مانتی ہوں وہ پوچھتی ہیں انھیں بتا دیجیے ۔ آپ اپنے ساتھ لیتے جائیں ان سے پوچھ دیکھیں گی ۔"

آپ بولے "کہیں کچھ نہیں ہوگا ۔"

میں نے کہا "نہیں 'وعدہ کر لیا ہے پچھوانا پڑے گا ۔"

آپ بولے "خیر میرے ساتھ ہی چلی چلیں ۔"

میں نے مہاراجن سے کہا ۔ "کچھ کھا کر بابو جی کے ساتھ چلی جاؤ ۔"

''بہن جی' میرا دل کھانے کو بالکل نہیں چاہ رہا ہے۔'' مہاراجن بولی۔
آپ نے کہا۔'' کھالو مہاراجن۔''

آپ مہاراجن کو اپنے ساتھ لے گئے۔ جو کچھ مہاراجن نے کہا اسے پنڈت کو سمجھا دیا اور پنڈت کا کہنا مہاراجن کو۔ اس کے ساتھ ساتھ جیوتشی کی تعریف بھی کر دی۔ جیوتشی نے بتایا کہ دو تین دن میں آپ سے آپ تیرا لڑکا آجائے گا' جب مہاراجن چلنے لگی تو اسے کرایے کے لیے دو آنے پیسے بھی دیے۔

تیسرے دن مہاراجن کا لڑکا سچ مچ آ گیا۔ مہاراجن کو خوشی واپس مل گئی۔

میں دوسرے کی ذمہ داری کا کام بھی اپنے اوپر لے لیتی تھی۔ چاہے کام اچھا ہو' چاہے برا۔ میرے ذمہ داری لے چکنے پر وہ کام کو پورا کر ہی دیتے تھے۔ میں اکثر ایسا ہی کیا کرتی تھی۔ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں کہ وہ میری بات مانیں گے یا نہیں اور کیوں ایسا خیال آتا جب میری ہر خواہش پوری ہوتی گئی تھی۔ وہ معمولی سے معمولی اور بڑی سے بڑی بات پوری کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس لیے میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ کون سا کام کروں اور کون سا کام نہ کروں۔ شاید اس لیے وہ میرا کہا نہ ٹالتے تھے۔ کہ میں محسوس نہ کروں کہ میں وہ کام نہیں کر سکتی۔ شاید انھیں میری بار بیاری نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے وہ ایسا پریم سے کرتے رہے ہوں کہ میں دکھی نہ ہوؤں۔ اپنی بات وہ چھوڑ بھی دیتے تھے مگر میری بات نامنظور نہیں کرتے تھے۔ مجھے اس لمبے جیون میں یاد نہیں آتا کہ میں نے کوئی کام کرنے کو کہا ہو اور اسے انھوں نے نہ کیا ہو۔

میرا مزاج مغرورانا تھا اور میری یہ عادت بڑھتی ہی گئی۔ میں جلدی کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کہتی' یہاں تک کہ اپنی ضرورت بھی کسی کو نہیں بتاتی کیونکہ اگر کوئی میری بات نہ مانتا تو میری آتما رو پڑتی۔ میری آتما تو یوں ہی روتی ہے۔ اپنے ان دنوں کو یاد کرتی ہوں تو دل بھر آتا ہے۔ میں یہ سب باتیں اس خیال سے نہیں لکھ رہی ہوں کہ پڑھنے والے دکھی ہوں۔ میں تو یہ سوچ کر لکھ رہی ہوں کہ میں ایسی کیسے بن گئی۔ میں اگر کچھ بن گئی تو کچھ تو میری خوش نصیبی اور کچھ آپ نے مجھے بنایا۔ سب کے گھر عورتیں آتی ہیں اور بہت ہوا تو پتی کے گھر کی مالکن بن جاتی ہیں۔ مگر میں گھر کی مالکن کی جگہ ان کے دل کی مالکن تھی کیونکہ میں اپنی خواہش کے مطابق ہی سب کچھ ان سے کرواتی تھی۔ اس میں میں یہ نہیں کہتی میری کسی خصوصیت کو دخل تھا۔ اس میں میرا اپنا کچھ نہیں تھا' سارا بڑپّن میری خوش نصیبی کا تھا۔

میرے گھر میں ایک بوڑھی بارن (ایک ہندو ذات) نوکرانی تھی۔ میرے ہی گھر کا کام کرتی اور

رات دن میرے ہی گھر میں رہتی۔ اس بارن کے چار جوان بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ مگر بڑھیا کو کوئی بٹھا کر کھلا نہیں سکتا تھا۔ اور جب اس کا مہینہ پورا ہوتا اس کا کوئی لڑکا آ کر اس کی تنخواہ لے جاتا۔ ایک دن میں اور وہ بیٹھے تھے۔ چند منٹ پہلے ہی اس کا لڑکا روپیہ لے کر گیا تھا۔ آپ بڑے افسوس کے ساتھ بولے "اس بڑھیا کے لڑکے آدمی ہیں کہ شیطان۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ بوڑھی ماں کام کرے اور اس کے جوان جوان لڑکے تنخواہ ہتھیانے پہنچ جائیں"۔

میں بولی" آپ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں۔"

بولے" میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جوان لڑکے بڑھیا کی کمائی لینے کیوں آتے ہیں۔ انھیں خود ماں کو دینا چاہیے۔ بڑے بے حیا ہیں سالوں کو شرم بھی نہیں آتی۔"

"شرم کیوں آئے؟" میں نے کہا" شرم تو اچھے اچھوں کو نہیں آتی یہ تو جاہل ہیں"۔

آپ بولے" تو یہ بڑھیا دیتی کیوں ہے؟"

" آ کر روتے ہوں گے' اس پر دے دیتی ہوگی۔ وہ تو ماں ٹھہری' کیسے ان کی تکلیف دیکھ سکتی ہے۔ آپ نے ایک کہانی بھی تو لکھی تھی' بیٹوں والی بیوہ' آپ تو اس بارے میں پہلے ہی اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں پھر آپ مجھ سے پوچھتے کیوں ہیں؟" آپ بولے" میں سمجھتا تھا زیادہ خود غرضی صرف انگریزی پڑھ لکھ جانے والوں میں آئی ہے۔' اب ان سبوں کا حال دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہوں۔ پہلے میں دیکھتا تھا چھوٹے لوگوں میں ماں کی عزت ہوتی ہے' اب معاملہ الٹا ہے۔ اس بے چاری کو کوئی روٹی دینے والا بھی نہیں ہے۔ یہ تو جوان ہو گئے ہیں۔ جیسے بچپن میں اس کا دودھ چوس چوس کر پیتے تھے اب جوان ہونے پر اس کا پیسہ چوسنے کو تیار ہیں۔ ان میں اور جانوروں میں کیا فرق ہے۔ جیسے کتیا کے سامنے روٹی پھینک دو تو اس کا بچہ اسے چھین کر کھا جائے گا' اسے یہ خیال نہ ہوگا کہ ماں بھوکی ہے تو پھر ان میں اور جانوروں میں کیا فرق ہوا ہے ان باتوں کو بہت دنوں میں انسان سمجھ سکا تھا مگر اب خود غرضی اس طرح بڑھ رہی ہے کہ انسان پھر اپنے قدیم زمانے کو لوٹا جا رہا ہے۔"

میں بولی" آپ کو نئی نئی باتیں سوجھ جاتی ہیں۔"

بولے" نہیں جی' میں دیکھتا ہوں اس بے چاری سے بڑی بالٹی نہیں اٹھتی۔ صبح جب وہ پانی لاتی ہے تو اس کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں۔ یا میں خود اپنا کام کر لیتا ہوں یا ادھر ہی آ کر نہا لیتا ہوں۔ شام کے وقت میں خود چارپائی چھت پر ڈال لیتا ہوں۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آتا ہے۔ مگر ان

بھوتوں کو ترس کھانا چھو کر بھی نہیں گیا ہے۔تم ان لوگوں کو منع کیوں نہیں کر دیتی ہو۔''؟

مجھے اس طرح دوسرے کے گھر کی ناانصافی میں دخل دینے پر غصہ آ گیا۔ میں بولی ''مجھ سے کہتے بن نہیں پڑتا۔ آپ ہی سمجھا دیجیے۔آپ لوگوں کو سمجھانا جتنا آسان سمجھتے ہیں اتنا ہے نہیں۔ان کی زندگی میں جو عزت بیٹوں کی ہے وہ کسی اور کی نہیں۔ یہ کسی کے سمجھائے نہ سمجھیں گے۔''

''تب ہی تو لڑکے بہت شریف نکلے ہیں نا! مور پیا مور ناؤں نہ پوچھے موری سہاگن ناؤں' یہی حالت اس کی ہے'' وہ بولے میں نے کہا۔ ''رانڈ مانڈ رے خوشی۔''

اس دن دیر تک ہم دونوں میں بحث بحثی ہوتی رہی۔

آپ بولے ''عورتوں میں ایک بات یہ بھی تو ہے کہ شوہر جیتا رہے' مانے یا نا مانے' تو وہ عورت خوش قسمت سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ بڑی سکھی ہے۔جس کا شوہر نہ ہو وہ بدنصیب سمجھی جاتی ہے اس بے چاری کو ابھاگن کہیں گے۔''

میں نے کہا'' آپ کی اس بات کی تو میں ہی تردید کیے دیتی ہوں: جس کا پتی مر گیا وہ تو سچ مچ ابھاگن ہے۔''

''تم غلطی پر ہو۔'' انھوں نے کہا۔

''میں غلطی پر نہیں ہوں آپ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں اس کو نہیں مانتا۔'' وہ بولے۔

''آپ کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔''

''مان لو کوئی مرد اپنی عورت کے ہوتے ہوئے دوسری سے شادی کر لیتا ہے اور پہلی کی بات تک نہیں پوچھتا۔ بلکہ دل سے یہ چاہتا ہو کہ مر جائے تو اچھا ہے تم ہی بتاؤ اس کے جیون میں کیا ہے؟ اس کو تم سکھی سمجھتی ہو؟ تم ایسا سمجھو' میں تو نہیں سمجھوں گا۔ میں تو اسے ہی سکھی سمجھوں گا جس کا پتی مر گیا ہے مگر ان میں جو پریم تھا' اپنا پن تھا۔کم سے کم وہ تو اس کے ساتھ ہے (جس کی بات تم کر رہی ہو) اس کے ہاتھ کیا لگا؟ اس سہاگن کے ہاتھ تو کچھ نہیں آیا۔بس جلنا اور نفرت اس بیوہ کو تڑپن ہے' جلن ہے مگر بیوہ کے دل کے اندر جو اپنا پن اور محبت کی کونپلیں ہیں وہی اس کی مستقل ملکیت ہے۔اس کے مرنے پر ہی وہ اس سے دور ہو سکے گی۔ جو اس کے دل کے اندر محفوظ ہے وہی اس کے جیون کی مستقل اور انمول شے ہے' جس کو جیون میں یہ چیزیں مل جائیں اسے اور کس چیز کی ضرورت ہے۔اب اس کی حالت کا اندازہ لگاؤ جسے زندہ شوہر جلا رہا ہے۔''

مجھے کیا معلوم تھا کہ ان باتوں کو یاد کر کے مجھے ایک دن رونا پڑے گا۔ ان کے سمبندھ کی ساری یادوں کو من میں سنجو کر خود کو خوش رکھنا پڑے گا۔ واہ ری قسمت' تو سب کچھ کرواتی ہے۔ تیرا کھلونا سبھی کو بننا پڑتا ہے۔ میرے شوہر نے کہا تھا قائم رہنے والی چیز یاد ہی ہوتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔ صرف وہی چیز مستقل ہے۔ ایک دن وہ تھے جب دنیا بھر کی بات بے بات پر گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ اس وقت وہ باتیں بے مقصد معلوم ہوتی تھیں۔ آج انھیں کو سوچ سوچ کر لکھنے بیٹھی ہوں حالانکہ ان باتوں کو یاد کر کے دل پر چھریاں سی چل جاتی ہیں۔ پھر بھی انھیں یاد کیے بنا نہیں رہا جاتا۔ ان کو سوچنے میں جو ایک جھلک سی دکھائی پڑ جاتی ہے وہ بیتی ہوئی خوشیوں کی ایک یاد ہے۔ مجھے بے بس ہو کر لکھنا پڑ رہا ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہی ہوں یہ سوچ کر نہیں لکھ رہی ہوں کہ اس سے پڑھنے والے لطف اندوز ہوں گے یا اس سے کوئی حقیقت برآمد ہوگی۔ میں کیوں لکھتی ہوں کیا سوچتی ہوں خود نہیں جانتی' ہاں یہ جانتی ہوں کہ ان باتوں کو سوچنے میں کوئی سچائی' کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ تبھی تو لکھتی ہوں۔ جب آدمی کا رونے کو جی چاہتا ہے تو اس کو دکھ کے واقعات یاد کرنے میں مزہ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے اس کے یاد کرنے اور سوچنے کی۔

بڑے چچیرے بھائی صاحب کا انتقال

سنہ بتیس کی بات ہے۔ آپ کے بڑے چچیرے بھائی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ آپ کو ان کی موت سے بڑا صدمہ ہوا۔ پہلے ان کی بیماری کا تار آیا تھا' آپ کی بیٹھنے کی جگہ پر دو تین پھوڑے ہو گئے تھے جس سے وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ مجھ سے بولے ''میرا بستر اتیار کرو صبح کی گاڑی سے میں جاؤں گا' چاہے لیٹے ہی لیٹے جانا پڑے۔ اگر پھوڑا پھوٹ گیا تو دیکھا جائے گا۔ کیا کروں۔ یا تم ہی چلی جاؤ۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں گے۔''

میں نے کہا ''تو مجھ سے وہ کیسے بتائیں گے۔ اور اگر میں چلی گئی تو آپ بیماری کی حالت میں اکیلے رہ جائیں گے۔''

دوسرے دن دوسرا تار آیا کہ ان کا سرگ واس ہوگیا۔ آپ روتے ہوئے بولے ''دونوں بچوں کا کیا ہوگا' ابھی بہت چھوٹے ہیں اور گھر میں دو بیوائیں۔''

اس کے چوتھے دن جب آپ بنارس کے لیے روانہ ہونے لگے تو مجھ سے بولے ''بنا وارنٹ کی گرفتاری ہو رہی ہو۔ تم پہلے کی جیل گئی ہوئی ہو شاید اس بار بنا وارنٹ کے تم پکڑ لی جاؤ۔ میں تم سے یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب تک میں نہ آ جاؤں تب تک تم گھر سے باہر مت نکلنا ورنہ ایک اور مصیبت آ جائے گی۔''

میں نے کہا''میں ہرگز باہر نہیں جاؤں گی۔''

بنارس پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو دیکھ کر جب ان کی دونوں بھاوجیں رونے لگیں۔تو آپ بولے''نہ رو بھابھی تمھارے لیے میں ہوں۔مرے تو بھیا ہیں۔بچوں سے یہ کبھی نہ کہنا کہ تمھارے بابو مر گئے۔میں اب تک تین بچوں کا پتا تھا اب سے پانچ کا پتا ہوں۔جو بھی ضرورت پڑے مجھے فوراً خبر کرنا۔پھر میں اب یہاں چلا آنے والا ہوں۔میں اس کرم کریا کو بہت کم پسند کرتا ہوں'اسے معمولی ڈھنگ سے ہی کرنا۔''

پھر سو روپے بینک سے نکال کر انھیں دیتے ہوئے بولے''میں جا رہا ہوں'ان کی گرفتاری کا سخت اندیشہ ہے۔''

''آج'' کی ایک تحریر

کاشی (بنارس) کا ایک واقعہ ہے۔آپ کی ایک تحریر''آج''میں چھپی'اس پر کاشی کے ہندو چراغ پا ہوئے۔وہاں ہندو سبھا کا ان دنوں زور تھا۔کانگریسی بھی ہندو سبھا کی طرف داری کرتے تھے۔کئی صاحبان آئے اور بولے'آپ نے جو مضمون لکھا ہے اس سے کاشی کے ہندو سخت برہم ہیں' ان آنے والوں میں زیادہ تر کانگریسی تھے۔بابو جی جب اندر آئے تو میں نے پوچھا''یہ لوگ کیا کہہ رہے تھے؟''

''کچھ نہیں جی'وہ مضمون بڑا خوبصورت ہے۔''

''مارنے کی دھمکی آخر کیوں دے رہے ہیں؟''

''یہ سب ہندو سبھا والوں کا کام ہے۔''

''یہ سب تو کانگریسی تھے۔''

''آج کل یہ لوگ بھی اسی کے طرف دار ہیں۔''

''ایسا مضمون آپ کیوں لکھتے ہیں کہ لوگ دشمن ہو جائیں۔یہ کبھی گورمنٹ'کبھی پبلک کوئی نہ کوئی آپ کا دشمن رہتا ہی ہے۔آپ ڈھائی ہڈی (ڈیڑھ پسلی) کے تو آدمی ہیں۔''

''ادیب کو پبلک اور گورنمنٹ اپنا غلام سمجھتی ہے۔آخر ادیب بھی کوئی چیز ہے۔وہ سبھی کی مرضی کے مطابق لکھے تو ادیب کیسا؟ادیب کی بھی ہستی ہے۔گورنمنٹ جیل میں ڈال دیتی ہے'پبلک مارنے کی دھمکی دیتی ہے۔اس سے ادیب ڈر جائے اور لکھنا بند کر دے؟''

میں نے کہا" سب کچھ کرے مگر اپنی جان کے دشمن پیدا نہ کرے۔"

وہ بولے" ادیب جو لکھتا ہے اپنے دل میں پیدا ہونے والی کرید سے لکھتا ہے۔"

"یہ بات درست ہے لیکن روز کا جھگڑا ٹھیک نہیں۔"

"یہ دنیا ہی جھگڑے کی ہے۔ یہاں گھبرا کر بھاگنے سے کام نہیں چلتا۔ یہاں میدان میں ڈٹے رہنا چاہیے۔"

میں نے سوال کیا" وہ لوگ کبھی کانگریسی کبھی ہندو سبھائی کیسے ہو جاتے ہیں؟"

"تو (ان کے ساتھ) میں کیا ہو جاؤں؟"

"ویسا نہ ہونے سے تو اور بھی برا ہوگا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ بے اصول ہو جائیں۔ وہ سب تو کہہ رہے ہیں کہ اب تم مسلمان ہی ہو پر ان کو کیا۔ آپ مسلمان نہیں عیسائی ہو جائیں۔"

"یہ ان لوگوں کا قیاس ہے۔ یہ لوگ کبھی اپنے دل کا دروازہ کھلا نہیں رکھتے۔ میں ان کو کہاں تک سمجھاؤں۔ دیکھتی تو ہو ان لوگوں کو یہ ہر جگہ دخل دیتے پھرتے ہیں چاہے معاملے کو سمجھیں یا نہ سمجھیں۔"

"تو انھیں آپ نے سمجھایا کبھی؟" میں نے پوچھا۔

"سمجھتا تو انسان تب ہے جب سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور تمھیں کیوں فکر ستا رہی ہے؟"

"دشمنوں کے درمیان رہ کر کیا کسی کو فکر نہیں ہوتی؟"

"میں تو بالکل بے فکر رہتا ہوں نہیں تو کچھ کر ہی نہ پاؤں۔ میں تو دل سے دونوں (مذہبوں) کو مانتا ہوں۔ کوئی ادیب اس طرح کی باتوں پر دھیان دے اور ڈرے تو وہ اپنے خیالات عوام تک پہنچا چکا! وہ عوام کی رہنمائی ایسے میں کیا خاک کرے گا۔"

"جب عوام آپ کے خیالات پر کان ہی نہیں دھریں گے انھیں پڑھیں گے ہی نہیں پڑھ کر برا بھلا کہیں گے۔ تو ایسے خیالات سے کیا حاصل"؟

"ادیب ہر ایک کی پسند کی بات کیسے لکھ سکتا ہے۔ وہ تو جی حضوری ہوئی۔ ادیب اس میں کہاں رہا۔ ادیب کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کرے گا اور دل سے عوام ان خیالات کو قبول بھی

کریں گے۔ اور یہ بات بھی تو ہے کہ عوام بھیڑ کی مثال ہیں۔ جسے مانا اسی کے اشارے پر چلتے رہے۔ یہ تو اچھی بات نہیں۔ میری رائے ہے عوام خود اپنے بُرے بھلے کا فیصلہ کریں۔ یہاں تو لوگوں کو لیڈری کی پڑی رہتی ہے۔ وہ بھلا کیسے عوام کے فائدے کی بات سوچیں۔ ہندو مسلمان لڑائی میں ہی تو یہ اپنی لیڈری کو چمکاتے ہیں۔''

''تو پھر ان کی درستی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''جب ایشور کو منظور ہوگا تب ہی یہ جھگڑے ختم ہوں گے۔ اور تب ہی ہم آزادی حاصل کر پائیں گے' اس کے پہلے اس کی کیا امید ہوسکتی ہے۔ اور وہ آزادی ہی کیسی جس میں ہم دونوں لڑتے رہیں۔ گاندھی اس عہد کا سب سے بڑا پنڈت ہے۔ اس کا دل دونوں کے لیے ایک جیسا ہے۔ وہ آدمیت پہلے دیکھتا ہے۔ جب آدمی' آدمی نہ رہا تو مذہب کیا اور کس کا؟''

میں نے کہا'' لیکن گاندھی تو سب کا پیارا ہے۔''

''تم جانتی نہیں ہوان کو تو لوگ گالیاں تک دیتے ہیں۔ خود گاندھی کا لڑکا مسلمان ہوا اور اس بات پر کستوری بائی نے رونا پیٹنا مچایا۔ اس پر گاندھی جی نے انھیں کافی سمجھایا اور برابر کہتے رہے کہ بھائی مذہب کی وجہ سے اس میں کون سی نئی بات پیدا ہوگئی۔ گاندھی جی کا برتاؤ سب کے ساتھ برابر کا ہے۔ انھوں نے مہتر کی لڑکی کو اپنی لڑکی سے زیادہ پیار سے اپنی تھالی میں کھلایا'' پالا پوسا۔''

''کیا'' آپ گاندھی بننا چاہتے ہیں؟''

'' گاندھی بھی ایک آدمی ہیں۔ کوشش سے کبھی گاندھی ہو سکتے ہیں۔ ان میں اخلاقی جرأت ہے۔ پہلے ان کا جیون بہت اونچا نہیں تھا اور اس زمانے میں لوگ انھیں مہاتما بھی نہیں کہتے تھے۔ وہ اپنی کوشش سے مہاتما بنے۔ کسی نے مہاتما نہیں بنایا۔''

میں نے کہا'' آپ بھی مہاتما بننے کی کوشش میں روز جھگڑا کھڑا کیے رہتے ہیں۔ کیا جھگڑوں ہی سے لوگ مہاتما بنتے ہیں؟''

''میں بھی کام کرتا ہوں' گاندھی جی بھی کام کرتے ہیں۔ ان پر بھی مصیبتیں پڑتی ہیں مگر انھوں نے کبھی پرواہ کی؟ یہی جیون ہے۔''

میں نے کہا'' تو آپ بھی اب گھر بار چھوڑ کر مہاتما جی بنیے نا!''

بولے'' میں اگر گھر بار چھوڑ کر پبلک کا آدمی ہو جاؤں تو رونے کا دن نہ آئے۔''

میں نے کہا "تو کیا برا ہے۔ اب بھی آپ رات رات بھر قلم چلاتے رہتے ہیں۔"

"قلم چلانا تو مزدوری ہے۔ نہ چلاؤں تو کیا خاک کھاؤں۔ مہاتما گاندھی بھی کھانا ہی کھاپاتے ہیں۔"

"یہاں کس نے ہاتھی گھوڑا رکھ لیا۔؟ میری سمجھ میں وہ سب سے اچھا ہے۔"

"ہاں' کوشش میری یہی ہے۔"

"عورت کی آزادی کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟" میں نے پوچھا

"میں دونوں میں برابری چاہتا ہوں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"برابری کی تحریک آپ کیوں نہیں چلاتے؟"

"میں اپنی اس طاقت کو ادب میں سمونا چاہتا ہوں۔"

"لوگ کیا اسے پڑھتے ہیں؟"

"اس کے یہ معنی تھوڑے ہی ہیں کہ لوگوں کی بے تعلیمی کی وجہ سے ادب میں اس کو نہ سمویا جائے۔ دھیرے دھیرے سب ہی راستے پر آجائیں گے۔ تمھیں معلوم ہے روس کی اس وقت کی حالت کا اظہار دو برس پہلے وہاں کے ادیبوں نے اپنی تحریر میں کر ڈالا تھا۔"

"اتنی مدت میں کیسے زندہ رہوں گی۔"

"تم فوراً اچھل چاہتی ہو۔ یقین ممکن ہے کہ اس وقت کو ہم دیکھ لیں۔ ادھر ۲۵ برس میں ہی زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ سماج جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ تمھاری اماں کے کبھی خیال میں جیل جانا آیا تھا؟ تم کیوں جیل پہنچ گئیں؟ ایک تم ہی کیا بیس ہزار عورتیں جیل گئی ہیں۔ اور پھر کیسے سماج آگے بڑھتا۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ عورتوں میں کافی ہل چل ہے۔ یہ سماج کے مبارک لچھن ہیں۔"

"ابھی تو بہت سے مرد عورتوں کو پردے میں رکھنا اچھا سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اتنی پرانی عادت ایک دن میں کیسے چھوٹ سکتی ہے۔" آپ بولے۔

"ہمارے عوام کی زیادہ تعداد دیہاتوں میں رہتی ہیں۔ ان میں تو وہی سب پرانی باتیں ہیں۔"

''ان پرانی باتوں کو دور کرنا تم لوگوں کا کام ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''ہم ہیں ہی کتنی۔'' میں نے کہا۔

''چھوٹی سی چنگاری پورے جنگل کو خاک کر دیتی ہے۔ جب جب کسی دیش نے ترقی کی ہے تو کچھ ہی لوگوں کے ہاتھوں کی ہے۔ یہاں بھی جو سدھار ہو رہا ہے تھوڑے ہی آدمیوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا ''ابھی تو یہ حال ہے کہ گاؤں والے جب ہم کانگریس کا چندہ مانگنے جاتے ہیں تو گالیاں دیتے ہیں۔ اور وہ دیہات کے ہی نہیں شہر کے بھی ہوتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''عوام کو اوپر اٹھانے والا جب خودمٹ جاتا ہے تب تو قیر پاتا ہے۔ عورتیں تمھیں گالیاں دیتی ہیں تو تمھیں برا کیوں لگتا ہے۔ تعریف کی بات تو تب ہے جب ان گالیوں کو پیار کے حرف سمجھو اور ان ہی میں مل جانے کی کوشش کرو۔''

میں نے پوچھا '' آپ چندہ مانگ سکتے ہیں؟''

بولے۔ ''میں نے کوشش ضرور کی ہے پر بھائی میں تو ناکام رہا۔''

''ہم لوگ دس دس ہزار روپے ہر ماہ چندہ لائے ہیں۔ آپ کی ان دونوں رسید بکوں کا چندہ میں نے اگایا تھا۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ عورتیں اپنے کام میں ہمیشہ کامیاب رہی ہیں۔ وہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکتی ہیں۔''

''بہت سے مرد بھی ہیں جنھیں لاکھوں چندہ ملا ہے۔''

''انھیں مانگنے کا فن آتا ہے۔ اور یہ بہت اچھا فن ہے۔ میں دیکھتا ہوں تم روزانہ لیکچر دے ڈالتی ہو میں نے تو لیکچر نہیں دے سکتا۔''

میں بولی ''لیکچر کیا دیتی ہوں اپنا گلہ چھڑاتی ہوں۔''

''اپنا کام تو نکال لیتی ہو۔''

اکتوبر ۱۹۳۲ء — دھن تیرس

ہم لوگ بیڑیا میں تھے۔ ابھی تین دن دیوالی باقی تھی۔ دھن تیرس تھی۔ جاگرن نکل رہا تھا۔ آپ

اسے ترتیب دینے میں اتنے مصروف تھے کہ انھیں دیوالی کی خبر تک نہ تھی۔ تیرس کے دن کوئی تین بجے پریس سے لوٹے۔

بولے ''پرسوں شاید دیوالی ہے۔''

میں بولی ''آپ کو آج معلوم ہوا؟''

آپ بولے ''آج تیرس ہونے کی وجہ سے شہر کی دکانیں سجی ہوئی ہیں۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کی صفائی کروا رہے ہیں۔ کیا تمھارا گھر ویسے ہی پڑا رہے گا؟''

''آپ کو جاگرن اور ہنس سے فرصت ملے تو کوئی دوسرا کام ہو سکے گا۔'' میں نے کہا۔

آپ ہنستے ہوئے بولے ''کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ میں ایسا بھول گیا کہ کچھ پوچھو مت۔ مجھے تو بالکل یاد نہ رہا۔ اوپر سے تم روٹھی ہوئی ہو۔ واہ۔''

''آپ کو میرے روٹھنے کی پروا ہی کب ہے۔ میں نے کئی دن پہلے آپ سے کہا تھا کہ دیوالی آ گئی ہے اور اس پر آپ نے کہا تھا 'مجھے فرصت ہی نہیں ہے۔ جاگرن جلدی نکالنا ہے' '' میں نے کہا۔

''اس دن کے بعد سے مجھے بالکل ہی دھیان نہیں رہا۔ تم بھی چپی لگا کر بیٹھ رہیں''۔

''میں آپ سے کہہ چکی تھی۔ دوبارہ کیا کہتی۔'' میں نے کہا۔

''کام میں گھر کر مجھے یاد نہیں رہا'' آپ بولے ''آج بازار کو سجا دیکھ کر خیال ہوا کہ دھن تیرس ہوگی۔ بڑی غلطی ہوئی۔ مکان کی صفائی ہو جانی چاہیے تھی۔ اچھا تو کیوں اب دیر کرتی ہو؟ تم روپے دے دو میں چونا وغیرہ تو منگوا لوں۔ مکان ہی کون بہت دور ہے۔ سب سامان مکان پر منگوا کر اسی وقت چلے چلیں گے۔ آج کے دن کوئی نیا برتن منگوالو۔ تم روپے دے دو میں سامان لا دوں گا۔ تم تیار رہو۔ لوٹتے ہوئے میں اکا لیتا آؤں گا۔ چلی چلنا۔ کافی مزدور لگا لیں گے۔ ایک دن میں سب کام ہو جائے گا۔ شام کو اپنے گھر میں آرام سے دیوالی منانا۔ اور نہیں تو کیا دوسرے کے مکان میں روشنی کرو گی۔''

میں نے کہا ''ایک دن میں آپ کیا کیا کر لیں گے۔''

بولے ''نہیں جی، سب ہو جائے گا۔ تم سامان تو منگوالو۔ اب دیر نہ کرو، شام ہو رہی ہے۔ اور دیر ہوئی تو جلدی میں کچھ نہ ہو سکے گا۔''

ہم دونوں میں یہ باتیں ہورہی تھیں کہ بہن کا لڑکا بھی آ گیا۔ وہ کاشی وشیو ودھالیہ میں پڑھتا تھا۔ جب اس نے سنا گھر جانے کی تیاری ہو رہی ہے تو بولا "ٹھیک تو ہے موسی۔ چیزوں کا نام لکھوادو۔ میں اور دھنو سامان خرید کرلے آئیں۔"

آپ ہنس کر بولے "چلو یہ بھی میری رائے کے ٹھہرے۔ اچھا اب تم جلدی کرو۔ اسے سامان کی فہرست لکھواؤ۔"

میں نے اسے سامان لکھوایا۔ آپ اِکا لینے گئے۔ ہم لوگ دن رہے گاؤں پہنچ گئے۔ دونوں لڑکے بازار جاچکے تھے۔ میں اپنے مکان کو کھول کر اس کی صفائی کرانے لگی۔ صبح پندرہ، سولہ مزدور کام کرنے کے بلوائے گئے۔ رات کو جب لڑکے چونا لے کر آئے تو اسے پانی میں ڈال دیا گیا۔ صبح ہی سے گھر کی صفائی ہونے لگی۔ کچھ لوگ دروازوں اور کھڑکیوں پر رنگ کرنے لگے۔ آپ صبح سے دن بھر مزدوروں کے ساتھ کام کراتے رہے۔ مکان کے بہت سے حصّوں میں رنگ وغیرہ لگایا۔ شام کو بچوں کے ساتھ دیے چننے لگے۔ جب روشنی کر چکے اور دروازے پر بہت سے کاشت کار اور دوسرے لوگ آ کر بیٹھ گئے تو آپ دیوالی کا تیوہار منانے کی اہمیت لوگوں کو سمجھانے لگے۔ اس کے منانے کے قاعدے کیا ہیں۔ اس طرح کی بہت سی باتیں آپ لوگوں کو انہیں کی زبان میں بتا رہے تھے۔ کیا اس طرح کی گرم جوشی کو آپ معمولی بات کہیں گے؟

وہ دن میرے لیے کتنے سکھ اور خوش نصیبی کے تھے۔ میں گھر والی تھی۔ بھاگیہ وتی نصیبے والی تھی۔ میرے پاس سب کچھ تھا اور اب چیزیں تو سب کچھ ہیں پر وہ نہیں ہیں۔ اس لیے میرے لیے تو اب کچھ بھی نہیں رہا۔ جب میرے وہ ہی نہیں رہے تو آگے کیا کہوں۔ باقی میرے لیے ہو ہی کیا سکتا ہے۔ ان باتوں کو سوچتے سوچتے دل سے ایک آہ نکلتی ہے۔

اب انہیں دوڑ دوڑ کر چراغ رکھتے دیکھتی تھی تو ہنسی آتی تھی۔ بچوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

میں بولی "آج تو آپ ایسے لگے ہوئے ہیں کہ آپ میں بچوں سے بھی زیادہ گرم جوشی نظر آ رہی ہے۔"

آپ بولے "آج کل کے لڑکوں میں ایسی گرمجوشی کہاں۔"

میں بولی "آج کل کے لڑکے کیا دیوالی اور ہولی منانے کے لیے لکھتے پڑھتے ہیں۔ وہ لوگ سوچتے ہوں گے اس میں رکھا ہی کیا۔"

آپ بولے "کچھ نہیں جی، آج کل کے لڑکوں میں گرم جوشی نہیں ہے۔ تیوہاروں اور خوشی کے موقعوں پر خوش ہونا زندگی کی علامات ہیں۔ جس میں جتنی زندگی رہتی ہے وہ اتنا ہی خوش رہتا ہے۔"

عین ہولی سے پہلے گاؤں جاتے ہیں: سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء

ہولی کے ایک دن پہلے جب کھانا پینا ہو چکا اور پکوان بھی بن چکا تو آپ بولے "چلو کل گاؤں نہ ہو آئیں؟"

میں بولی "پہلے سے تو آپ نے کہا نہیں۔ کل صبح ہولی ہے۔ کتنا سامان باندھ کر لے چلوں گی۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں کہا۔ اب کون کون سا سامان باندھوں۔

بولے "اس میں دقت کیا ہے۔ بنانے کے لیے تو سامان یہیں سے جاتا۔ اب گیا تو اور بھی اچھا رہے گا۔

گاؤں میں زیادہ اچھا رہے گا۔ دیکھا بٹی بیمار تھی اچھی ہوگئی۔ بچہ بھی اچھا ہے۔ چلو گاؤں چلے چلیں۔ صبح ایک دو اکے بلا لیے جائیں گے۔ سب آرام سے پہنچ جائیں گے۔ گھر جب پاس ہی ہے تو باہر ہولی کیوں کریں۔ آدمی دور دور سے اپنے گھر تیوہار کرنے آتا ہے۔"

میں بولی "عین ہولی کے دن راستے بھر بڑی پریشانی رہے گی"۔

آپ بولے "تو کیا ہوا۔ رنگ سے ڈرتی کیوں ہو۔"

میں نے کہا "ایک رنگ ہی تو نہیں ہوگا۔ گالیاں بھی تو بکیں گے۔"

آپ بولے "ایک گھنٹے کے لیے پردہ کر لینا۔"

"اس کے معنی یہ ہوئے کے چلا ضرور جائے۔" میں نے کہا۔

خیر میں راضی ہوگئی۔ اس دن آپ صبح پانچ بجے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیت الخلاء سے لوٹ کر اور ہاتھ منھ دھونے سے فارغ ہو کر آپ سیدھے جاکر اکا بلا لائے۔

مجھ سے بولے "سب سامان تو رکھ ہی چکی ہو؟"

میں نے کہا "ابھی تو بستر باندھنا باقی ہے۔"

پھر مجھے بستر باندھتے ہوئے دیکھ کر بولے "ہٹو۔ (تم سے بستر نہیں بندھے گا) میں بستر باندھوں گا۔"

"کیوں نہیں بندھے گا۔" میں نے کہا۔

بولے "ذرا ذرا سے تو ہاتھ ہیں۔"

میں نے کہا'' آپ ہی کے کونسے لمبے چوڑے ہیں۔''

انھوں نے میرے ہاتھ سے چھین کر بستر خود باندھا۔ بستر باندھ کر اکّے والے کو اندر بلایا۔ گھر میں تالا لگوانے لگے۔ ہولی کا دن تھا ہی' سامان سب ساتھ گیا تھا۔ آٹھ بجنے سے پہلے ہم لوگ اپنے مکان پہنچ گئے۔ میں کھانا پکوانے لگی۔ آپ دروازے پر بیٹھے رات کو بھانڈوں کا ناچ ہونے کا انتظام کر رہے تھے۔ شام کو میں نے دیکھا گاؤں بھر کے کاشت کار وغیرہ سبھی دروازے پر جمع ہیں لوگوں نے جُٹ کر بھانڈوں کا ناچ دیکھا۔ سب کے لیے بھانگ (بھنگ) وغیرہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ ایسا جوش چھایا تھا کہ کیا کہوں۔ بیٹی کے بچے کو گود میں لیے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے اندر آ کر بولے'' تم کیوں نہیں دیکھتی ہو؟ سچ کہتا ہوں بڑی اچھی نقل کر رہا ہے۔''

میں بولی'' جی ہی نہیں چاہ رہا تو کیا کروں۔''

آپ بولے'' سارے گاؤں کی عورتیں تو تمھارے دروازے پر آ کر دیکھ رہی ہیں اور تمھیں اچھا ہی نہیں لگتا۔''

جب ان کی ہٹ نہیں ٹلی تو مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ رنگ سے لت پت تھے۔ بچے کا بھی چہرا ابیر سے بھرا تھا۔ میں نے کہا'' بچے کو بھی رنگ میں شرابور کر دیا۔''

آپ ہنستے ہوئے بولے۔'' ہولی کی یہی تو بہار ہے۔''

دن بھر پھر اسی طرح سلسلہ لگا رہا۔ رات کو بارہ بج گئے۔ وہ جیون کیا تھا۔ بار بار مجھے یہی سوچ آتی ہے۔ اب تو جیسے رات ہی رات ہے، جو کٹنے میں نہیں آتی۔ نہ تو وہ وقت ہی رہ گیا نہ وہ ولولے ہی۔ ہاں سکون کے وہی تجربات کچھ کچھ یاد ہیں۔ انھی کو سوچتی ہوئی دن رات کاٹ رہی ہوں۔ سکون اب کہاں واپس آئے گا۔ بس دل کی تڑپن بڑھ جاتی ہے۔ وہی تڑپن ایک اپنی مستقل چیز ہے' جس کو شاید ایشور بھی نہیں چھین سکتا۔

پریس میں ہڑتال-فروری ۱۹۳۳ء

میرے پریس میں ہڑتال ہوگئی تھی۔ آپ وہاں سے لوٹے اور سست سے بیٹھ رہے۔ انھیں اداس دیکھ کر پوچھا'' کیوں' آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

بولے'' طبیعت تو بہت اچھی ہے۔''

'' تو اداس کیوں ہیں؟''

''اس پریس کی وجہ سے مجھے بڑی پریشانی رہتی ہے۔''

''کیا ہے؟ بتاؤ نا۔'' میں نے کہا۔

''کیا بتاؤں۔ مینیجر اور مزدوروں میں پٹتی ہی نہیں۔'' وہ بولے۔

''وہ کام ٹھیک سے نہیں کرتے ہوں گے۔ مینیجر بے چارہ کیا کرے۔''

''بھائی مینیجر بھی تو اپنے کو خدا سے کم نہیں سمجھتا۔''

''خدا کیوں سمجھے گا اپنے کو'' میں نے کہا ''اگر ٹھیک سے کام نہ کرائے تو آپ بھی اسی پر بگڑیں گے۔''

''ذرا سی بات پر تو لوگوں کی غیر حاضری لگا دیتا ہے۔ پیسے کاٹتا ہے۔''

''اس میں اس کا کیا قصور ہے۔''

''نہیں سب مینیجر کی شرارت ہے۔ کبھی گھڑی کو سست کر دیتا ہے کبھی تیز کر دیتا ہے۔ میں نے بیسو ں بار اکیلے میں بھی سمجھایا کہ بابا ایسا مت کیا کرو۔ پر مانے تب نا۔ پریس میں تو طرح طرح کے گھاٹے ہیں۔ کیا انہیں مزدوروں کے بل پر گھاٹے پورے ہوں گے؟ ہم لوگوں کو تو زیادہ روپے ملتے ہیں مگر خرچ بھر کو پورے نہیں پڑتے۔ پھر غریبوں کو ان کے کم روپے کیسے پورے پڑیں گے۔ پیسوں کی مصیبت تو ان لوگوں کی جان کو ہے۔ ان (زیادہ تنخواہ پانے والوں) کی تنخواہ جب نہیں کٹتی جب وہ ہفتوں غائب رہتے ہیں۔ پھر مزدوروں کی تنخواہ کیوں چار منٹ دیر سے آنے پر کٹ جائے؟ ذرا بھی غلطی ہوئی نہیں کہ چٹ نکال کر دوسرے کو بلا لیا۔ ہمارے یہاں پڑھا لکھا سماج سب سے زیادہ خود غرض ہو گیا ہے۔''

''ایک آدمی کے پیچھے آپ سارے سماج کو بدنام کر رہے ہیں۔''

''میری بات کو درست مانو'' انھوں نے کہا۔

''تو پھر اپنے کو دوش دیجیے۔ مینیجر کو دوشی کیوں ٹھہراتے ہیں۔''

''میں تو کبھی اپنے سے چھوٹوں سے نہیں لڑتا ہوں۔ ہر جگہ یہی ظلم ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے سے چھوٹوں کو برابر کا سمجھیں تو جھگڑا ہڑتال کبھی نہ ہو۔ حرکتوں سے تو ان کی ہڑتال ہو پر بدنامی اور بار میری ہو۔ اب جب تک ہڑتال ختم نہ ہوگی تب تک سارا کام رکا رہے گا۔ میرا خیال ادھر لگا ہوا ہے کام کیا ہوگا خاک۔''

''آپ کی طرح مینیجر بھی بیٹھا رہے گا۔ یہ مزدور بھی کسی سے کم تھوڑے ہی ہیں۔''

''نہیں جی، یہ مزدوروں سے بڑھ کر ہیں۔ دیکھتا ہوں برابر نقصان ہو رہا ہے پر بولتا نہیں ہوں۔ کام لینے کے بھی ڈھنگ ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا ''تو خود آپ ہی مینیجری کریں نا۔''

''میرے کہنے کا مطلب تھوڑے ہی ہے کہ یہ لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر کام تو صحیح طرح ہونا چاہیے۔''

''میں نے کب کہا تھا کہ آپ پریس کھولیں۔ سب روپیہ لگا دیا گیا پر فائدہ نظر نہیں آتا۔ اوپر سے رات دن کی کھچ کھچ۔ ساری باہر کی آمدنی بھی اسی میں لگی جا رہی ہے۔''

''میرے نصیبے کی بات تم کیسے مٹا سکتی ہو۔ یوں تو تم ایک پائی کسی کو دینے سے رہیں، چلو اسی بہانے دس بیس کی روزی چلتی ہے۔''

میں بولی ''خوب رانتر مانتر ے ہی خوش۔ تب آپ ناحق کیوں بھونکتے ہیں۔''

وہ بولے ''میں بھونکتا تو اس لیے ہوں کہ آخر اب وہ مزدور کیسے رہیں گے۔''

میں نے کہا ''آپ سے کیا مطلب وہ رہ لیں گے۔''

''کیوں نہیں''؟ افسوس کرنے کی بات تو ہے ہی صبح سے ہڑتال کر دی ہے۔ انھی کو تھوڑے ہی تکلیف ہوگی۔ ایک ایک پیچھے دس دس آدمی ہیں۔ سب بھگتیں گے۔'' انھوں نے کہا۔

''تو کیا سب کا دکھ آپ اپنے سر منڈھ لیں گے۔؟ اگر ایسا ہی تھا تو آپ انھیں بلا کر خود سمجھا دیتے۔'' میں نے کہا۔

''ابھی ان کے سر پر بھوت سوار ہے۔ اس وقت وہ بھلا کسی کی سن سکتے ہیں؟''

میں نے کہا ''وہ خود سنبھل جائیں گے۔ آپ کے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

آپ بولے ''مجھے اس مینیجر پر غصہ آ رہا ہے۔ یہ کیوں ایسی بدی کرتا ہے۔ اگر مزدوروں سے بات کروں تو اس میں اس کی بھی تو بے عزتی ہے۔''

میں بولی ''تو اس کا کوئی علاج نکالیے۔''

آپ بولے ''کیا کروں!''

میں نے کہا ''پہلے ہاتھ منہ دھوئیے' پانی پیجئے۔''

بولے ''ارے میں تو آج (بازار سے) کچھ لایا بھی نہیں۔ جھولا بھی پریس میں بھول آیا۔''

''سب کچھ گھر میں ہے'' میں نے کہا۔

آپ بولے ''میں ٹہلتا ٹہلتا چلا جاؤں۔ سامان لے آؤں' گھومنا بھی ہو جائے گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔'' میں نے کہا۔

پہلے میں جن کاموں پر نکتہ چینی کرتی تھی انھی کاموں سے مجھے اب عشق ہو گیا ہے۔ وہ بہت بڑے دل کے انسان تھے۔ یہاں تک کہ ان مزدوروں کو بھی وہ اپنے برابر کا ہی سمجھتے تھے۔ سب کی تکلیفوں کا انھیں خیال رہتا تھا۔ وہ اکثر اپنے کو مزدور کہتے تھے۔ انسان اور حیوان میں اتنا ہی فرق ہے۔ میں ان کی باتوں کا مقصد اب سمجھ پا رہی ہوں۔ جیسی حالت زمانے کی ہونے والی تھی سب آپ نے سمجھ لی تھی۔ کیا یہ میرے لیے کم دردکی بات ہے۔ میرے دل میں بار بار یہی بات آتی ہے کہ وہ کوئی سنت (ولی) تھے۔

۱۹۳۲ء

جیٹھ کا مہینہ تھا۔ گرمی زوروں سے پڑ رہی تھی۔ اس سال گرمی شاید اور سالوں سے تیز تھی۔ میں گرمی سے بے چین ہو کر رومال کو پانی سے گیلا کر کے سر پر لپیٹے لیٹی تھی۔ آپ باہر سے آئے۔ مجھے لیٹے دیکھ کر بولے ''کیسی طبیعت ہے؟''

میں بولی ''طبیعت کو تو خیر کچھ نہیں ہوا البتہ گرمی بہت تیز ہے۔''

آپ بولے ''ہاں گرمی زیادہ پڑ رہی ہے۔ میں تم سے کہتا تو ہوں اگر پہاڑ پر جاؤ تو میں انتظام کر دوں۔ دو مہینے رہ کر چلی آنا۔''

میں نے پوچھا ''آپ چلیں گے؟''

''میں کیسے چل سکتا ہوں۔ میرے چلنے سے تو آمدنی کی راہ بند ہو جائے گی۔''

''آپ وہاں بھی اسی طرح کام کیجیے گا'' میں نے کہا ''کام میں کوئی فرق نہیں پڑے گا' بلکہ شاید وہاں آپ زیادہ ہی کام کر سکیں۔ آپ چلیں تو میں چلوں۔''

آپ بولے'' کام کے لیے پوچھتا کون ہے۔ کام کرنے کے لیے کام بھی تو ہونا چاہیے۔ بچوں کو لے کر تم جا سکتی ہو۔''

میں بولی'' کیا سب سے زیادہ رئیسی میرے لیے ہی ہے۔ یہ سب امیروں کے نخرے ہیں۔ غریبوں کا شملہ اور منسوری اپنا ٹھنڈا گھر ہی ہے۔''

آپ بولے'' تم تو ایک ضد پکڑ لیتی ہو۔''

میں بولی'' یہاں تو دو ہی آدمی ہیں۔ میں اور آپ۔ اس میں کون فیصلہ کرے کہ کون ضد کرتا ہے، میں یا آپ؟''

'' تم میرا کہنا مان جاؤ۔'' وہ بولے۔

'' میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

'' تو پھر تولیہ اور رومال بھگو بھگو کر سر پر رکھتی رہو۔'' انھوں نے کہا۔

میں نے کہا'' مجھ جیسوں کی تعداد بڑی ہے۔ آپ کہتے کیا ہیں، میں اپنا شمار ان میں کیوں کروں جو تھوڑے سے ہیں۔''

کیا وہ ایک اعلیٰ ہستی نہیں تھے؟ خود تپ کر دوسروں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے ان کی سعی کا حال آپ نے پڑھ ہی لیا۔ انھوں نے فرض اور صورت حال کے سامنے ہمیشہ سر جھکایا پھر بھی ان باتوں پر شکایت کا ایک حرف کبھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔ نہ ہی چہرے پر کبھی شکن آئی۔

بلکہ سینہ کھول کر اور بانہیں پھیلا کر انھوں نے ان مشکلوں پر فتح پانے کی کوشش کی۔ کیا یہ ایک مہاتما کے اوصاف نہیں ہیں؟

۱۹۳۳ء

دلی میں ساہتیہ سبھا کی میٹنگ تھی۔ اس میں شرکت کے لیے آپ جانے والے تھے۔ شام کو چار بجے پریس سے آئے اور بولے'' سنو! آج ہی پانچ بجے شام کی ٹرین سے دلی جانا ہے۔ میرا بستر بندھوا کر رکھ دینا۔''

میں بولی'' ایسی جلدی کیا پڑ گئی۔ ادھر بیٹی جانے والی ہے۔''

'' ابھی تو وہ ٹھہرے گی۔'' آپ نے کہا۔

میں بولی ''تو بتایئے کیا کام ہے''؟

بولے'' جینیدر کا خط آیا ہے۔''

آپ کب تک لوٹیں گے۔'' میں نے پوچھا۔

'' تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے'' انھوں نے کہا'' پھر میں پہلی ہی بار تو دلی جا رہا ہوں۔''

'' اگر آپ نہ جائیں تو کیا حرج ہے؟''

بولے'' نہیں جینیدر کو بڑا دکھ ہوگا۔''

میں نے ان کے جانے کی تیاری کردی۔ آپ گئے۔ تین چار دن کے لیے کہہ کر گئے تھے پر لوٹے ساتویں دن۔ میں پریشان تھی کیونکہ کہیں رکنے کا ان کا طریق ہی نہیں تھا۔ بار بار مجھے یہی خیال ہوتا تھا کہ وہ بیمار تو نہیں پڑ گئے۔ میں نے پریس کے منیجر کو بلا کر کہا کہ تار دے دو۔

منیجر بولا'' آپ گھبراتی کیوں ہیں' کل آجائیں گے۔''

میں نے سوچا پہلی بار گئے ہیں۔ دیر ہوگئی ہوگی۔ تار میں نے نہیں دلایا مگر میری فکر بڑھتی ہی جارہی تھی۔

آپ جب ساتویں دن آئے تو میں غصے میں بولی'' آپ کو کچھ بھی خیال نہیں رہتا۔ آپ یہ سوچنے کی تکلیف کیوں نہیں کرتے کہ آخر گھر والے کیا کہتے ہوں گے۔ چار دن کے لیے گئے' لوٹے اتنے دنوں بعد۔''

آپ بولے'' پہلے بیٹھ کر میری رام کہانی تو سن لو تب تمھیں اندازہ ہوگا کہ میں وعدے کے مطابق کیوں نہیں گھر پہنچا۔ اور اگر تم میری جگہ پر ہوتیں تو تم بھی وہی کرتیں جو میں نے کیا۔''

میں نے کہا'' رات دن آپ کہانیاں لکھتے ہیں' ایک اور سہی۔''

اس پر آپ نے کہا'' تمھارا خیال غلط ہے۔ کیا مجھے تمھارا خیال نہیں رہتا؟''

'' یہ تو دیکھ ہی رہی ہوں'' میں نے کہا۔

آپ نے ہنس کر جواب دیا۔'' پہلے میری بات سنو پھر کچھ کہنا۔''

'' سناؤ۔'' میں نے کہا۔

میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھاتے ہوئے بولے ''میں یہاں سے چل کر آرام سے جینیدر کے مکان پر پہنچا۔ میرے پہنچنے سے پہلے پنڈت سندر لال جی بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ جس دن میں پہنچا اسی دن شام کو وہاں میٹنگ تھی۔ تین دن تک اسی میں لگا رہا۔ ایک پنجابی صاحب کا اصرار ہوا کہ آپ میرے یہاں چلیں۔ مجھ ہی سے ملنے وہ دو بار لکھنؤ آئے تھے۔ اور ایک بار بنارس بھی۔ وہاں بے چارے میرے لیے بیتاب تھے اور جب میں مل گیا تو پھر لگے مجھے اپنے یہاں ٹھہرانے۔ میں جتنا بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا گیا اتنا ہی ان کے ہاتھوں پھنستا گیا۔ وہ ایک اکیلے ہی نہیں مجھ سے ملنا چاہتے تھے ان کی بیوی بھی ملنے کے لیے بے تاب تھیں۔ میں نے بہت چاہا کے بھاگ چھوٹوں پر بھاگنا مشکل ہو گیا۔ آخر کو میں ان کے یہاں چلنے کو راضی ہو گیا۔ اس بے چاری کو کیسے مایوس کرتا۔ میں ان کی وجہ سے رک گیا۔ اتنا سننے کے بعد تم جو چاہو سزا دے لو۔ مجرم تمھارے سامنے ہے۔''

میں نے پوچھا ''ان کا کیا نام تھا؟''

آپ نے کہا ''کیا بتاؤں میں تو پہلی ہی بار ان سے ملا ہوں۔ ان کا کہنا تھا کہ میری 'منتر' نام کی کہانی پڑھ کر انھیں اپنے کام میں جی جان سے لگنے کی تحریک ہوئی۔ تب ہی سے وہ مجھے ڈھونڈھ رہے تھے۔ جب مل گیا تو کیسے چھوڑتے؟ میری ہی خاطر انھوں نے ساری میٹنگ کی دعوت کی۔''

میں بولی ''تو پھر آپ کے تو مزے تھے، میں البتہ یہاں پریشان تھی۔ میں سوچتی تھی کہ آپ بیمار ہو گئے۔ پرسوں میں تو تار دینے کو تھی۔ منیجر کچھ ہچکچایا۔ بس میں بھی رہ گئی۔ ایک ڈیڑھ روپے بھی جاتے اور بے وقوف بھی بنتی۔''

آپ بولے ''میں خود سوچ رہا تھا کہ تم پریشان ہو گی۔ اب تم ہی بتاؤ اس میں میرا کیا قصور تھا''

میرا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ بولی۔ ''ٹھیک ہے آپ کا کیا قصور تھا۔''

''سچ کہتا ہوں وہ جیسے میرے لیے پاگل ہو رہے تھے۔ میرے پاس آنے کی انھیں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میٹنگ میں کسی طرح ایک منٹ مانگ کر اس بھلے آدمی نے اپنی بات کہی اور اس کا فیصلہ سب پر چھوڑ دیا۔ میں بے بس ہو گیا۔ کیا کرتا۔ میری رکنے کی ذرا بھی خواہش نہیں تھی۔ مگر اس کے پریم کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو اس کی کھاٹ پر پڑی ہوئی بیوی کو بھی دکھ ہوتا۔''

میں بولی ''ادیبوں کی بیویوں پر سب سے زیادہ آفت آتی ہے۔ ان کے گھر کے مرد بھی پورے کے پورے ان کے نہیں ہوتے۔ یہی آفت ہمیشہ لگی رہتی ہے۔''

''میں نے ساری بات تمھیں بتا دی۔ مجھے تو خود اپنا کام کرنے میں بڑا لطف آتا ہے'' آپ بولے۔

''آئندہ ایسی دیر مت کرنا۔'' میں بولی۔

''نہیں ہوگی'' آپ بولے ''اچھا تو تب ہو کہ تم ساتھ چلا کرو نہ گھر رہوگی' نہ پریشان ہوگی نہ مجھے تمھاری فکر ہوگی نہ تمھیں میری۔''

''اور بچے کہاں رہیں گے؟'' میں نے کہا۔

''تم نئی نئی پابندیاں لگاتی رہوگی تو کیسے سکون پاؤ گی'' وہ بولے ''میں ہر طرح پریشان رہتی ہوں۔''

ایک دن وہ بھی تھے جب میرے پتی دیو میرے سامنے مجرم بنے کھڑے تھے اس لیے کہ وہ محض سات دن ہم سے جدا رہے تھے۔ ان دنوں میں بھی روٹھ کر بیٹھ جاتی تھی کہ مجھ سے دور یہ رہے کیسے۔ پریشانی بھی ہوتی تھی۔ میں دن رات اسی سوچ میں پڑی رہتی تھی کہ وہ کیسے ہوں گے۔ اور اب؟ اب نہ کبھی گھبراتی ہوں' نہ کوئی فکر لاحق ہوتی ہے۔ نہ تار دلواتی ہوں نہ اپنی خبر ہی پہنچواتی ہوں۔ اور نہ ہی انھیں میری طرف سے کوئی فکر ہوگی۔ وہ تو پریم کے آگے سر جھکاتے تھے۔ پریم نباہنا بھی انھیں آتا تھا۔ پھر مجھ سے انھوں نے منھ کیوں موڑ لیا۔ میں یقیناً اندھی تھی اور ساتھ ہی میں پاگل بھی کیونکہ ان کو پہچان نہ پائی۔ اس بات میں ضرور کوئی نہ کوئی سچائی چھپی ہے۔ شاید ایشور بھی اپنے اصلی روپ میں بھگتوں سے نہیں ملتا۔ تب ہی تو وہ سب کے تھے۔ اب تو وہ کسی کے بھی نہیں رہے۔ انھی خیالوں میں تو رات دن ڈوبتی ابھرتی رہتی ہوں۔ مگر مجھے سکون نہیں ملتا۔ جب تک زندہ رہوں گی میری زندگی خالی ہی رہے گی۔ میری یہی کیفیت ہے اب۔

بنارس مئی ۱۹۳۳ء

پیاری رانی'

تمھارا خط ملا۔ آج ہی دیننھو لال کا بھی خط ملا ہے۔ میں نے بٹی کو بلانے کے لیے پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر لکھ رہا ہوں۔ اگر تم بٹی کو لا سکتی ہو تو لا دو مگر یہ اچھی طرح سے سمجھ لو وہ بیمار ہے۔ اتنا لمبا سفر' جگہ جگہ چڑھنا اترنا اس کا انتظام کیسے کروگی؟ اور ہاں تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ بنارس آکر بٹی کی ساری بیماری دور ہو جائے گی! بنارس تو علاج معالجے کے لیے کوئی مشہور جگہ نہیں ہے۔ یہاں دو چار ہومیو پیتھ ڈاکٹر ضرور ہیں مگر اس طرح کے ڈاکٹر تو ساگر میں بھی کتنے ہی ہوں گے۔ اگر لکھنؤ لے جا کر علاج کرانے کا ارادہ ہو تو ٹھیک ہے۔ لیکن سفر کی بات ہے اگر راستے میں بٹی کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو کیا کروگی' اس حالت میں کتنی شرمندگی اٹھانی پڑے گی اور کتنا دکھ ہوگا۔ اس

لیے میرے خیال میں تو جو علاج ہو رہا ہے وہ ہونے دو۔ اچھا علاج کاشی میں بھی نہیں ہو سکے گا اس لیے یہی ضروری ہے کہ وہ ساگر ہی میں رہے۔ یہ سمجھ لو کہ وضعِ حمل تپ دق کا بخار ہے مشکل سے جائے گا۔ یہاں کوئی دوسرا ایشور تو ہے نہیں۔ جب ہم مجبور ہو جاتے ہیں تو سب کچھ قسمت پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں گرمی بے حد ہے یہاں کی آب و ہوا سے میرے خیال میں ساگر کی آب و ہوا بہتر ہے۔ گھبرانے سے کام نہیں چلے گا۔ قسمت پر سب چھوڑ دو۔ ایسی حالت میں کہ بیماری جیوں کی تیوں ہے، بڑھی نہیں ہے اس کے ٹھیک ہو جانے کی کافی امید ہے۔ پھر ان لوگوں کو اس کے یہاں لانے سے دکھ بھی تو ہوگا خاص طور سے جب کہ اس کی بیماری کم ہو رہی ہے۔

اچھا اب یہاں کا حال سنو۔ رام کشور آئے اور دلہن کو لے گئے۔ وجہ یہ کہ دلہن کو یہاں چکر آنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ شیلا بھی چلی گئی۔ گھر میں اس وقت ہم تین آدمی ہیں۔ مجھے دست آ رہے ہیں۔ میں دہی چاول کھا کر گزارہ کر رہا ہوں۔ دھنو کبھی اپنے لوگوں کے لیے کھچڑی پکا لیتا ہے۔ کبھی روٹی۔ بہن سسرال گئی ہیں، چھوٹی بھابھی اپنے میکے۔ مہراجن ابھی تک کوئی ملی نہیں۔ چھونک کے بال بچے آئے تھے۔ مگر ایک گھنٹہ رہنے کے بعد وہ بھی چلے گئے۔ آگے کو ان سے کیا امید ہو سکتی ہے۔ وہ دکھ میں ساتھ دینے والے نہیں ہیں۔ آج کل دھنو کا کان خراب ہو رہا ہے۔ وہ روزانہ ڈاکٹر کے یہاں دوا لینے جاتا ہے۔

سب سے میرے مناسبات کہنا۔ باقی سب ٹھیک ہے،

تمھارا دھنپت رائے

شاردا ایکٹ

عورتوں کے بارے میں ان کے خیالات کیا تھے اس کا اندازہ تو پڑھنے والوں کو ان واقعات سے ہو گیا ہو گا جن کا ذکر میں اوپر کر آئی ہوں۔

آج سے سات آٹھ برس پہلے آپ نے 'جاگرن' میں ایک مضمون کے ذریعے ہر ولاس شاردا کے مساوی حقوق کے ریزولیوشن پر مبارک باد دی تھی۔ اور لکھا تھا' میں آپ کو دل سے بدھائی دیتا ہوں۔ عورتیں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہیں گی کیونکہ عورت اور مرد دونوں مل کر جس مال منال کو جمع کرتے ہیں شوہر کے مر جانے کے بعد انھی کے گود کے بچے اسے ان سے چھپاتے ہیں۔ آپ کا یہ ریزولیوشن جس دن پاس ہوگا کروڑوں عورتیں آپ کو دل سے مبارک باد دیں گی اور ہمیشہ آپ کی احسان مند رہیں گی۔ انھیں کے ساتھ میں بھی آپ کا احسان مند ہوں۔ کیا ہندو قانون میں

عورتیں بے کار چیز سمجھی گئی ہیں جو انھیں کوڑا کرکٹ کی طرح نکال باہر کیا جاتا ہے۔ بھگوان جانے یہ قانون کیوں اور کن کے لیے بنا تھا۔ مجھے تو امید ہے کوئی بھی صاحب فکر اس ریزو یویشن سے اتفاق نہ کرنے کا اظہار نہیں کرے گا۔

میں نے بھی اس مضمون کو پڑھا اور انھیں مبارک باد دی۔

آپ بولے ''مجھے مبارک باد کیوں دے رہی ہو مبارک باد تو ہرولاس جی کو ملنی چاہیے۔''

''آپ نے تائید کی اس لیے مبارک باد دے رہی ہوں۔''

جب سب گھر والے کھانا کھا کر سو گئے تب ''جاگرن'' میں میں نے جو پڑھا تھا اسی پر باتیں کرنے لگی۔''

میں بولی۔'' آپ نے تو شاردا صاحب کی خوب تعریف کی ہے۔''

بولے ''نہیں تو۔ عورتوں کے لیے ان کی جدو جہد پر مجھے خوشی ہے' اس کا اظہار کر دیا۔ تم ہی بتاؤ دیویوں پر کسی لیڈر یا عالم کو رحم آیا۔''

میں بولی ''منو نے لکھا ہے۔

آپ نے کہا ''تب کے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ آج کا قانون آج کے لیے لاگو ہے۔ پر گورنمنٹ تو نہیں چاہتی۔''

میں بولی۔'' تب تو قانون بنانے سے بھی کوئی نہیں مانے گا۔''

آپ بولے'' تم غلط کہہ رہی ہو۔ قانون کا ڈنڈا بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے سامنے سب ہی سر جھکا دیتے ہیں۔ ایسے میں ماننے نہ ماننے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ آج اگر یہ قانون پاس ہو گیا تو بڑا ہی فائدہ مند ہوگا۔ جو چیز دھرم پر چھوڑی جاتی ہے اسے مردہ سمجھو۔ اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔''

میں نے کہا'' دنیا میں کیا سب بیٹے نالائق ہوتے ہیں۔''

''نالائقوں کو درست کرنے کے لیے ہی تو ایسا چاہیے۔ پھر دیکھو ابھی جھگڑا ہے۔ ان پوپ پنتھیوں کے مارے پاس ہو جائے تب نا''۔ (پوپ کے منعقدوں کے مارے)

میں بولی'' آپ تو اسے پاس کر ہی چکے ہیں۔''

آپ بولے ''سب سے زیادہ تو تم لوگوں کو مبارک باد دینا چاہیے تھی۔''

میں نے کہا ''منو کے قانون کو لکھنے والے نے تو پہلے ہی لکھ دیا ہے۔''

''وہ بہت پرانی بات ہوگئی۔ اسے دھرم گرنتھ مانیں گے پر لوگ اس پر عمل نہیں کریں گے'' وہ بولے۔

''لیکن کیا سب ہی بچے ایسے ہوتے ہیں جو ایسا برتاؤ کرتے ہیں؟'' میں بولی۔

''اگر سب ایسا کریں تو کیا کرو گی؟''

''تمھارے پتا جی کیا چھوڑ گئے تھے؟ اور ماں بھی سگی نہیں سوتیلی تھیں۔ پھر بھی وہ کیسی حکومت کرتی تھیں کیا آپ بھول گئے؟''

آپ بولے ''میری بات چھوڑو۔ تم اپنے بچوں کو دیکھو۔ گو تمھاری حکومت انھی بچوں کی بھلائی کے لیے ہوتی ہے پھر بھی وہ تمھاری باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ مجھے ان پر غصہ آتا ہے۔ میں نے کتنی ہی بار کہا ہے کہ جب وہ تمھارا کہنا نہیں مانتے تو کیوں ان پر حکم چلاتی ہو۔ ان کو معلوم ہے کہ وہ کتنے پیار سے رکھے جاتے ہیں۔ اگر ماؤں کو ایسے ہی بیٹوں کا سہارا ہے تو بری بات ہوگی یا نہیں؟ تم کو یاد ہوگا میں نے ایک کہانی لکھی تھی جس کا عنوان تھا 'بیٹوں والی بیوہ' وہ کہانی فرضی نہیں تھی' سچی واردات پر مبنی تھی۔ تم اسے ذرا پڑھنا۔ ہوسکتا ہے پہلے ہی پڑھ رکھی ہو۔''

میں جھینپتی ہوئی بولی ''بھاڑ میں جائے' جو ہونا ہوگا' ہوگا۔ میں بچوں سے تھوڑی بیاہی گئی ہوں۔ تم بھی تو یہی کہتے ہو کہ میں تم سے بیاھی گئی ہوں بچوں سے نہیں۔''

آپ نے ہنس کر کہا ''اب کچھ فیس دو۔ تمھیں میں نے کتنی باتیں بتائیں۔ دو بیڑے پان تو دو''۔

یہ باتیں کرتے کرتے بارہ بج گئے تھے۔ آپ بولے ''سو جاؤ۔''

آج میں ان باتوں کو سوچتی ہوں تو کلیجہ بیٹھ جاتا ہے۔ ان کے نہ رہنے سے مجھ سے زیادہ دیش کا نقصان ہوا ہے۔ بدقسمتی سے ایسے مردوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے عورتوں کی ترقی کے کام میں حصہ لیا ہو۔ وہ اکیلے میرے ہی نہیں تھے۔ ہاں میں خوش نصیب ضرور تھی کہ اتنا بڑا انسان میرا ہو کر رہتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں ان کی زندگی میں انھیں پورے طور سے نہیں پہچان پائی۔ میں نے انھیں پتی کے روپ میں پایا تھا' میرے وہ تھے بھی اسی روپ میں سب کچھ۔ پھر میں انھیں عقیدت کی چیز کیونکر تسلیم کرسکتی تھی۔ ان سے میرا رشتہ بہت ہی قریب کا تھا شاید اسی لیے میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی اور میں انھیں پہچان نہیں پائی۔

ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے۔عقیدت اور محبت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔" عقیدت انسان کا سر جھکاتی ہے اور محبت' دل۔شاید یہی وجہ ہے کہ دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔میں اگر ان سے عقیدت رکھتی ہوتی تو پان پھول لے کر دوڑتی' وہ میرے لیے مٹھائی پان لانے کے لیے بازار نہ دوڑے جاتے۔سوتے وقت مجھے اٹھا کر پانی پینے کے لیے گلاس نہ دیتے۔اور جب میں سو نہ سکتی تو مجھے پنکھا نہ جھلتے۔میری چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کو وہ دوڑ دوڑ کر پورا نہ کرتے۔نہ مجھے سلانے کی کوشش نہ کرتے۔محبت تو جہاں یہ سب کچھ نہ ہو' وہاں سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ان دونوں حالتوں کا میل ہی نہیں ہوتا۔ہاں' آج جب وہ میرے نہیں رہے تو میری عقیدت کی چیز بن گئے ہیں۔میرے ہاتھ اب رہ ہی کیا گیا ہے۔

جس قانون پر ہماری اتنی بحث ہوئی تھی وہ ان کے مرنے کے چار مہینے بعد پاس ہوا۔وہ ایسی منحوس گھڑی میں پیش ہوا تھا کہ ان کی زندگی میں پاس ہی نہ ہو سکا۔وہ اسے پاس ہوا دیکھ کر کتنے خوش ہوتے بس ایشور ہی جانتا ہے۔میں الجھن میں گرفتار بیٹھی انھی باتوں کو سوچتی رہتی ہوں۔گزرا ہوا سکھ جیسے سپنے دیکھا ہو۔یہی سوچتے سوچتے ایک درد ہوا اٹھتا ہے اور اسی میں تھوڑی دیر کے لیے خود کو بھول جاتی ہوں۔وہ جہاں بھی ہوں گے ان کی آتما شانت ہوگی۔مگر مجھے تو وہ بے چینی ہی بخش گئے۔اپنے کو اس جیون میں پرسکون سمجھوں؟ یہاں تو بس ہاتھ ملنا ہے۔اور یہ بھی جانتی ہوں ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

بنارس یونی ورسٹی میں جلسہ

۱۹۳۳ کا واقعہ ہے۔یونی ورسٹی میں جلسہ تھا۔دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ایک نشست کہانی کی بھی تھی۔اور اس کے صدر آپ تھے۔مارچ کا مہینہ تھا۔میں گھر میں اکیلی تھی۔آپ وہاں جانے کے لیے تیار ہوئے تو بولے" تم بھی چلی چلو۔یوں بھی اکیلی ہو۔تمھارا چلنا ضروری ہے۔"

پہلی میٹنگ گیارہ بجے سے تھی۔اس کے صدر مال وجے تھے۔دوسری میٹنگ ڈھائی بجے سے شروع ہوئی اور اس کے لیے ڈیڑھ گھنٹے کے قریب ہمیں وہاں رکنا پڑا۔

آپ بولے" اتنی دیر میں تو مولوی مہیش پرساد جی سے ملا جا سکتا ہے۔یہاں تو اتنی دیر منحوسیت چھائی رہے گی"میں راضی ہوگئی۔ہم دونوں وہاں ساتھ ساتھ گئے۔اتفاق سے وہ اپنی پتنی کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

میں بولی۔" یہاں سے بھی لوٹنا پڑا۔"

یونی ورسٹی ہوسٹل کی بغل میں ایک نہر کھدر ہی تھی۔ وہیں قریب میں ایک درخت تھا۔ اس کے نیچے ہم دونوں بیٹھ گئے۔ پہلی میٹنگ میں انھیں پھولوں کا ایک ہار دیا گیا تھا۔ اس ہار کو مجھے پہناتے ہوئے بولے ''لو تمھاری ہماری یہ خوشی کی شادی رہی''

میں بولی ''ابھی تک آپ کنوارے تھے؟''

آپ بولے ''دیکھنے والے کیا سوچ رہے ہوں گے اس پر تم نے غور کیا؟''

میں بولی ''لوگ سمجھ رہے ہوں گے گنگا اشنان کر کے دونوں لوٹے ہیں اور اب یہاں بیٹھ کر تھکن دور کرنا چاہتے ہیں۔''

آپ ہنس کر بولے ''گنگا نہانے والوں میں نہ میں شامل کیا جا سکتا ہوں' نہ تم۔ دیکھنے والے بے وقوف نہیں ہوتے۔ جو میں نے کہا وہی سمجھیں گے''۔

ہم دونوں نہر کے پاس گھومنے لگے۔ وہاں کئی جگہ ہم نے دیکھا نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کرتے ادھر ادھر چہل قدمی کرر ہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر یہ لگتا تھا جیسا انگریزوں کے یہاں سننے میں آتا ہے۔ یہاں کا بھی ویسا ہی ماحول ہے۔ آپ کے چہرے پر تو جیسے خوشی تھی ہی نہیں۔ ان کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے فکر ہوگئی۔

آپ بولے ''یہ غلام دیش کب سدھرے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں نقل کرنے کی عادت یہاں تک ہوگئی ہے کہ یہ دوسروں کی نقل کرنے ہی میں خود کو عالم اور دانش مند سمجھتے ہیں۔ اور وہ بھی پوری نقل نہیں' ادھوری۔ خرابیوں کی نقل تو یہ جھٹ پٹ کر لیتے ہیں۔ اچھائیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ان میں نری برائیاں ہی ہوں یہ بات نہیں ہے انگریز گرمی میں پنکھے کے نیچے دن کاٹ دیتا ہے وہی' اس وقت بھی جب باہر آگ برس رہی ہو' میلوں جوش میں دوڑ سکتا ہے۔ خطرے میں بھی اسے راحت ملتی ہے اور یہ چیز ان کی حکومت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس سے تو ہم کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم محکوم ہیں''

میں بولی ''اس وقت آپ کی نکتہ چینی کا کچھ فائدہ ہے؟''

آپ بولے ''ایسے غلام دیش کو عیاشی کا کیا حق ہے؟''

میں بولی ''انگریزوں کی طرح رہیں گے تبھی تو آزاد ہوں گے۔''

آپ بولے ''عیاشی آزادی کی دشمن ہے۔''

میں نے کہا ''آخر انگریز بھی آرام پسند ہوتے ہیں' وہ کیوں نہیں غلام ہو جاتے؟''

''وہ آزاد ہونے کے بعد زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ آزاد اور سکھی ہونے سے پہلے تو جانوروں سے بھی زیادہ مشقت کرتے تھے۔ انھیں پتہ بھی نہیں تھا کہ تھکاوٹ' آرام اور عیاشی بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ تمھارے یہاں بھی عیش کوشی سے کبھی آزادی نہیں آئے گی۔ آزادی تو ملتی ہے ریاضت' عیش کو تجنے اور قربانیوں سے۔ تمھارے یہاں تو اس کا الٹ ہو رہا ہے۔ اور یہ جو ہو رہا ہے تمھیں دن رات غلامی کی طرف لیے جا رہا ہے۔''

میں نے کہا'' یہ سب عادتیں بچپن میں نہیں پیدا ہوتیں۔ ان لوگوں کے حوصلے اسی عمر میں بڑھتے ہیں۔''

''انھیں تم بچہ سمجھتی ہو'' وہ بولے'' آج کے دور میں عمریں ہی کتنی ہوتی ہیں۔ کیا انھیں نہیں معلوم بہت سے لوگ روٹیوں کے بھی پیسے بچا کر انھیں تعلیم دلا رہے ہیں۔ ان سبوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے راج کمار اور راج کماریاں ٹہلنے نکلے ہوں۔ لڑکیوں کو تو دیکھو تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی ہیں۔ یہاں کی اپنی عادتوں کے سانچے میں گھر بھر کو ڈھالنے کی کوشش کریں گی۔ یہ یہاں سیکھیں گی تو کیا رہی سہی ماں باپ کی خوبیوں کو بھی کھو کر جائیں گی۔ اب شادی پر ان کو دینے کے لیے ماں باپ کو زیادہ سے زیادہ رقم چاہیے ہوگی کیونکہ دوسرے کے گھر جب اڑانے کے لیے انھیں کافی دولت نہیں ملے گی ان کا جیون دوبھر ہو جائے گا۔''

میں نے پوچھا'' یہ گریجویٹ ہو جانے کے بعد کیا کچھ بھی نہیں کما سکیں گی' اور کیا یہ بنا شادی کے نہیں رہ سکیں؟''

آپ بولے'' جب یہ دوسروں کے پیسے پانی کی طرح بہا رہی ہیں تو اپنی کمائی کا حصہ کسی کے لیے کیوں چھوڑنے لگیں۔''

میں نے کہا'' آپ کو سدرشن جی کی وہ کہانی یاد ہی ہوگی جس میں ایک لڑکے' کا کردار پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ وہ لڑکا جو پیسے مانگ کر لیتا فوراً خرچ کر ڈالتا تھا۔ اس کے باپ اس کی فضول خرچی پر دن رات فکر مند رہنے لگے۔ پھر انھیں ایک ترکیب سوجھی۔ بولے'' بیٹا اب تم بھی کچھ کماؤ۔ دوسرے کی کمائی پر کہاں تک موج کرو گے' لڑکا ان کے کہنے پر تین چار بار اپنی ماں سے مانگ کر پیسے لایا اور باپ کو دکھائے۔ وہ بولے'' کنویں میں ڈال آ'' اس نے دو تین بار ایسا ہی کیا۔ باپ کو جب ماں کے پیسے دینے کا معلوم ہوا تو انھوں نے اُسے پیسے دینے سے سختی سے منع کیا اور لڑکے سے بولے'' تم خود باہر سے کما کر لاؤ'' لڑکے نے دن بھر مزدوری کر کے دو آنے پیسے کمائے اور لا کر باپ کے حوالے کیے۔ باپ نے کہا'' کنویں میں ڈال آؤ۔ میں ان کا کیا کروں' لڑکے نے کہا' جان کھپا کر تو میں نے

یہ پیسے کمائے اور جھٹ کنویں میں ڈال آؤں۔ آپ نے بھی خوب کہی۔ باپ نے لڑکے کو چھاتی سے لگا کر چومتے ہوئے کہا اب تم راستے پر آئے۔ تم اپنی مزدوری کی قیمت سمجھ گئے۔ تو کیا جب ان لڑکے لڑکیوں پر بوجھ پڑے گا تو یہ چوکنے نہ ہو جائیں گے؟''

آپ بولے'' یہ جوانی کی گندی عادت ہے وہ لڑکپن کی تھی۔ یہ تو آدمی کو کہیں کا بھی نہیں رہنے دیتی۔ ایک بات ہے' تم نے اس کے بارے میں کبھی سوچا کہ ڈاکٹر کے پاس دوا کے لیے بیمار جاتے ہیں۔ ان میں کوئی جیتا ہے' کوئی مرتا ہے۔ مرے ہوئے بیمار اپنا تجربہ دنیا کو بتا نہیں سکتے۔ جو بیمار صحت یاب ہو جاتے ہیں وہ چاہے اس کے علاج سے نہ بھی اچھے ہوئے ہوں لیکن وہ سب کے سامنے اسی کا گن گاتے ہیں۔ اسی طرح ان میں سے دو چار اچھے ہوں گے پر سب نہیں۔ آج سماج دو حصّوں میں بٹا ہے۔ ایک وہ ہیں جنھیں بچپن سے ہی ہر وقت اپنے کام کی دھن رہتی ہے۔ وہ پڑھتے بھی ہیں تو وطن کی حالت ان کی آنکھوں میں پھرتی ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو عیاشی کے گڑھے میں اس طرح ڈوبے رہتے ہیں کہ بعد میں انھیں خود اپنا سنبھالنا ہی دشوار ہوتا ہے۔ وہ دوسرے کو کیا سنبھالیں گے' خود نہیں سنبھل سکتے۔''

میں نے کہا'' اس کا کیا مطلب؟ کیا دنیا کے سبھی آدمی ہمیشہ سادھو بنے رہیں''؟

انھوں نے کہا'' کچھ دن بعد تو انہیں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی۔ یہ سرپھرے تب بھی آفت مچائے رکھیں گے۔''

میں بولی'' تو پھر کیا کیا جائے؟ اچھے آدمی تو دنیا میں گنے چُنے ہوتے ہیں۔ پھر آپ کیوں اتنے ملول ہو گئے؟''

آپ نے کہا'' غصہ کیوں نہ آئے۔ یہ آخر غریبوں ہی کے سر پر تو منڈلائیں گے۔''

میں بولی'' تو غریب کیوں نہیں پرکھ لیتے؟''

آپ بولے' وہ سیدھے ہوتے ہیں' کام کر سکتے ہیں کام کی قیمت نہیں جانتے۔''

اس پر میں نے کہا'' تو پھر کیسے بالآخر ان کے چنگل میں نہ پھنسیں۔ ایک بات اور بھی ہے آدمی خود اپنا مددگار ہے۔ وہ اگر خود اپنی مدد نہیں کر سکتا تو خدا بھی اُس کی مدد نہیں کرتا۔''

بولے'' ایسا ہوتا تو رونا ہی کیوں پڑتا۔ اسی وجہ سے لوگ تکلیفیں جھیل رہے ہیں۔ یہاں تو ایک بڑے بھاری ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے۔''

'' برٹش گورنمنٹ سے بڑا ڈکٹیٹر کون ہوگا'' میں نے کہا۔

''تم نہیں جانتیں۔ یہاں تو ترکوں کے کمال پاشا کی طرح کا آدمی چاہیے۔ جب تک یہاں کوئی ویسا آدمی پیدا نہیں ہوگا تب تک تو مجھے یہاں معاملہ صفر ہی نظر آتا ہے۔ یہاں زبردستی ہی کچھ کرایا جا سکتا ہے رضامندی سے نہیں۔''

''پھر آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں' قاضی پریشان شہر کی فکر میں۔ کہاں تو مزے دار باتیں ہو رہی تھیں کہاں یہ آفت ٹپک پڑی۔ اور پھر آپ اپنا کام تو کرتے ہی ہیں۔ دنیا نہیں کرتی ہے' نہ کرے۔''

آپ بولے ''میرے اندر جتنی تڑپن پیدا ہوگی اتنا ہی اچھا ہے۔''

میں نے کہا'' آپ کو اس سے طاقت ملتی ہے اور آپ کے وسیلے سے لوگوں کو۔ پر مجھے کیا ملتا ہے۔''

کئی کہانیاں پڑھی گئیں۔ آپ کا بھی لیکچر ہوا۔ اس لیکچر میں اسی جگہ کی حالت پر انھوں نے بہت کچھ کہا۔ وہ پھنکار لوگوں کا خوشی کو تو بڑھاتی جا رہی تھی لیکن مجھے ایسا لگا جیسے یہ لوگ اپنی غلطی کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جیسا جہاں کا ماحول ہوگا ویسا ہی لوگ وہاں بنا میں چاہتے ہیں۔ مجھے تو ان لوگوں کی غلطیاں نظر نہیں آئیں۔ وہ مجبور ہیں۔ وہاں اس طرح کا بننے کے لیے جوانی کی عمر اور پانی کا ریلا ایک طرح کا ہوتا ہے۔ جدھر کو جھکاؤ ہوگا ادھر ہی کو بہہ جائے گا۔ اگر صحیح طور سے بنانے والے ہوں تو کیا دیر لگے۔ ان کی بنا بہت آسان ہوتا ہے۔ پھر ہمارے یہاں تو نوجوانوں کو ایک خاص چیز سکھائی جاتی ہے عیاشی' کیونکہ ہمیں عیاشی کی طرف لے جانے میں اسے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہے۔

وہاں سے آنے کے بعد ہم دونوں میں اسی موضوع پر کئی دن تک بات ہوئی۔ ان کے خیالات سے مجھے ایسا لگتا تھا کہ اگر ان کے بس کی بات ہوتی تو وہ شاید سنسار کی کایا بدل دیتے۔ بار بار اس موضوع پر بات ہوتی۔ اب نہ وہ ہیں' اور میں؟ میں تو اور بھی وہ نہیں ہوں۔ یہ باتیں میری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہوں۔ یہ باتیں ان کی ہیں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کے تھے اس لیے میں ان کی باتیں ان کے ان پڑھنے والوں کی نذر کر رہی ہوں۔ میں خود بھی اپنی نہیں ہوں۔

۱۹۳۴ء

کئی روز سے صبح کا وقت لوگوں سے ملنے ہی میں نکل جاتا' رات کو اٹھ کر کام کرتے۔ ایک دن میں بولی ''رات کو کام کرنا ٹھیک نہیں۔''

آپ بولے'' تو پھر کام کب کروں؟ دن بھر لوگوں کے ملنے ہی سے چھٹی نہیں ملتی۔''

میں بولی'' آخر ملنے کا کوئی وقت کیوں نہیں مقرر کر لیتے۔ یہ کیا کہ جب بھی کوئی آئے آپ اس سے گپ شپ کرنے لگے۔''

'' تو کیا کروں؟'' انھوں نے کہا۔

'' اس کا طریقہ تو آپ ہی نکال سکتے ہیں'' میں نے کہا۔

'' وہ بے چارے اتنی دور سے ملنے کے لیے آتے ہیں' اگر اُن سے نہ ملا جائے تو وہ بھی تو اچھا نہیں لگتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان سے نہ ملوں۔''

'' لیکن ہر وقت کا یہ جھنجھٹ ٹھیک نہیں کہ جو جب آیا اس سے تبادلۂ خیال شروع ہو گیا۔''

آپ بولے'' یہ تو بڑے آدمیوں کے لیے ہے کہ ان سے ملنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔''

میں نے جواب میں کہا'' آپ کے بڑے آدمی ہونے کے لیے یہ بات نہیں کہہ رہی ہوں' سب کام وقت سے ہونے کے لیے کہہ رہی ہوں۔''

آپ بولے'' بات ٹھیک ہے' پر بڑے آدمیوں ہی کے لیے ممکن ہے۔ جسے میں برا سمجھتا ہوں وہی کام خود کروں۔

پھر وہ بے چارے کہاں جائیں؟ نیا نیا کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بنا پتوار کے ناؤ کی طرح ہیں۔ اپنی مشکلوں کو حل کرنے کے لیے یہ لوگ اتنی دور سے میرے پاس آتے ہیں۔ اگر میں بھی ان سے بات نہ کروں تو وہ کہاں جائیں گے؟ پھر یہ بھی تو ہے کہ کچھ دنوں میں انہی کے ہاتھوں میں ادب کی باگ ڈور جائے گی۔ ان کو ٹھیک راستے پر لے جانا ہم لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو ٹھیک طرح سے نہ نبھاؤں تو میرا ہی قصور ہوگا۔ اگر ایسا نہ کروں تو ہم انھیں غیر ادیب' ادب کی طور طریقوں سے ناآشنا وغیرہ کہنے کا حق نہیں رکھتے۔ پھر جو ہنر جسے آتا ہوا سے سب کو سکھانا چاہیے۔''

'' سب کو سکھانے کا ٹھیکہ کیا آپ نے لے رکھا ہے؟'' میں نے کہا

'' تو بتاؤ کیا کروں'' وہ بولے'' صبح گھومنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ گھوم کر آتے ہی ناشتہ کر کے کام کرنے اپنے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ خود بھی لکھتا پڑھتا ہوں' ساتھ ہی میں تمھارے بچوں کو بھی

پڑھاتا ہوں۔ اس کے بعد اٹھتا ہوں' نہاتا دھوتا ہوں' کھانا کھاتا ہوں۔ پھر پریس جاتا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر ایک گھنٹے تک بچوں سے بات چیت کرتا ہوں نہیں تو وہ بلکنے ہو جائیں اور اسی کے ساتھ اپنی بھی تو دن بھر کی تھکن مٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد منشی آ جاتا ہے' اسے کچھ نہ کچھ بتانا پڑتا ہے۔ پھر نو بجے اٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔ ایک گھنٹہ ہی باقی بچتا ہے۔ اتنی ہی دیر میں جو چاہوں لکھوں پڑھوں۔ اس پر سرکاری حکم ہے کہ دس بجے سو جاؤ۔ سرکاری حکم ٹالا بھی جا سکتا ہے مگر تمھارا حکم نہیں ٹالا جا سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ اس میں کتنا وقت میں نکال سکتا ہوں۔ لیڈر (انگریزی اخبار) تو میں پریس میں پڑھتا ہوں۔ میرا تو ایک ایک سیکنڈ بنا ہوا ہے۔ میں تو ایشور سے یہی دعا کرتا ہوں کہ رات چھوٹی ہوا کرے دن بڑا۔''

''آپ رات کو بھی تو کام کرتے ہیں'' میں نے پوچھا۔

آپ بولے'' اٹھتا تو ضرور ہوں پر تمھارا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں تم جاگ نہ جاؤ۔ بھائی کام کب کروں اگر رات کو نہ جاگوں؟''

میں بولی'' اس سے تو یہ بہتر ہوتا کہ آپ اکیلے رہتے۔ آپ کو شادی بیاہ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔''

آپ بولے'' تمھارے ہوتے ہوئے اب بھی کوئی بار در پیش نہیں ہے۔ گھر گرہستی کی طرف سے چھٹی مل گئی ہے۔ پیسہ کمانا میرے لیے کٹھن نہیں ہے۔ گرہستی کی گتھیاں میں ہرگز نہیں سلجھا پاتا۔ میں اس معنی میں خوش ہوں کہ سب بار تم نے اپنے سر لے لی ہے۔''

میں بولی'' تب آپ آرام سے رہتے' میں ڈانٹنے کو تو نہ ہوتی۔ آپ رات دن کام کرتے۔''

آپ بولے'' تمھارا خیال غلط ہے۔ تم نہیں ہوتی ہو تو میں اتنا کام نہیں کر پاتا ہوں۔''

میں نے کہا'' تو کیا مجھے چڑھانے کے لیے رات رات بھر جاگ کر کام کرتے ہیں''؟

بولے'' اگر کوئی کھانے والا نہ ہو تو کمانے والا گدھا ہے۔''

میں بولی'' وہ کیسے؟ ایسے میں تو آرام ہی آرام رہتا ہے۔''

آپ نے کہا'' نہیں جی' وہ بھی کوئی آدمی ہے۔ ویسوں کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔''

''تب تو سب سے زیادہ آفت مجھ پر ہے۔''

''آفت کی یہ بات ہے اس میں۔ تمھاری نگرانی ہی نے مجھے ایسا بنا رکھا ہے۔''

''دلیکھلوں کو بڑی آفت رہتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم بھی تو لیکھکا بن رہی ہو'' وہ بولے ''منع تو کرتا ہوں آرام سے رہو پر تم کہاں مانتی ہو۔''

''جب آپ آرام نہیں کرتے تو میں کیوں آرام سے رہوں'' میں نے کہا۔

آپ بولے ''تمھارا خیال غلط ہے۔ میں اس میں گھٹتا نہیں' مجھے اس میں سکون ملتا ہے۔ پھر اب تو تمھیں بھی تھوڑا تھوڑا اس کا تجربہ ہو گا۔''

''رات دن کام کرنے کو گھٹنا ہی کہتے ہیں۔''

''کوئی زبردستی تھوڑی مجھ سے کام کرواتا ہے۔ اب اسی سے سوچ لو' مجھ سے جو ملنے آتے ہیں ان سے میرا ہی فائدہ ہے ان کا نہیں۔''

''تب تو ٹھیک ہے'' میں نے کہا ''لیکن اتنی مہربانی کیا کیجیے کہ رات کو جگا مت کیجیے۔ رات کو اٹھنے سے بیماری کا خطرہ مجھے ہو جاتا ہے۔''

''اسی طرح تم سمجھ لو۔ تمھاری بیماری سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ تم بیمار پڑ جاتی ہو تو میرا سارا کام پچھڑ جاتا ہے۔

''میں کام کرنے کی وجہ سے کبھی بیمار نہیں پڑی۔''

''سال بھر تم کو بھی ایک نہ ایک بیماری لگی رہتی ہے۔'' وہ بولے۔

''کبھی پڑ تو نہیں جاتی۔''

''میں ہی کب پڑ جاتا ہوں۔''

مجھ سے اس طرح اکثر ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ میرے غصّے کا جواب وہ ہنسی سے دیتے۔ میں آج ان باتوں کو سوچ کر خود کو ملامت کرتی ہوں۔ پہلے غصہ آتا تھا' آج دکھ ہوتا ہے۔

۱۹۳۴ء ماہ مئی، کاشی

'ہنس' اور 'جاگرن' ماہانہ اور ہفتے وار دو پرچے نکلتے تھے۔ خرچ بڑھا ہوا تھا۔ بمبئی سے فلم کمپنی والوں نے بلایا۔ ایک دوست چندر بھان جوہری سے باتیں ہوئیں' انھوں نے بھی کہا کہ آپ جائیے۔ جب دونوں نے یہ بات نیچے طے کر لی تو اس کے بعد میرے سامنے تجویز آئی۔ آپ مجھ

سے بولے ''چلو بمبئی کی سیر تمھیں کرالاؤں۔''

میں نے کہا ''کیسی سیر؟''

''فلم کمپنی والے مجھے بلا رہے ہیں'' انھوں نے کہا۔

''فلم کمپنی والے بلا رہے ہیں یہ ٹھیک ہے' پر وہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔ آپ کا ہاضمہ خراب ہے وہاں کے ہوا اور پانی میں آپ ٹھیک نہ رہ سکیں گے۔'' میں نے کہا۔

''آخر اور لوگ بھی تو وہاں رہ رہے ہیں۔''

''سب کے رہنے نہ رہنے کی کیا بات ہے' ہر ایک آدمی اپنے سمجھتے سے رہتا ہے۔ میں تو آپ کا وہاں جانا اچھا نہیں سمجھتی۔''

آپ بولے ''تم ہی سوچو' بنا جائے کام بھی تو نہیں چل سکتا۔ یہاں جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اپنے خرچ میں پوری ہو جاتی ہے۔ اب یہ 'ہنس' اور 'جاگرن' کیسے چلیں؟ یہ دونوں بھی تو تمھارے پلو سے بندھے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا ''میں ان کے لیے بھی آپ کا بمبئی جانا ٹھیک نہیں سمجھتی۔''

آپ بولے ''اب جب جوان ہاتھیوں کو گلے سے باندھا ہے تو کیا انھیں چارا نہیں دو گی؟ آخر ان کو بھی تو زندہ رکھنا ہے۔''

میں نے کہا ''آپ جو بھی کام کرتے ہیں جان کو مصیبت لگا لیتے ہیں۔''

بولے ''ارے صاحب ان باتوں کا رونا تو پچاسوں بار ہو چکا ہے۔ اب جب ان کو باندھ لیا ہے تو ان کو چلانا ہی ہوگا۔ لو ایک اور بات بتاتا ہوں' وہاں جانے سے جو خاص فائدہ ہوگا وہ یہ ہے کہ ناول اور کہانیاں لکھنے میں جو فائدہ ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ فلم دکھلا کر ہو سکتا ہے۔ کہانیاں اور ناول جو لوگ پڑھیں گے وہی تو ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے فلم سے ہر جگہ کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

''لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس سے میرا کیا بھلا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''یہی تو تمھاری ناسمجھی ہے۔ لوگوں کے فائدے کے لیے میں تھوڑے ہی لکھتا ہوں۔ اپنی روح کے سکون کے لیے جو کچھ لکھتا ہوں اس کو تعداد میں جتنے زیادہ لوگ سمجھ سکیں' دیکھ سکیں' پڑھ سکیں اتنی ہی زیادہ مجھے خوشی ملے گی۔ اور اس کے علاوہ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ 'ہنس' اور 'جاگرن' کو چلانے کے لیے

میں زیادہ روپیہ دے سکوں گا۔ نو ہزار سال میں وہ دینے کا وعدہ کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ بمبئی میں ایک ڈیڑھ سال رہنے کے بعد وہ مجھے نو دس ہزار گھر بیٹھے دیں گے۔ میں گھر بیٹھ کر ان کے لیے یہاں سے کہانیاں بھیجتا رہوں گا۔ بتاؤ بمبئی میں سال ڈیڑھ سال رہنا کیا برا ہے؟

ہمیشہ کے لیے گھر بیٹھے کام ملتا رہے تو کیا برا ہے۔''

میں نے کہا ''اگر ایسا ہے تو چلیے۔''

آپ بولے ''اب میں زیادہ دن تھوڑے ہی کام کر سکوں گا۔ کام کرنے لائق یہ ۴-۵ سال ہی اور ہیں۔''

''تب کیا آپ اتنی جلدی پنشن لے کر بیٹھ رہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے ایک چرخا چھوڑوں گا تو دوسرا چرخا لوں گا۔ یہ پڑھنے لکھنے کا کام چھوڑ کر میری خواہش دیہاتوں میں کام کرنے کی بھی تو ہے۔''

''اور جب آپ دیہات کام کرنے چلیں گے تو یہ چرخا کہاں جائے گا؟ میں نے کہا۔

''تب تک دھنو کو جو ہونا ہوگا ہو جائے گا اس کو یہ سب کام سونپ کر ہم اور تم دونوں دیہات میں کسانوں کا کام کریں گے۔ کیونکہ جو حالت آج کل کاشت کاروں کی ہے جب تک کوئی ان کے درمیان رہ کر کام نہیں کرے گا تب تک ان کو سدھارنا بہت مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ خود ان کے درمیان رہ کر کے ان میں کام کیا جائے۔ جو کام ان کے ساتھ زندگی گزار کر سال دو سال میں ہو سکتا ہے وہ لمبی لمبی تقریروں سے ایک طویل عرصہ میں بھی ہونا مشکل ہے۔''

میں بولی ''اگر ایک آپ ہی کام کریں گے تو کتنے کاشت کاروں کی حالت کو سدھار دیں گے اور کتنوں کا فائدہ ہو جائے گا۔''

وہ بولے ''میں کتنی ہی بار کہہ چکا ہوں کہ کوئی کام کسی کے فائدے کے لیے نہیں کیا جاتا ہے۔ جو کام آدمی کرتا ہے اپنی روح کے سکون کے لیے کرتا ہے۔''

میں نے کہا ''مان لو دھنو سے جو امید رکھتے ہو وہ اسے پورا نہ کر سکے تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے!''

وہ بولے ''میں اس پر اپنا بوجھ تو نہیں ڈال رہا ہوں۔ آخر جب وہ کام کرنے کے لائق ہوگا تو کہیں تو

کام کرے گا ہی۔ باہر کی نوکری سے گھر کا کام اکھڑ رہے بہتر ہوتا ہے۔ دوسرے باہر کام ملتا ہی کہاں ہے۔ لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں۔''

میں بولی'' پھر بھی ہو مان لو وہ یہ نشانہ لینا چاہے۔ تو پہلے سے کسی سے بھی آس لگانا بے کار ہے۔ جیسے پہلے آپ اپنے بھائی کو سمجھتے تھے کہ آگے چل کر میرا مددگار ہوگا۔ پھر انھوں نے کیا مدد کی؟ اور نہیں تو پڑھ لکھ کر جیسے ہی نوکر ہوئے شادی ہوئی اس وقت تک آپ کے ساتھ رہ رہے تھے' شادی ہوتے ہی الگ ہو گئے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سے کوئی ناتا ہی نہیں ہے'' آپ بولے'' رانی' بھائی تو بھائی تھا' اس پر سوتیلا۔''

''تو کیا آپ نے ان کو دھنو سے کم پیار کیا تھا؟'' میں نے کہا'' پھر آپ دھنو سے کیوں کوئی امید رکھتے ہیں؟''

آپ بولے'' بھائی کے ساتھ رحم کا پیار تھا' لڑکے کے ساتھ خون کا پیار ہے۔ بھائی دوسرے کا لڑکا تھا' بیٹے میں اپنا خون ہے۔ اپنے بچوں کے ساتھ ماں باپ ہمیشہ ہی زندہ رہتے ہیں۔ امید تو یہی کی جاتی ہے کہ جیسے ہم تم ہیں ہمارے بچے بھی ویسے ہی ہوں گے۔ پھر سوچ لو ہمارا بوجھ ہی کیا ان کے سر پر ہے۔ ایک طرح سے یہ بھی ان کے ساتھ ہمارا احسان ہے''

میں نے کہا'' میرے خیال میں تو اب کسی سے امید رکھنا بے کار ہے۔''

آپ بولے'' تو میں کہیں دوسری جگہ تو نہیں جاؤں گا۔ اپنے بھی گاؤں میں اپنا گھر بنوا لیا ہے اسی میں ہم تم دونوں رہیں گے اور کبھی کبھی شہر آ کر ان کا کام بھی دیکھ جایا کریں گے۔ رہا بنو' وہ جب تک پڑھے گا پڑھے گا۔

اور پھر تمھارے ساتھ بوجھ ہی کون سا بھاری ہے۔ وہ بھی آ جائے گا تو دونوں بھائی مل کر کام کیا کریں گے۔ ہم بھی جو کچھ لکھا کریں گے ان لوگوں کے پاس بھیج دیا کریں گے۔ اب بتاؤ' تم کو اس میں کیا اعتراض ہے؟''

میں نے کہا'' اپنے کام کی ذمہ داری دوسرے کے سر ڈالنا میں مناسب نہیں سمجھتی۔ بہت ممکن ہے کہ اپنے ہی بچے سمجھنے لگیں کہ ہم انھیں کما کر دیتے ہیں۔''

آپ بولے'' نام میں سب اپنے ہی رکھوں گا تاکہ ان کو یہ کہنے کا حق ہی نہ ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ مجھے امید نہیں ہے کہ میرے لڑکے اتنے نالائق ہوں گے۔ جب یہ نالائقی کریں گے تو میں ان سے کام کیوں نہیں کروں گا؟ میں یہاں تک سمجھتا ہوں کہ تم اور میں اگر جنگل میں بھی رہیں گے تو

بھو کے وہاں بھی نہیں رہیں گے۔ ہمارے اعمال اتنے برے نہیں ہیں؟''

میں نے پوچھا ''تو پھر آپ کو بمبئی کب جانا ہے؟''

''اس پہلی جون کو ہم کو وہاں پہنچ جانا چاہیے۔'' انھوں نے کہا۔

''ابھی تو ہمیں الہ آباد دو شادیوں میں جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس پر وہ بولے ''تو پھر پہلے میں اکیلا جاؤں گا۔ جب تم کو شادیوں سے چھٹی ملے گی تو پھر تم کو بھی آ کر لے جاؤں گا۔''

''تو کیا بچے بھی بمبئی میں پڑھیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بارے میں، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' انھوں نے کہا ''وہاں جانے پر کچھ اندازہ ہوگا۔''

''تو کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں بچوں کو یہاں چھوڑ کر آپ کے ساتھ جاؤں گی؟'' میں نے سوال کیا۔

بولے ''تو بھائی میں کہتا تو ہوں نا کہ وہاں جانے پر ہی صحیح اندازہ ہوگا کہ کیا کرنا ہوگا۔''

اس کے بعد جانے کی تیاری ہونے لگی۔ جب تیاری ہو چکی تو پتہ چلا روپیہ ندارد۔ جو روپیہ تھا بھی وہ بینک میں تھا اور سال بھر کی معیاد پر تھا کیونکہ بینک سے ۱۵۰۰ روپے قرض بھی لے چکے تھے۔ اب روپے کہاں سے آئیں؟ پریس منیجر سے پوچھا ''پریس کے اکاؤنٹ میں روپے ہیں؟''

منیجر نے کہا ''اکاؤنٹ میں تو روپے نہیں ہیں؟''

میرے پاس ایک دوست کے روپے بطور امانت رکھے تھے۔ آپ بولے ''آخر وہ روپے تمھارے پاس رکھے ہوئے ہیں ان میں سے دو سو نکال لو اور ان سے کہہ دو۔ میں اسی مہینے کے بعد روپے بھیج دوں گا وہ انھیں دے دینا۔''

میں بولی ''میری ہمت نہیں کہ کسی کی امانت میں سے ایک پیسہ بھی نکالوں۔ جاتے سمے میں ان کے روپے انھیں دیتی جاؤں گی۔''

آپ بولے ''اس میں قباحت کیا ہے۔ یہی کہہ دینا دو سو روپے اپنے خرچ میں لے لیے ہیں۔ اس مہینے کے بعد دے دیں گے۔ ابھی ان کو کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''میں یہ سب کچھ نہیں جانتی اور ایک پائی بھی ان روپیوں میں سے نہیں چھو سکتی ہوں۔

اپنے منیجر سے پوچھیے اگر وہ پندرہ دن کے بعد شادیوں میں روپیہ دینے کا وعدہ کریں تو میرے پاس ۱۰۰ روپے ہیں۔ وہ دے سکتی ہوں۔"

آپ ان سو روپوں کے ہونے کی بات سن کر بولے "یہ روپے تمھارے پاس کہاں تھے؟"

میں نے کہا "گھر میں تھے اور کہاں تھے۔"

آپ بولے "یہ بڑے موقع سے تمھارے پاس نکلے۔ میں تین چار دن سے روپے کے لیے پریشان تھا۔ سوچتا تھا کس سے ادھار مانگوں۔ کسی سے مانگتے بھی تو نہیں بنتا۔"

میں نے کہا "جیسے آج مجھ سے کہنے لگے اگر پہلے کہا ہوتا تو میں پہلے ہی اس الجھن کو دور کر دیتی۔"

آپ بولے "مجھے ڈر تھا سارا غصہ تم شمس اور جہانگیر پر ہی اتاروگی۔"

میں نے کہا "آپ نے شمس اور جہانگیر کی میں گویا سوتیلی ماں ہوں۔"

آپ بولے "کیا کروں میں بھی تو اپنے سر بے ہودہ سے بے ہودہ روگ لگا کر ہمیشہ سے جوا سے پالنے کی عادت ہے اس میں تم کو بھی پیستا ہی رہتا ہوں۔ روگ پالتا ہوں میں اسے روگ کیوں یہ شوق کیوں کرتا ہوں میں مجھے جانتی ہے تمھارے۔ تمھیں بھی تو ہمیشہ سے اسی پریشانی میں ڈالے رہتا ہوں۔ اب میں ہوں یہ میری جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا ہم نے تو کام کیا اور کام کا ذمہ بھی لیا اور آج ایک ٹکا بھی پاس نہیں ہے۔ اور تم اپنے پاس سے پھر بھی سو روپے دینے کو تیار ہو۔ اس کے لیے تم نے کم سے کم دس مہینے تو نفس کشی کی ہوگی تب جاکر یہ سو روپے جوڑ پائی ہو۔ کون سا ہم تم کو زیادہ روپے دیتے ہیں لیکن پھر بھی تم نے سو روپے بچا ہی لیے۔ منیجر کے ہاتھ سے قریب سات سو روپے کے مہینے میں خرچ ہوتے ہیں۔ مگر اس کے اکاؤنٹ میں کچھ بھی نہیں۔ تمھارے ہاتھ سے ۱۵۰ روپے خرچ ہوتے ہیں وہاں سو تم بچا سکتی ہو۔ تو خرچ کرنے میں تم ہوشیار ہو یا ہم؟"

میں بولی "اجی صاحب ہمارے پاس زیادہ آئے ہوں گے تبھی ان میں سے کچھ نکال سکی ہوں۔ میں نفس کشی کرنے والی ہستی نہیں۔"

تین روپے ان کی جانے کی تیاری میں خرچ ہوئے۔ اسی روپے ان کے ساتھ کر دیے۔ جس دن انھیں بمبئی جانا تھا اس رات بھر جاگتے ہی رہے کیونکہ صبح کی چار بجے کی ٹرین پکڑنی تھی۔ جانا دور تھا، پریشانی تو کئی دن سے تھی اور مجھے پریشانی تھی وہ تو تھی ہی مجھ سے زیادہ وہ پریشان تھے۔ بار بار جھنجھلاتے تھے اور کہتے تھے کہاں سے یہ شادیاں بھی تمھارے سر آ پڑیں۔ ابھی ساتھ ساتھ مع بچوں کے چلتے۔"

میں نے کہا "ابھی وہاں مکان کا بھی تو ٹھیک نہیں ہے' کہاں ساتھ لے چلتے۔"

آپ بولے "چلنا ہوتا تو وہاں کئی دوست ہیں۔ دو تین دن کسی کے یہاں بھی ٹھہر سکتے تھے۔ کسی کے مکان میں چند دن قیام کرتے اور اسی بیچ میں مکان وغیرہ سب ٹھیک ہو سکتا تھا۔ یہاں تم بچوں کے ساتھ اکیلی رہو گی' میں وہاں اکیلا رہوں گا' کیا ہوگا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آرام سے تو پڑا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے بلا ہی لیا۔ تم سے تم ان سب جھنجھٹوں سے بری تو تھا"

میں نے کہا "تو یہ روگ اپنے آپ لگایا گیا ہے یا کسی دوسرے نے پیدا کیا ہے؟ میں تو آپ سے منع کر رہی تھی مگر آپ مانے ہی نہیں۔"

آپ بولے "مانتا تو اور بھی بہت کچھ' مگر کام بھی چلے تب نا"۔ کام بھی تو نہیں چلتا' مجبوری تھی۔ مجبوری بھی ایک بلا ہوتی ہے۔"

"جب منع کرتی ہوں تب آپ مانتے بھی تو نہیں ہیں۔ یہ سب مجبوریاں آپ کی ہی پیدا کی ہوئی ہیں۔"

آپ بڑی سادگی سے بولے "اب بتاؤ جب بن گئی تو میں کیا کروں؟"

میں بولی "اب کرنا کیا ہے' اب تو صبح کی گاڑی سے جانا ہے۔"

صبح تانگے والے نے آپ ہی آواز دی۔ جب آپ تانگے میں بیٹھنے لگے اور میں نے ان کے پیر چھوئے تو میرا گلا بھر آیا۔

آپ بولے "جیسے ہی تمھارے یہاں کی شادیاں ختم ہوں۔ ویسے ہی مجھے خط لکھنا تاکہ میں تم لوگوں کو جلدی سے جلدی لوا لے جاؤں۔"

وہ تو چلے گئے' میں اوپر گئی اور ایک گھنٹے تک روتی رہی۔ وہ مہینہ' بیس دن کی جدائی تھی۔ خط کے ذریعے ملاقات کی نوبت اکثر آتی تھی۔ اور تب وہ جدائی دکھ دیتی تھی لیکن اب ہمیشہ کی جو جدائی ہو گئی ہے اس کو کس آسانی سے اور آرام سے بیٹھی سوچ رہی ہوں۔

ان کے پہنچنے کا خط ۷ جون کو تحصیل سورام میں ملا جہاں میں شادی میں گئی ہوئی تھی۔ وہ ۴ جون سنہ ۳۴ کا تھا' لکھا تھا:

پیاری رانی' شبھ پیار

میں تم سے بدا ہو کر خیریت سے بمبئی پہنچ گیا ہوں۔ یہاں اسٹوڈیو کا کام بھی دیکھنا شروع کر دیا ہے

۔تم بھی شاید مع بچوں کے سورام سے واپس گھر پہنچ گئی ہوگی۔ غالباً بٹی کو لینے بھی کوئی نہ کوئی گیا ہوگا۔ اب تمھارے پاس بٹی اور گیا تو بھی پہنچ جائیں گے۔ تمھارے پاس تو سبھی ہوں گے۔ بھائی بندلڑکے لڑکی سب ہی ہیں اور مجھے تو تم لوگوں کے بنا اتنی بڑی بمبئی ہوتے ہوئے بھی سونا ہی معلوم ہوتا ہے۔ بس یہی بار بار خواہش ہوتی ہے کہ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوں۔ بار بار یہ جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہاں سے یہ بلا مول لے لی۔ میں نے ابھی مکان نہیں لیا ہے۔ مکان لے لوں گا تو وہ سونا گھر اور کاٹنے کو دوڑے گا۔ اس خیال سے میں مکان کے بارے میں سوچتا ہی نہیں ہوں۔ مکان تو اس وقت ہی لوں گا جب تمھارے آنے کا خط آ جائے گا۔ اور مکان لے کر ہی سیدھا تمھارے پاس تمھیں لینے کو آؤں گا۔ میری طرف سے بچوں کو پیار کرنا۔ اپنی بہن جی کو میرا سلام کہنا اور باقی سب کو مناسبات۔ میں آرام سے ہوں۔ تم کسی بات کی چنتا مت کرنا۔

تمھارا

دھنپت رائے

دوسرا خط ۱۵ جون کا لکھا ہوا ملا۔

پیاری رانی،

میں یہاں خیریت سے ہوں۔ تم لکھتی ہو کہ ۲۲ جون کو شادی ہے۔ اور دوسری بہن کے یہاں جو شادی ہے وہ ۲۸ جون کو ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شادیاں ان لوگوں کے گھر ہوں اور اس کا تاوان اکیلا میں دوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم جولائی سے پہلے آنے کا نام بھی شاید نہ لوگی۔ بٹی اور گیا تو آ گئے ہیں۔ یہ معلوم ہوکر مجھے خوشی ہوئی۔ تم تو ان سبھوں کے ساتھ خوش ہوا دھر میں سوچتا ہوں کہ یہ ایک ڈیڑھ مہینے کیسے بیتیں گے۔ یہ بات میں سمجھ ہی نہیں پا رہا ہوں۔ آخر کام ہی کروں تو کتنا کروں۔ آخر بیل تو نہیں ہوں۔ پھر انسان کے لیے منورنجن (دلچسپی) بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میرا منورنجن تو سب سے بڑھ کر بال بچوں سے گھر پر ہی ہو سکتا ہے۔ میرے لیے دوسرا کوئی منورنجن ہے ہی نہیں۔ کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تب بھی اچھا نہیں لگتا کیونکہ یہاں صاحبی ٹھاٹ باٹ ہے اور صاحب بننے سے میری طبیعت گھبراتی ہے۔ وہاں ہوتا، گیا تو آیا تھا، اس کو کھلاتا۔ اب تو وہ خوب صاف بولتا ہوگا۔ اچھا، نو اور دھنو کا کیا حال ہے؟ بٹی تو اچھی ہے نا؟ اس سبھوں کو میری طرف سے پیار کر لینا۔ یہ سب تو خوش ہوں گے کیونکہ شادی ہے۔ میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ گھر بار سے الگ ہوکر لوگ کیسے رہ جاتے ہیں۔ میری تو ان مہینے ڈیڑھ مہینے کا خیال کرنے سے نانی مرتی ہے کہ

کس طرح یہ دن کٹیں گے۔ کیا کروں کسی طرح تو کاٹنے ہی ہوں گے۔

تمھیں منیجر نے روپے بھیجے کہ نہیں' لکھنا اور حال چال بعد میں لکھوں گا۔ تم اپنی طبیعت کا حال لکھنا۔

تمھارا

دھنپت رائے

تیسرا خط: تاریخ ۲۴ جون' سنہ ۳۴

پیاری رانی'

میں خیریت سے ہوں' آشا ہے کہ تم بھی سب لوگوں کے ساتھ خیریت سے ہوگی۔

اب تو دو' تین دن ہی میں تمھارے یہاں شادی ہوگی۔ ہاں دوسری شادی جو تمھارے یہاں ہونے والی ہے اس میں تو شاید ابھی دیر ہے۔ آج میں نے مکان لے لیا اور کل شاید اپنے مکان میں چلا جاؤں۔ پچاس روپے مہینہ کرایہ ہے۔ نوکر ۱۲ روپے اور کھانے پر رکھا ہے۔ وہ سب کام کر لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلی جولائی کو تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تمھارے یہاں تو کافی چہل پہل ہوگی۔ اور دھنو تو فیل ہو گیا۔ خیر کوئی افسوس کی بات نہیں ہے۔ فیل پاس تو لگا ہی رہتا ہے' پھر بھی اپنے بچوں کا فیل ہونا اچھا نہیں لگتا۔ رنجیدہ ہو تو سمجھا دینا۔ غلطی اس کی ہے۔ یہ دوسرا خط اس کے لیے لکھ رہا ہوں' اسے دے دینا۔ بنا اور بنی وغیرہ کو پیار کہنا۔ میں نے پچھلے خط میں پوچھا تھا کہ گیانو بولتا ہے یا نہیں۔ تم نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اب کے لکھنا۔ اپنی بہن جی اور دوسرے لوگوں کو میرا اسلام کہنا۔ بچوں کو پیار۔

تمھارا

دھنپت رائے

یکم جولائی سنہ ۳۴

پیاری رانی'

میں خیریت سے ہوں' آشا کرتا ہوں کہ تم بھی خیریت سے ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ میں ۱۵ جولائی کو

تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ بنّی کو ابھی بدا نہ کرنا۔ میں اس کو اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔ بچوں کی تعلیم کے لیے پریاگ (الہ آباد) بہتر رہے گا۔ ان کا نام وہاں لکھا دینا۔ دونوں آرام سے پڑھیں گے۔ تم کو اور بنّی کو یہاں لے آؤں گا۔ بچوں کے نام یہاں لکھانے سے میں یہاں بندھ جاؤں گا اور میں کہیں بندھنا نہیں چاہتا۔ ابھی تک میں یہاں رہنے کا پکا ارادہ نہیں کر سکا ہوں اس لیے یہاں لڑکوں کا نام لکھانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ان کا وہاں رہنا زیادہ ٹھیک ہے نہیں تو آگے چل کر ان کی تعلیم میں گڑبڑی ہونے کا اندیشہ ہے۔ تم اپنے خط میں یہ لکھو گی کہ میں خود رہ کر کے بچوں کو یہیں پڑھاؤں۔ اس کے لیے میں یہ لکھ رہا ہوں کہ بچوں کو سب سے زیادہ روپے کی خواہش ہوتی ہے سو میں ان کو سو روپے مہینہ دیتا رہوں گا۔ وہ آرام سے وہاں رہیں گے۔ ان کو ضرورت نہ میری ہے نہ تمھاری۔ اب اس کے جواب میں تم لکھو گی تم ہی مجھے کیوں چاہتے ہو۔ اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ میں خود ہی نہیں جانتا کہ تمھیں کیوں چاہتا ہوں۔ مگر یہ جانتا ہوں کہ چاہتا ہوں۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ (تمھارا) پجاری ہوں۔ تمھارے بنا مجھے اکیلے رہنا دوبھر ہو رہا ہے۔ تم دونوں بچوں کا الہ آباد میں سے ترت ہی نام لکھا دو۔ اور حال بعد میں لکھوں گا۔

تمھارا

دھنپت رائے

۱۵ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء

پیاری رانی پیار

میں ٹھیک ہوں امید ہے تم سب لوگ بھی ٹھیک ہو گے۔ بچوں کا نام کایستھ پاٹھ شالا میں لکھوا دیا۔ یہ ٹھیک ہوا۔ ان کا بورڈنگ ہاؤس کا انتظام بھی تو ہو گیا۔ دھنو کا خط آیا تھا۔ تم نے جو روپے اسے دیے تھے کم پڑ گئے۔ آج میں نے اسے سو روپے بھیجے ہیں۔ میں شاید ۲۰ تک آؤں اور تم لوگوں کو لینے ہی آؤں گا۔ اس وقت تک تم تیاری کر لینا۔ بنّی اور بنّو تو شاید تمھارے ہی پاس ہوں گے۔ ان لوگوں کو میرا پیار کہنا۔ باقی باتیں تو جب آؤں گا تب بتاؤں گا۔ یہ خط جب تک تمھارے پاس پہنچے گا تب تک شاید میں خود تمھارے پاس پہنچ چکا ہوں گا۔

تمھارا

دھنپت رائے

آپ ۲۵ جولائی کو کاشی (بنارس) آئے۔ پانی خوب زوروں سے برس رہا تھا۔ صبح ۴ بجے کی ٹرین سے اترے تھے۔ بری طرح بھیگ گئے تھے۔ میں نے نمسکار کر کے پوچھا' آپ بھیگ کیسے گئے؟''

آپ ہنس کر بولے'' تم سمجھتی تھیں کہ تم جو کوٹھے پر سو رہی تھیں تو ہر جگہ کوٹھے ہی بنے ہوئے ہیں۔ میں اسٹیشن سے گھر تک آنے میں بھیگا ہوں۔ اور پانی کیسا تیز ہے' کئی بار تم کو آواز دینے پر تو تم سن پائی ہو۔''

میں نے کہا'' آپ کپڑے بدل ڈالیے۔ کہیں زکام نہ ہو جائے۔''

میں خود ہی ان کا ہولڈ اول کھولنے لگی۔ کہنے لگے'' میں نکالے لیتا ہوں تم سے نہیں کھلے گا۔ کیوں پریشان ہوتی ہو۔''

خیر کپڑے بدلے۔ کچھ دبلے ہو گئے تھے۔

میں نے پوچھا'' طبیعت کیسی ہے؟''

'' ٹھیک ہے۔ اچھا ہوں۔ تم سناؤ تمھارے یہاں کیا حال چال ہیں۔''

میں نے کہا'' لڑکوں کے نام تو لکھا ہی چکی ہوں جیسا کہ تمھیں معلوم ہے۔ بنّی' میں' گیانو یہاں ہیں۔ آپ کے دن کی چھٹی لے کر آئے ہیں۔''

'' چار پانچ دن کی لے کر آیا ہوں۔'' انھوں نے جواب دیا۔

'' آپ کو بمبئی کیسا لگا؟'' میں نے پوچھا۔

'' بمبئی کیسا لگا؟ اچھا ہے؟ انھوں نے کہا۔

میں بولی'' اچھا تو وہ کمپنی والے کیسے لوگ ہیں۔''

آپ بولے'' کیا بتاؤں۔ فلم سنسار دوسرا ہی سنسار ہے۔ وہاں تو صاحب ہی صاحب ہیں۔ میرے ساتھ تو ان لوگوں کا سلوک بہت ہی اچھا ہے۔ جیسا کہ تمھیں لکھا تھا مکان بھی لے لیا ہے۔ چلو اب تم بھی چلو تو کچھ اچھا معلوم ہو۔ جیسے بنارس میں تھا' گھر سے پریس جاتا تھا اور گھر پر بیٹھ کر کام کرتا تھا' اسی طرح اسٹوڈیو جاتا ہوں اور گھر پر بیٹھ کر کام کرتا ہوں۔ بلکہ یہاں تو سب کے ساتھ تھا۔ اور ٹھیک سے تھا جو نہیں گھبراتا تھا' وہاں تو رات دن کام ہی کام ہے۔ بمبئی تو ان لوگوں

کے لیے زیادہ دلچسپ ہوسکتا ہے۔ جو سیر تماشے کے عادی ہوں میرے لیے وہاں کا رہنا بس ایسا ہے جیسے میاں کی دوڑ مسجد تک' اسٹوڈیو جانا اور گھر پر بیٹھ کر کام کرنا۔ میرا دل تو وہاں گھبراتا ہے۔

میں نے کہا' بچوں کا نام لکھانے کے لیے آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔''

بولے'' کیسے ٹھیک کرتا' بچوں کا نام لکھوانے سے میں وہاں بندھ جو جاتا' اور نہ بندھتا تو لڑکوں کی پڑھائی چوپٹ ہو جاتی۔ اب بچے یہاں پڑھ رہے ہیں ہم تم وہاں رہیں گے۔ جب ہماری خواہش ہوگی چھوڑ چھاڑ کر اپنے اڈے پر چلے آئیں گے۔

وہاں سے آنے میں کوئی جھنجھٹ نہیں ہوگی۔''

دوسرے دن الہ آباد سے دونوں بچے بھی آ گئے اور کافی چہل پہل ہوگئی۔ مگر وہ چہل پہل مستقل نہیں تھی۔ بچوں کے دل میں یہ خیال تھا ہی کہ اماں اور بابوجی دونوں چلے جائیں گے۔ ہم لوگوں کے دل میں بھی کوئی خوشی نہیں تھی کیونکہ ہم کو یہ فکر تھی کہ اب بچے چھوٹ جائیں گے۔

آپ نے گھر میں چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ بولے'' اچھا' زلزلے میں تمھارے گھر کا بھی کافی نقصان ہوا ہے؟''

میں بولی'' چند روز سے مجوررے لگا رکھے ہیں تب جا کر مرمت ہو پائی ہے۔''

آپ بولے'' بہت سے لوگوں کے مکان گر گئے تھے' اچھا ہوا تمہارا کون سا نقصان ہوا۔''

'' تو میں کچھ کہتی تھوڑی ہوں۔ جو ہوا سو اچھا ہی ہوا'' میں نے کہا۔

ان باتوں کے تیسرے دن ہم بمبئی جانے کے لیے تیار ہوئے۔ ساتھ میں دونوں لڑکے تھے اور بیٹی اور کیلو۔

جب الہ آباد کے اسٹیشن پر پہنچے میں نے کھانا کھولا اور سوچا کہ بچوں کو کچھ کھلا دوں۔ جیسے ہی دونوں بچوں کو کھانا کھلانے کے لیے بٹھایا ویسے ہی انجن نے سیٹی دی۔ میں نے کھانا سمیٹ کر ایک رومال میں باندھ دیا اور چھوٹے بچے دھنو سے کہا' بیٹے اس کو اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ بورڈنگ ہاؤس میں پہنچ کر دونوں بھائی کھا لینا۔ رات کے دس بجے وہاں کھانا تھوڑی ملے گا بلکہ پہنچتے پہنچتے شاید گیارہ بج جائیں گے۔''

دھنو کھانا لے کر بچے چھوٹنے سے رو پڑا کیونکہ وہ تیرہ سال کا بچہ تھا اور پہلی بار ہم لوگوں سے جدا ہو رہا تھا

یوں بھی بچوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا۔ رو تو میں بھی پڑتی لیکن میں جی پر جبر کیے ہوئے تھی کہ بچوں کے سامنے کیسے روؤں۔ یہ سب پریشان ہو جائیں گے۔ خیر بنو تو ہم تینوں کے پیر چھوتا ہوا روتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔ آپ نے اس کو سمجھایا "دیکھو رونا مت' آرام سے دونوں بھائی رہنا۔ دونوں بھائی ساتھ ساتھ پتر لکھنا اور اب تم دسہرے پر آنا۔ آرام سے رہو۔"

دسہرا: رام کی راون پر فتح کا تیوہار

خیر بنو تو ڈبے سے اتر گیا مگر دھنو کھڑکی چھوڑتا ہی نہ تھا۔ آپ بولے۔

"کھڑکی چھوڑ دو' رو کیوں رہے ہو۔"

اسی وقت انجن نے دوسری بار سیٹی دی۔

آپ بولے "بھائی گاڑی چھوڑ دے کیوں دیر کر رہا ہے۔"

دھنو نے نیچے ہی سے سلام کیا اور چلا گیا۔

میں بولی "پانی تو رکھا ہی ہے آپ کھانا کھا لیجیے۔"

آپ بولے "میرا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا' گیا تو سو گیا کیا؟"

میں بولی "کہیں بھی نہیں سو گیا میری گود میں بیٹھا تو ہے۔"

کہنے لگے "اس کو مجھے دے دو۔" اس کو گود میں لے لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا دونوں بچوں کی کمی اس بچے سے پوری کرنا چاہتے ہیں۔ اس کو راستے بھر اپنے ہی پاس رکھے رہے۔ چائے اور دودھ لے کر اسے بیچ بیچ میں پلاتے جاتے تھے۔ کیونکہ ایک ہی ڈبے میں ہم سب لوگ بیٹھے تھے۔ اس لیے بٹی (دودھ پلاتے ہوئے) شرماتی تھی۔ جب تک گھر نہیں پہنچ گئے بچہ ان ہی کے پاس رہا۔ اور وہ بھی اگر میں یا بٹی اسے لے لیتے تو روتا تھا۔ ہم لوگوں نے بنارس میں کھانا کھائے دوسرے دن دو بجے انارسی میں کھانا کھایا۔ تیسرے دن صبح دادر پہنچے مگر اس تین دن کے سفر میں کوئی خوش نہ تھا۔ اور خوش کیسے ہوتا؟ اس کا اندازہ تو وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں پہلی بار چار چھ مہینے کے لیے اپنے بچوں سے دور ہونا ہوا ہوگا۔ میں ماں تھی' وہ پتا تھے اور وہ بڑی بہن تھی۔ ہم تین آدمی ایک جگہ جا رہے تھے۔ وہاں دونوں بچے الگ' جہاں دو میں سے ایک بھی ساتھ نہ تھا۔ نہ ماں نہ باپ۔ ایسے میں ہم لوگوں کا دکھی ہونا لازمی تھا۔

جب ہم اپنے گھر دادر میں صبح چار بجے پہنچے پانی تیزی سے برس رہا تھا۔ پانی سے بچنے کے لیے وکٹوریا کو بھی چاروں طرف سے بند کر لیا تھا اس لیے مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

۱۹۳۵ء

دونوں لڑکے پڑھنے کے لیے پریاگ (الہ آباد) جا رہے تھے۔ میں اور میری جٹھانی اور آپ لڑکوں کو پہنچانے باہر نکلے۔ بنو رخصت ہوتے سے دکھی ہو کر نمسکار کرنے لگا۔ دھنو خاموشی سے گاڑی پر بیٹھ کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب وہ چلا گیا تو بولے۔

''دھنو بڑا بد تمیز ہے۔ نہ کسی کی عزت کرتا ہے نہ کسی سے محبت۔''

میں نے کہا ''ہوا کیا؟''

بولے ''تم نے دیکھا نہیں' ہم تینوں کو نمسکار تک نہیں کیا' جیسے کوئی ناتا ہی نہیں ہم لوگوں سے۔''

میں نے کہا ''کولج میں پڑھ رہا ہے نا۔''

بولے ''نہیں جی انگریزوں میں یہ بات نہیں ہے۔ تم غلطی کر رہی ہو۔ آج کوئی انگریز لڑکا اپنے ماں باپ کو چھوڑتا ہوتا تو اس طرح تھوڑی چلا جاتا۔ وہ سب کو باری باری سے پیار کرتا۔ ان کے یہاں باپ کا چمبن کرنا بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ ہم لوگ انھیں جیسا جذبات سے عاری سمجھتے ہیں ویسے وہ لوگ حقیقت میں ہوتے نہیں ہیں۔ ہاں نالائقوں کی کمی وہاں بھی نہیں ہے۔''

میں بولی ''آخر لڑکا ہی تو ہے۔''

بولے ''جانے دینے کی بات میں نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے یہ برا لگتا ہے کہ آدمی اپنا فرض بھول جائے۔ میں یہ تو نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس سے کوئی قصور ہو گیا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہمارے اندر کے پیار کو اس نے ٹھکرا دیا۔''

''نقصان کیا ہوا'' میں نے کہا۔

''بظاہر نقصان نہ ہوا ہو پر محبت کو دھکا ضرور لگا'' انھوں نے کہا۔

میرے منھ سے نکلا ''خیر۔''

''سب سے بڑھ کر خوش نصیب شخص وہ ہے جسے سب پیار کریں۔ پیار کے سامنے دنیا کی ساری چیزیں پھیکی پڑ جاتی ہیں۔''

میں نے کہا ''خود سمجھ جائے گا۔''

بولے ''ارے ٹھیک تو ہو ہی جائے گا۔ میں تو کہہ رہا ہوں پریم کے بدلے میں پریم ملنا چاہیے۔ اگر لڑکے اپنے سے بڑوں کے پیر چھوتے ہیں تو اس لیے انھیں بڑوں کی نیک تمنا میں انھیں ملتی ہیں۔ وہی نیک تمنا میں آدمی کو آدمی بناتی ہیں۔''

''تو کیا یہ لوگ جانور ہیں؟'' میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ بولے ''جانور نہیں ہیں، پھر بھی جب ان کا دل ان جذبات سے خالی ہے تو جانور ہی سمجھو۔''

''جانے دیجیے'' میں نے کہا۔

بولے ''سو تو ہی ہے۔ یوں ہی کہہ دیا۔''

میری سمجھ میں نہیں آتا وہ کا اکار کتنا باریک بیں تھا۔ جو آدمی سب باتوں کا علم رکھتا ہو اور سب باتیں اس کی نگاہ میں ہوں اس کے بارے میں ایک طرف ڈگری نہیں دی جا سکتی۔ جتنی باتیں ہوئیں بظاہر سب معمولی ہیں پر غور سے دیکھنے میں بڑی عاقلانہ ہیں۔

اپنے گھر پہنچنے کے بعد گیارہ بجے کھانا کھا کر آپ اسٹوڈیو جانے کے لیے جیسے ہی تیار ہوئے ویسے ہی پڑوس کے ایک گجراتی سجن جن کی بوڑھی ماں تھی بولے'' بابو جی سب کو لے آئے۔''

بولے ''ہاں لے آیا۔ سب تھا ہی کون۔ ہماری لڑکی آئی ہے اور وہ آئی ہیں۔ بچوں کو پڑھنے کے لیے الہ آباد چھوڑ آئے ہیں۔''

''آئیے آئیے ہمارے گھر آئیے۔'' انھوں نے کہا۔

آپ بولے ''اب ہم تو دفتر جا رہے ہیں'' پھر میری طرف رخ کر کے کہا ''دیکھو جی، یہ ماں جی تمھاری بہت یاد کیا کرتی تھیں۔''

میں نے انھیں بلایا اور آپ دفتر چلے گئے۔ ہم سے ان بڑی بی سے بہت دیر تک باتیں ہوا کیں۔ شام کو چار بجے جب وہ اسٹوڈیو سے لوٹے تو کیا دیکھتی ہوں آپ بھاگے بھاگے ساتھ دو چار پائیاں لوائے چلے آرہے ہیں۔

میرے منہ سے نکلا ''آپ پھر بھیگتے ہوئے آرہے ہیں۔ کون سی ایسی چار پائی کی جلدی تھی۔''

آپ ہنس کر بولے ''یہ کیوں نہیں پوچھتیں کہ تمھاری چھتری کیا ہوئی؟''

میں نے کہا "واقعی میں میری چھتری کہاں گئی؟"

آپ بولے "مجھے جلدی تھی کہ چار پائی بھی ساتھ میں لیتا چلوں' اسی جلدی میں چھتری دفتر ہی میں رکھی بھول گیا۔"

میں بولی "ایسی کیا جلدی تھی کہ پانی برس رہا ہے اور آدمی چھتری ہی لینا بھول جائے۔ یہ تو کوئی تک نہیں ہے۔"

"تک کیوں نہیں ہے" انھوں نے ہنس کر کہا "دو مہینے بمبئی میں اکیلے رہتے رہتے جو آدمی گھبرا گیا ہو اس کے گھر میں اگر بی بی بچے آجائیں گے تو اسے خوشی نہیں ہوگی؟ اسی خوشی میں بھول ہوگئی۔ پھر گھر بار کا انتظام بھی کرنا تھا' چار پائیاں آپ لوگوں کے لیے ہی تو لینے گیا تھا۔"

میں بولی "یہ تو اچھی خوشی ہے کہ تاوان کے اوپر تاوان پڑے پھر بھی کہیں خوشی ہے۔"

"تم تاوان پر تاوان کہتی ہو یہاں شادیوں میں ہزاروں کے وارے نیارے لوگ کرتے رہتے ہیں۔ آتش بازی اور راگ رنگ میں' اور جس میں ان کا دھتا کیا ہے؟ (مخفف) ایک بیوی پھر میرے گھر میں تو آج تم ہو بیٹی ہے' گیانو ہے' تین آدمی آنے ہیں۔ تب بھی نہ خوش ہوؤں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ایسا بدقسمت ہوں کہ مجھے کسی بات میں خوشی نہ ہو۔ میں ایسا نہیں ہوں' مجھے جو کچھ ایشور دیتا ہے' میں اس میں خوش ہوں۔"

میں بولی "تب ہی تو ایک مزے کا مسئلہ ہے کہ

چھوٹے چھوٹے دولہا پھرتے ہیں ہوت ہمارو بیاہ

پاؤں بیڑی پڑت ہے ڈھول بجانے بجائے

یہی مسئلہ آپ پر لاگو ہوتا ہے۔

آپ بولے "مجھ ہی پر کیوں لاگو ہو سو میں نیابے (ننانوے) ایسے ہیں۔ تمھارے یہاں کے رشی منی بھی اپنے دل سے عاری نہیں ہوں گے جو اس کو بیڑی سمجھتے۔ پھر میں تو ایک معمولی آدمی ہوں' میں تو خوش ہوں گا ہی۔ روز جب گھر آتا تھا تو لگتا تھا گھر میں ماتم چھایا ہوا ہے۔ آج گھر میں کافی چہل پہل ہے۔"

آپ کپڑے بھی بدل نہ پائے تھے کہ گیانو' بابو جی' بابو جی' کہتا آپ کے پاؤں پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آپ کسی طرح کمر میں دھوتی باندھتے ہوئے بولے "ارے بدمعاش دھوتی تو بدل لینے دے" اور اس کو گود میں لے لیا۔

تب تک بٹی نے اندر سے ناشتہ لا کر میز پر رکھ دیا۔ خود بھی کھاتے جاتے تھے اور تھوڑا تھوڑا بچے کے منہ میں بھی دیتے جاتے تھے۔ ساتھ ہی میں مجھے بھی ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر میری طبیعت کوئی پندرہ دن تک کھوئی کھوئی سی رہی لگتی ہی نہیں تھی۔

اس کے بعد جب آپ کھانا کھا رہے تھے اسٹوڈیو سے کئی دوست ملنے کے لیے آئے۔ اپنی بیویوں کے ساتھ تھے نوکر کھانا بنا رہا تھا۔ آپ کھانا کھا رہے تھے۔ گیانو بھی ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پاس ہی میں بھی بیٹھی کچھ گپ شپ کر رہی تھی۔ وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے اور سیدھے چوکے (باورچی خانے) میں چلے آئے۔ اور سب بڑی زور سے ہنس کر بولے "اچھا! آپ اس طرح کھانا کھلاتی ہیں۔ تب ہی تو آپ کی غیر حاضری میں یہ بھر پیٹ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ تب ہی تو ہم لوگ ان سے پوچھتے تھے کہ آخر وہ آپ کو کیسے کھانا کھلاتی ہیں۔"

میں نے جواب دیا "کچھ نہیں جی۔ آپ ہمیشہ بچوں کے ساتھ رہے ہیں اس واسطے آپ کو بغیر بچوں کے کھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔"

گیانو پاس بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ لوگ بولے "یہ آپ کا چھوٹا بچہ ہے؟"

آپ نے کہا "یہ میری لڑکی کا لڑکا ہے۔"

وہ لڑکی کا لڑکا والی بات نہیں سمجھ پائے۔ اس پر آپ نے کہا "گرلز سن۔"

اب آپ کھانا کھا چکے تھے۔ سب کو لے کر مردانے کمرے میں گئے۔ کچھ دیر تک اسی طرح گپ شپ ہوتی رہی۔ وہ لوگ باتیں کرتے تھے، مجھے جھینپ معلوم ہوتی تھی۔"

جب وہ لوگ چلے گئے اور آپ اور میں رہ گئے میں بولی "آپ بھی خوب ہیں ان لوگوں سے ایسی باتیں آپ کیوں کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہہ رہے تھے اور مجھے جھینپ ہو رہی تھی۔"

آپ بولے "اس میں جھینپ لگنے کی کون سی بات تھی۔ یہ لوگ تو صاحب ہیں۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ گھر گرہستی آدمی کیسے رہتے ہیں۔ ارے ان لوگوں میں تو جو نوکر نے بنا کر صاحب لوگوں کے سامنے رکھ دیا وہ یہ کھا لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ جب گھر کی عورتیں کھانا پکاتی ہیں اور اپنے ہاتھوں سے پروس کر کھلاتی ہیں اس میں کتنا پیار رہتا ہے اور اس کھانے میں کتنا ذائقہ ہوتا ہے

۔ان لوگوں کے جیون میں تو جتنے کام ہوتے ہیں وہ سب ہوا ہی پر ہوتے ہیں اور اسی جیون میں یہ خوش بھی رہتے ہیں اور صاحبیت کے پیچھے تو جیسے جی جان سے پڑ گئے ہیں اور بھارت کی تہذیب سے جیسے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔''

میں نے کہا'' تو وہ بھی آپ کو جاہل یا گنوار سمجھتے ہوں گے۔''

آپ بولے'' وہ کچھ بھی سمجھیں مگر وہ خود انسانیت سے بہت دور جا رہے ہیں۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ گھر کی روکھی روٹیوں میں جو لذت ہے وہ چاہے کتنے ہی اچھے ہوٹل میں اچھے سے اچھا کھایا جائے اس میں لذت نہیں مل سکتی۔''

میں بولی'' کچھ بھی ہو۔ میری ہنسی اڑواتے ہیں جو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ گھر کی بات گھر تک ہی رہنی چاہیے۔''

آپ بولے'' گھر تک ہی رکھنے میں ہمارے اس آنند کو یہ لوگ کبھی خواب میں بھی نہیں پا سکتے۔ اور ان لوگوں میں کیا ہے؟ عورت، مرد یا گھر کے دوسرے آدمی جیسے کہ بھاڑے کے ٹٹو ہوں، اپنے اپنے کام سے آئے، کھانا کھایا اور کھا کھا کر پڑ رہے۔ اس کو بورڈنگ ہاؤس یا ہوسٹل جو چاہے کہہ سکتی ہو۔ اگر ان لوگوں کے لیے کوئی راحت جاں چیز ہے تو وہ ہے روپیہ۔ ان کے پاس پریم اور محبت کے لیے مطلق علاقہ نہیں۔ جیسے سب کے ساتھ رہنے کی خوشی نہیں اور جدائی کا کوئی رنج نہیں۔''

دسہرے کی تعطیل میں لڑکوں کا جبل پور سے تار آیا' ہم لوگ آ رہے ہیں' تار میں وادر اسٹیشن لکھ دیا تھا۔ رات ہی کو تار ملا تھا' آپ مجھ سے کہنے لگے'' صبح اسٹیشن جانا ہے۔ صبح کی ٹرین سے دھنو' بنو آ رہے ہیں''۔

میں بولی'' صبح؟''

'' ہاں' ہاں گاڑی پر سے تار دیا ہے۔''

آپ صبح ہاتھ منہ دھو کر تیار ہوئے تھے۔ میں جیسے ہی نہا کر باتھ روم سے نکلی ویسے ہی بیٹی بولی '' صو بیدار بھیا مر گئے۔''

مجھے معلوم تھا کہ آپ صبح بچوں کو لینے اسٹیشن جا رہے ہیں۔ ان کی میز پر پیسے رکھتی ہوئی میں نیچے اتر گئی۔ وہاں دیکھا کہ عورتوں مردوں کی کافی بھیڑ لگ گئی ہے اور سب رو رہے ہیں۔ میز پر پیسے اسی طرح چھوڑ کر آپ بھی نیچے اتر آئے۔ کوئی ایک گھنٹے تک وہ بھی کھڑے روتے رہے۔ اس کے بعد

اسٹیشن گئے۔ وہاں سے بچوں کی ٹرین پہلے ہی نکل چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ بچے نہیں آئے۔ آپ لوٹ آئے، مگر پریشان تھے کہ گاڑی پر سے تار دیا، آخر بچے گئے کہاں؟ اسی پریشانی میں نوکر سے کہا ''ذرا تم تو جا کر دیکھو کہیں بچے اسٹوڈیو تو نہیں پہنچ گئے''۔

نوکر اسٹوڈیو گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ شری پت رائے (دھنو) دادر کے اسٹیشن پر ہیں۔ نوکر کو بچے کا حلیہ بتا دیا تھا۔ نوکر گیا اور اس کو ساتھ لے کر آیا۔ تب جا کر آپ نہائے اور کھانا کھایا۔ مجھ سے بولے'' میری طبیعت بہت پریشان تھی کہ آخر بچے گاڑی سے کہاں چلے گئے''۔

چار پانچ روز بعد ہمارے داماد کا تار آیا۔ وہ بھی آ رہا تھا۔ شام کو دھنو سے بولے'' بھائی تم جانا، صبح جا کر اپنے جیجا کو لوا لانا۔ میں تو تم لوگوں کو لینے گیا تھا اور تم لوگ ملے ہی نہیں۔ اب تم ہی جا کر ان کو لوا لانا''

میں نے کہا'' نیا شہر ہے، کہیں یہ بھی نہ کھو جائے اور دو جنوں کو ڈھونڈنا پڑے۔'' آپ بولے'' نہیں دھنو اتنا بے وقوف نہیں ہے۔''

اور ہوا بھی یہی کہ جب دھنو لینے گیا تو وہ بھی نہیں ملے۔ وہ بھی سیدھے اسٹوڈیو پہنچے تھے۔

آپ نے جب دھنو کو دیکھا تو بولے'' اچھا تم نے بھی وہی کیا جو میں نے کیا تھا''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اسی بیچ میں آپ بولے'' چلو بھائی چھجے پر کھڑے ہوں۔ اگر آتے ہوں گے تو دیکھ تو لیں گے۔''

خیر جس کے لیے وہ لوگ کھڑے ہوئے تھے اس کو اتفاق سے دیکھ لیا۔ دھنو کو نیچے دوڑایا اور آپ نے اوپر سے آواز دی'' آؤ یہی مکان ہے۔''

جب اوپر وہ بھی آ گئے تو آپ بولے'' نہ معلوم تم لوگ کیسے آتے ہو۔ اس دن دھنو بنو کو لینے میں گیا تب وہ دونوں نہیں ملے، آج وہ دونوں تمھیں لینے گئے تم نہیں ملے۔''

'' میں تو گاڑی سے اترنے کے بعد اسٹیشن کے باہر کچھ دیر تک کھڑا رہا تھا، اس کے بعد اسٹوڈیو چلا گیا تھا۔ اسٹوڈیو کے آدمی محلہ تو جانتے تھے مگر مکان ان کو بھی نہیں معلوم تھا۔ ایک دفعہ میں اسی دروازے کے سامنے سے گزر چکا ہوں، دوبارہ پھر لوٹا۔ وہ اتفاق سے آپ نے (اس بار) دیکھ لیا''۔

آپ بولے'' رام رام۔ ناحق کی پریشانی تم لوگوں کو ہوئی''۔

میں بولی'' ان لوگوں کو پریشانی تھی تو آپ کون سے کم پریشان ہوئے۔ یہ دادر کا اسٹیشن بھی لکھنؤ کی بھول بھلیاں ہو گیا کہ جو اس میں جاتا ہے گم ہو جاتا ہے۔''

تین روز تک بچوں کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد دونوں بچے الہ آباد چلے گئے۔

کانگریس ہونے والی تھی

پہلے دن ہم چاروں دیکھنے گئے۔ آپ کے پاس ٹکٹ پہلے ہی سے خریدا ہوا تھا۔ ہم لوگوں کے لیے ٹکٹ لانے تھے۔ مجھ سے بولے۔

”مجھے روپے دو تو میں تین آدمی کے لیے تین ٹکٹ اور لے لاؤں۔“

میں نے ان کو روپے دیے۔ واسودیو پرساد ان کے ہاتھ سے روپے لے کر خود ٹکٹ لایا۔ پہلے دن تو ہم ماں بیٹی زنانے میں گئیں اور اسی کے پاس ہی آپ کی بھی جگہ تھی۔ واسودیو پرساد باہر کی طرف تھے۔

خیر اس دن تو ہم ساتھ ساتھ رات کے بارہ بجے گھر لوٹے۔ چاروں آدمی رات کو گھر آئے۔ دوسرے دن میں بیٹی واسودیو پرساد ایک جگہ بیٹھے آپ اندر تھے۔ اس دن جب مہاتما جی کا کہا پڑھا جا رہا تھا کچھ لاؤڈ اسپیکر میں خرابی ہوئی اور اسی وقت بھگدڑ مچی۔ آدمی کود کود کر آگے بڑھنے لگے۔ اس سے میں بیٹی بیچ میں بیٹھی تھی۔ ساتھ میں گیا تو بھی تھا۔ جب بھگدڑ مچی تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو آدمی ادھیڑ عمر کے مجھ سے بولے ”ماتا جی۔ آپ بیٹھ جائیے۔ وہ دونوں آدمی میری اور بیٹی کی طرف جھک گئے۔ میرے خیال میں سیکڑوں جوتے ان دونوں شریفوں کی پیٹھ پر پڑے ہوں گے۔ میں ان کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی اور جیسے ہی بھیڑ چھٹی ویسے ہی وہ بھی غائب ہو گئے۔

اسی وقت میں اور بیٹی گھر چلے آئے۔

آپ جب قریب بارہ بجے گھر لوٹے تو تعجب سے بولے ”تم پہلے ہی کیسے چلی آئیں؟“

میں نے ان کو سارا قصہ سنایا اور کہا ”آج خیریت ہوئی کہ ہم لوگ گھر چلے آئے نہیں تو بری طرح زخمی ہو گئے ہوتے یا پھر ہم میں سے ایک آدھ مر ہی گیا ہوتا۔

آپ بولے ”یہاں کے لوگ ایسے جاہل ہیں کہ جب تک دھکم مکم نہ کر لیں تب تک ان کی تسکین ہی نہیں ہوتی ہے۔ ذرا بھی خیال نہیں کہ اس سے کیا فائدہ کیا نقصان ہوگا۔ میں نے تو سنا ہے کہ دوسرے ملکوں میں ٹکٹ گھر سے ایک ایک آدمی نمبروار ٹکٹ لینے جاتا ہے۔ اگر وہاں پر لوگ اس طرح کی بے ہودگی کریں تو شاید جیلوں کی ہوا کھائیں۔ مگر یہاں ان سے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہے“۔

میں نے کہا ''مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی کالج کے لونڈے ہیں۔''

آپ بولے ''جی ہاں' یہاں کا پڑھا لکھا آدمی بھی اسی طرح گنوار پن کر بیٹھتا ہے اور اسی طرح غیر ذمے داری کا ثبوت دیتا ہے جیسے کوئی جاہل اور گنوار۔''

میں بولی ''تو آخر یہ بڑی بڑی ڈگریاں لینے کا فائدہ کیا؟''

آپ بولے ''وہ بڑی بڑی ڈگریاں تھوڑی ہوتی ہیں' وہ تو ایک طرح سے غلامی کا طوق ہیں۔ یہ لوگ اپنے افسروں کے سامنے تو بھیڑ بن جاتے ہیں اور وہ جیسے چاہیں ان کو نچا سکتے ہیں مگر باقی جگہوں میں تو یہ شیر بن جاتے ہیں اور جو کوئی پوچھے کہ خدا پرستی کا طور طریقہ بھی انسان میں ہے یا نہیں تو شاید نہیں کہنے کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکیں۔ کیونکہ جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں پر عورتیں اور بچے بیٹھے ہیں اور پھر بھی انھوں نے وہاں پر بھگدڑ مچائی تو یہ اسی طرح ہوا جیسے کانگریس تحریک کے زمانے میں پولیس والے مجمع پر گھوڑے دوڑا دیتے تھے۔ مگر اس وقت تو سرکار ہمیں کچلنا چاہتی تھی اور اس لیے ایسا کرتی تھی۔ اور یہاں؟ یہاں تو یہ لوگ مہاتما جی کا درس سننے کے لیے عورتوں اور بچوں کو کچل رہے ہیں۔ اب ان کو کیا کہوں؟ پھر وہ بھی تو ہیں جنھوں نے تمھارے لیے جوتے کھائے ہیں۔ اب کون جانے کتنے عورتیں بچے کچلے گئے ہوں گے۔ اور انہی بے چاروں کا' جنھوں نے تمھارے لیے جوتے کھائے ہیں' آج کیا حال ہوگا۔ اس پر بھی انھوں نے تم سے شکریے کے دو بول بھی نہیں چاہے۔ اس طرح کی حالت دیکھ کر تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ تمھارے یہاں کا سماج دو رستوں پر جا رہا ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو کچلنے والے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو کچلے جاتے ہیں۔''

میں نے کہا ''یہ طور تو ہمیشہ سے تھا' اور ہمیشہ رہے گا۔''

آپ بولے ''کل ہمارے ساتھ چلنا اور ہمارے ہی پاس بیٹھنا۔''

''نہیں اب میں نہیں جاؤں گی'' میں نے کہا'' کیونکہ یہ حالت دیکھ کر تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ خیر ہم بڑوں کی تو کچھ بات نہیں لیکن اگر کہیں گیانو کے لگ جاتی تو کیا ہوتا۔''

''تو تمھارا بیس روپے کا ٹکٹ کیا مفت برباد جائے گا؟''

''صاحب ابھی تو بیس روپے کا ٹکٹ ہی برباد جائے گا اگر جلسے میں کہیں چوٹ کھاتے تو کیا معلوم کیا حالت ہوتی۔''

آپ بولے ''اچھا اگر تمہارا من نہیں چاہتا تو مت چھوکر میرے پاس بیٹھنے میں تو کوئی دقت نہ ہوگی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ مہاتما جی کو معلوم ہو کہ ان کا درس سننے کے لیے پنڈال میں اتنی بے ہودگی ہوتی ہے۔تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کو سات دن کا انشن (روزہ) کرنا ہی پڑے گا۔''

میں بولی ''ان بے چاروں کے ہاتھ میں اور اس کے سوا ہے ہی کیا۔ وہ سب کچھ کرتے رہتے ہیں مگر یہ چپٹنے بھی دیں میرا تو خیال یہ ہے کہ ایسا مہاتما کسی دوسرے ملک میں ہوا ہوتا تو وہاں کے لوگ ہمارے یہاں کے لوگوں سے کہیں آگے ہوتے۔''

آپ بولے ''اگر ملک بنا بنایا ہو تو اسے بنانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ایسی ہی حالت میں تو کوئی نہ کوئی مہاتما یہاں ہمیشہ سے ہوا ہے۔ اسی طرح جیسے رام' کرشن' بدھ' عیسیٰ' محمد کا جنم ہوا تھا۔ ایسے ہی حالات ان سب زمانوں میں رہے ہوں گے۔ اس زمانے میں بھی تو ایسی ہی ہستیوں نے جنم لیا تھا اور لوگوں کو اوپر اٹھایا۔ بالکل اسی طرح مہاتما جی بھی آئے۔''

میں بولی ''تو کون سے مہاتما جی ہی سے لوگ نہیں لڑتے اور خوش ہیں۔''

آپ بولے ''کوئی زمانہ تھا جب لوگوں نے عیسیٰ کی ہتھیلیوں میں کھونٹیاں ٹھکوائی تھیں' محمد صاحب کو پرتی کے لیے پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ رام اور کرشن کو بھی کتنی ہی لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں۔ بدھ کے بھی کافی دشمن تھے۔ اب اگر گاندھی جی ٹھیک ہے تو ان کو بھی کافی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور آخیر میں گاندھی جی کی فتح ہوئی۔''

میں نے کہا ''جب ہوگی تب ہوگی' آج کی تو مصیبت ہی مصیبت ہے۔''

آپ بولے ''سچ پوچھا جائے تو زندگی ہی تصادم ہے۔ اگر تصادم نہ ہو تو زندگی کیسی۔''

میں بولی ''پتہ نہیں کیوں اس ٹکراؤ کو دیکھ کر تو میری طبیعت گھبرا جاتی ہے۔''

''ٹکراؤ سے حیرانی ہو اور خود بھی کبھی تمہاری خواہش بھی تو ٹکراؤ کے لیے ہوتی ہے۔''

میں نے کہا ''میں تو ٹکراؤ کو دور سے نمسکار کرتی ہوں۔''

آپ بولے ''تم عورت ہونا۔ عورتوں میں یہ باتیں اکثر پائی جاتی ہیں۔ اور مرد؟ مرد سنگھرش سے نہیں گھبراتے۔''

میں بولی ''مرد کیوں گھبرانے لگے۔ وہ تو خود ہی سنگھرش کے لیے خم ٹھونکتے رہتے ہیں۔''

''اگر مرد مقابلے سے گھبرائے تو وہ بزدل ہے۔'' آپ بولے۔

میں بولی'' یہ سب تو شاید کانگریسی لوگوں کی کہنے کی باتیں ہیں۔''

آپ بولے'' باتیں نہیں ہیں' یہ ان کی دل کی تڑپ ہے۔اس کے لیے ان کی آتما ہمیشہ تڑپتی رہتی ہے۔ ناانصافی کرنے والے کر جاہے وہ ناانصافی ہمارے ساتھ کرے چاہے دوسرے کے جرأت مند شخص کبھی دیکھ نہیں سکتا۔ وہ پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ کرے۔''

....

بمبئی جانے کے بعد دو تین ہی مہینے رہنے پر معلوم ہوا کہ جو کہانی انھوں نے تیار کی تھی حالانکہ اس میں کافی کاٹ چھانٹ کی جا چکی تھی پھر بھی سنسر بورڈ کے ہاتھوں روک دی گئی تھی۔ اس کو دیکھنے کے بعد ان کو ایسا معلوم ہوا کہ یہاں میں جس کام کے لیے آیا ہوں وہ پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ مجھ سے بولے۔

'' یہاں جو کچھ ہے وہ سنیما کے مالک لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ لکھنے والے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ وہ تو بس پیسہ کمانا چاہتے ہیں۔''

میں بولی'' لکھنے والوں کو تو ان سے پوچھنا چاہیے ہی کہ آخر ان کی چیزوں کی اتنی کاٹ چھانٹ کیوں ہو۔''

آپ بولے'' تو اس کو سنتا کون ہے۔''

میں بولی'' اگر کوئی سنتا نہیں ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ اچھے قلم کاروں کو ایسے کاموں کو اپنے ہاتھ میں لینا ہی نہیں چاہیے۔''

آپ بولے'' میں بھی دو چار مہینے اور دیکھتا ہوں۔''

میں بولی'' آپ کو ان لوگوں سے کہنا چاہیے''۔

آپ بولے'' وہ کہیں گے کہ آپ جا سکتے ہیں' ہم آپ کے پیچھے لاکھوں روپے برباد نہیں کر سکتے۔ پھر جس دن ہم کو جانا ہوگا اس دن جواب دے کر جا سکتے ہیں۔ یہاں کہنا سننا کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

میں نے کہا'' اسی لیے تو میں بنارس میں پہلے ہی سے منع کرتی تھی اور آپ مجھ سے کہتے تھے۔ وہاں اچھی اچھی فلمیں لوگوں کو دکھلاؤں گا۔ اور جو فائدہ ناول اور کہانیوں کے ذریعے نہیں اٹھایا جا سکتا وہ فلم دکھا کر بڑی آسانی سے ان لوگوں کو پہنچے گا۔ پھر وہ باتیں کہاں گئیں؟''

آپ بولے ''اس کے پیچھے کوئی کہاں تک پڑا رہے گا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا کہ میرے لیے سب سے اچھا یہی ہے کہ اپنے گھر بیٹھ کر تھوڑا بہت جو کام میں کر سکتا ہوں اسی کو کرتا رہوں۔ یہاں پر تو وہ کام بھی نہیں ہو سکتا۔''

ان دنوں ان کی طبیعت بھی کچھ کچھ خراب رہتی تھی۔ کبھی بخار تو کبھی زکام وغیرہ لگا رہتا تھا۔

میں بولی ''تو تم چلے چلیے اپنے گھر۔''

آپ بولے ''ایک دم یوں کا بھی تو نہیں جاتا۔ اس دن جو ایک جراتی صاحب فلم دکھلانے کو لائے تھے تو یاد ہے کتنی گندی تھی اور خود تم ہی ان صاحب پر بگڑ گئی تھیں اور تب سے فلم دیکھنے کا نام بھی نہیں لیتی ہو۔ میں سوچتا ہوں کہ شاید میں فلم کے بارے میں کچھ سدھار کر سکوں تو وہ بہتر ہوگا۔ اور میرے یہاں کھڑے ہونے سے تو سدھار نہیں ہو سکتا۔ سدھار بھی نہیں ہوگا اور فلم مالکوں کا میرے چلے جانے سے کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔ ہاں میرا نقصان ہوگا کہ میں جو سدھار کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کر پاؤں گا۔''

میں بولی ''تو آپ کی صحت بھی تو اچھی نہیں رہتی۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ اگر طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو یہاں پردیس میں کیا کروں گی۔''

آپ بولے ''کچھ نہیں یہ باتیں تو ہر جگہ لگی رہتی ہیں۔ آج کل تو دیکھتی ہو کہ میں گھومنے بھی جانے لگا ہوں؟''

میں نے کہا ''گھومنا تو آپ کا بنارس میں بھی جاری رہتا تھا۔ وہاں بھی آپ دس بجے اٹھ کر گھومنے جاتے تھے یہ تو آپ کا ہمیشہ ہی کا کام ہے۔ دس بجے اٹھ کر کم سے کم پانچ دس میل تو آپ گھوم ہی لیتے تھے۔ وہ یہاں بھی ہے۔ مگر یہ پانچ دس میل گھوم کر آپ ہر جگہ آرام سے رہتے تھے وہ بات یہاں نہیں ہے۔''

''یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

انھی دنوں ہمارے گھر میں ایک نوکر تھا جو میرے بمبئی پہنچنے سے پہلے رکھا گیا تھا۔ اسے تمام کاموں کے لیے رکھا گیا تھا۔ وہ اکثر روٹی پکانے کے وقت غائب ہو جاتا تھا۔ دو تین روز برابر وہ پہلے غائب ہو چکا تھا۔ آپ نہا کر جب آتے تو روٹیاں میں سینک کر کھلاتی۔ ایک روز میں بولی ''نہ جانے یہ نوکر کہاں چلا جاتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔''

آپ بولے ''کہیں چلا گیا ہوگا۔''

''آج ہی کیوں'' میں نے کہا'' آپ تین روز سے دیکھ رہے ہیں۔ اور اس سے پہلے بھی یہ ایسی حرکت کر چکا ہے۔ میں آج اسے نکال دوں گی۔''

آپ میرے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے بولے ''اچھا اس بار جانے دو' میں اس کو سمجھا دوں گا۔''

میں بولی ''اگر سمجھانا تھا تو کئی بار تو کہہ چکے' پر فائدہ کیا ہوا؟''

آپ نے پھر کہا ''اچھا اب کی بار رہنے دو۔ اگر پھر بھی یہ ایسا کرے تو نکال دینا۔''

خیر اس دفعہ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور آپ نے اس کو سمجھایا۔ پندرہ بیس دن وہ ٹھیک رہا' پھر وہی حرکت۔ اس دفعہ میں نے دوبارہ اس کو جواب دے دیا۔ وہ دو تین دن ہمارے مکان ہی کے نیچے رہتا رہا۔

آپ بولے ''وہ ابھی کہیں گیا تھوڑی ہے۔''

میں نے پوچھا ''پھر؟ آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟''

آپ بولے'' کچھ نہیں۔ غریب آدمی ہے بھوکوں مرتا ہوگا۔''

میں نے کہا ''اگر بڑی دیا کرنی ہے تو آپ اسے کچھ دے سکتے ہیں مگر میں اس کو نوکر نہیں رکھوں گی۔''

آپ بولے ''ہاں تم نے تو مجھ سے پہلے ہی وعدہ کرالیا تھا۔''

''بس میں بار بار کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ پڑا رہنے دو۔''

جو دوسرا نوکر رکھا گیا اس سے میں کھانا نہیں پکواتی تھی۔ خود ہی پکاتی۔ پندرہ بیس دن بعد کھانا کھانے کے سمے بولے ''خیر جب سے نوکر گیا تب سے صاحب بننے سے تو گلا چھوٹا۔ ہم دو آدمی رہتے ہیں' اپنا کھانا پکایا' کھایا' گپ شپ بھی ہوئی نہیں تو صاحب بنتے بنتے میرا ناکوں دم آ گیا تھا۔

میں نے کہا'' نکالتے وقت تو آپ ہی چلا رہے تھے اور اب کہتے ہیں کہ صاحب بنتے بنتے ناک میں دم آ گیا تھا۔''

آپ بولے ''جن لوگوں کے درمیان رہنا ہوتا ہے انہی کی طرح خود بھی تو بننا پڑتا ہے' چاہیں ہم بننا چاہیں یا نہ چاہیں مگر بننا ضروری ہو جاتا ہے۔ پھر یہ خیال بھی تھا کہ یہ بے چارہ جائے گا کہاں؟ آخر وہ کئی دن سے تمھارے ہی دروازے پر تو پڑا تھا۔''

میں بولی ''تو اس کے پیچھے میں کیا کروں؟ آپ کس کس کو دیکھیں گے؟''

''ہاں چلا تو گیا بے چارہ'' انھوں نے کہا۔

''تو جانے دیجیے'' میں نے کہا۔

آپ بولے'' مجھے اس پر بھی شرم آتی ہے کہ اگر کوئی بھلا مانس آ جائے تو اپنے دل میں تو وہ یہی سوچے گا کہ اچھے بھلے آدمی ہیں کہ ایک رسوئی دار تک نہیں رکھ سکتے۔''

میں نے کہا''تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا کھانا پکانا کوئی جرم ہے؟''

آپ بولے''جس سماج میں رہتے ہوں اسی سماج کا بن کر رہنا چاہیے۔''

میں بولی'' آپ ہی تو کہتے ہیں کہ جو کام بڑے لوگ کرتے ہیں ان کی دیکھا دیکھی ہی چھوٹے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ہمیشہ نوکر رہتے ہوئے بھی آپ اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ تب کیا میرے لیے بھی سب سے زیادہ ضروری ہے کہ رسوئیا (باورچی) رکھوں۔''

اس پر آپ ہنسنے لگے اور بولے''ہاں تمھارے لیے ضروری ہے۔ مرد خود مزدور بن سکتا ہے پر اپنے گھر میں عورت کو مزدور نما بنانا پسند نہیں کرتا۔ اب ادھر چاہے جو کچھ ہو رہا ہو مگر پہلے انگریزوں کے یہاں بھی وہ اپنی عورتوں کو نوکری نہیں کرنے دیتے تھے۔

میں نے کہا''میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ یہاں بھی کافی عورتیں نوکری کرنے لگی ہیں۔''

آپ بولے''نوکریاں تو کرنے لگی ہیں مگر وہ اچھا نہیں ہے میں اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ اس کا نتیجہ کیا سامنے آ رہا ہے؟ اب مرد اور عورت جو دونوں نوکریاں کرنے لگے تو اس کے معنی کیا ہیں؟ روپے زیادہ آئیں گے۔ مگر اس کا تو یہ پھل ہے کہ مردوں کی بے کاری بڑھ رہی ہے۔''

میں بولی'' کچھ ہو۔ عورتوں کی کچھ اپنی کمائی تو رہتی ہے۔''

آپ نے کہا'' یہ کمائی کا سوال ابھی تھوڑے دنوں سے اٹھا ہے نہیں تو پہلے عورتوں کی کمائی ایک پیسہ نہیں ہوتی تھی اور عورتیں بڑے دبدبے سے گھر پر حکومت کرتی تھیں۔ کیا اس زمانے میں وہ کمائی کرتی تھیں؟''

میں نے کہا'' اب تو اپنی کمائی کا پیسہ مرد اپنے پاس رکھے رہتے ہیں جب ان بے چاریوں کو ضرورت ہوتی ہے تو مردوں سے مانگنا پڑتا ہے۔ اور ان کی اگر مرضی ہوئی تو کبھی کچھ دے دیا ورنہ انکار کر کے ہٹ گئے۔ ایسی صورت حال میں تو میری رائے یہی ہے کہ دونوں کمائیں۔''

آپ بولے ''جب ایسے مرد ہو رہے ہیں تو تمھارے دیش کے کچھ اچھے لچھن نہیں ہیں۔''

''اچھے ہوں یا برے'' میں نے کہا ''دیکھنا تو یہ ہے کہ اس وقت ضرورت کس بات کی ہے۔''

آپ بولے ''ضرورت تو اس وقت معلوم ہو رہی ہے مگر یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دیش میں کچھ ہی عورت مرد ایسے ہیں جو ایک کی کمائی پر دوسرا گزر کرتا ہے۔ چھوٹی ذات والوں اور کاشت کاروں میں دیکھ لو دونوں برابر کی محنت کرتے ہیں' بلکہ عورتیں کچھ مردوں سے زیادہ ہی کام کرتی ہیں پھر بھی جو مرد بدمعاش ہیں وہ اپنی عورتوں سے پیسہ بھی چھین لیتے ہیں اور ان پر حکومت بھی کرتے ہیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کیسے دونوں کو ہم پلہ کیا جائے۔ اور بدمعاشوں کو کیسے ٹھیک کیا جائے۔ اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتیں مضبوط ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کو وہ حقوق مل جائیں جو سب مردوں کو ملے ہوئے ہیں۔ جب تک تمام عورتیں طاقتور نہیں ہوں گی اور تمام حقوق ان کو مردوں کے برابر نہیں مل جاتے ہیں تب تک محض برابر کام کرنے ہی سے بات نہیں بنے گی۔ قانون مرد عورت دونوں کے حق میں برابر کا ہو۔''

میں نے کہا ''آخر یہ سب کیسے ہوگا''؟

آپ بولے ''سب دھیرے دھیرے ہوگا۔ اس سماج کو بگڑتے بگڑتے ایک زمانے ہوا۔ اسی طرح اس کو بننے میں بھی ایک عرصہ لگے گا۔''

''تو کیا تب تک عورتوں کا رونا اسی طرح لگا رہے گا!'' میں نے پوچھا۔

آپ بولے ''سب ملکوں میں بدمعاش ہی نہیں نکلیں گے اور نہ سب بدمعاش ہیں۔ اب بھی کچھ لوگ اپنے گھر میں عورتوں کی پوجا کرتے ہیں' اور میرا تو خیال یہ ہے کہ شاید منوسمرتی جو پہلے پہل بنی تھی وہ اس بنیاد پر بنی تھی کہ عورتوں کو مرد اپنے سے بہت اونچا رتبہ دیتے تھے۔ منوسمرتی میں ماں کا حق پتا سے دونا رکھا گیا ہے۔ عورت کے بنا کوئی کام مرد اکیلا نہیں کر سکتا تھا۔ بھائی بھائی چاہے لڑ کر مر جائے لیکن بہن سب بھائیوں کے لیے برابر رہتی تھی۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ عورتوں کو سب سے بالا مانتے تھے۔''

میں بولی ''پہلے تو سب ٹھیک تھا' اب کتنے بھائی ہیں جو بہن کو پیار کرتے ہیں' اور کتنے بیٹے ہیں جو ماں کی پوجا کرتے ہیں اور دوسری طرف اس بات پر بھی غور کیجیے کتنے شوہر اپنی بیویوں کی جوتے سے پوجا کرتے ہیں۔''

آپ بولے ''تو انھی کے لیے تو ضرورت ہے کہ عورتوں کو قانونی حقوق مردوں کے برابر ملیں۔ میرا خیال ہے گاندھی یگ میں عورتوں کی کافی ترقی ہو رہی ہے اور اس سے زیادہ ہونے کی امید ہے۔''

میں بولی'' شاید ہم لوگوں کے مرنے کے بعد کچھ ہو۔''

آپ بولے''اس کے لیے پھر بھی تو تم لوٹو گی۔ پھر بھی تمھاری خواہشیں اسی میں لگی رہیں گی۔''

میں بولی'' کب سے آپ پُنر جنم کو ماننے لگے؟''(مرنے کے بعد دوسرے جنم میں دوبارہ پیدا ہونا)

آپ بولے'' میں نہیں مانتا تو کیا ہوا' تم تو مانتی ہو۔ جس طرح تم پنر جنم کو مانتی ہو اسی طرح تمھارے ساتھ خواہشیں بھی لگی رہیں گی۔''

میں نے کہا'' آپ نے خوب یہ نئی بات پیدا کی۔''

ہم لوگ ۱۹۳۴ء میں بمبئی میں تھے۔

....

ایک بار ہم بنارس سے بمبئی جارہے تھے۔ دو دن کا سفر بٹی شرم کے مارے ان کے سامنے لیٹی نہیں تھی۔ دو رات اور ایک دن بابو جی ہی اپنے پاس گیا کو ر کھے رہے۔ دو دو گھنٹے پر اسے دودھ پلاتے۔ مجھ سے بھی پلانے کو نہ کہتے۔ جب ہم بمبئی پہنچ گئے تو بٹی بچے کو لے سکی۔

چار مہینے کے بعد واسود یو پرساد آئے اور بٹی کو لوا لے گئے۔ اس کے جانے سے پہلے مجھ سے کہتے ''گیا نو کیوں جائے گا ہم دونوں کو گھر سونا بھی تو بہت لگے گا۔''

وہ بچہ ان سے اتنا ہل گیا تھا کہ وہ جب اسٹوڈیو گئے ہوتے اور وہ وہاں سے ان کی واپسی کا وقت قریب ہوتا تو جا کر کرسی پر بیٹھ جاتا اور بابو جی تو کہہ نہیں سکتا تھا' بابو ئی' کر کے زور زور سے پکارتا۔ جیسے ہی وہ آتے ویسے ہی وہ گود میں چڑھ جاتا۔ کچھ دیر اسے کھلا کر کرسی پر بٹھاتے تب کہیں آپ کپڑے تبدیل کر پاتے۔ پھر اپنے ساتھ اسے کچھ کھلاتے پلاتے۔ مگر یہ تھوڑی تھا کہ وہ شرارت کر کے بچ جائے۔ ضد کر بیٹھے۔ ایسے وقت تو سزا تک دیتے۔

بٹی اپنے گھر سے راکھی بھیجتی۔ جب وہ نہ ہوتی تو میرے ہاتھ سے راکھی بندھواتے۔ جب وہ پاس میں ہوتی تو راکھی ایک دو دن پہلے ہی لا کر اسے دے دیتے۔ جب دو سال تک بیٹے الہ آباد تھے تو بٹی سے کہتے تم پارسل بنا دو یا خود پارسل بنا کر ان کے نام کر دیتے۔

(غالباً درست یوں ہے: میرے ہاتھ سے بیٹوں کو راکھی بندھواتے)

بٹی ہمارے ساتھ بمبئی میں تھی۔ رکشا بندھن ہونے کے ۱۵ دن بعد بولے'' بتاؤ بٹی تمھیں کیا چاہیے''؟

بیٹی بولی ''جو بھی آپ دیں۔''

اس پر آپ نے مجھ سے کہا ''بیٹی سے کہو ہیرا جڑی لونگ مانگ لے۔''

''سن رہی ہے بیٹی؟'' میں نے کہا۔

بیٹی نے کہا ''بابو جی تو خود دے رہے ہیں میں کیا مانگوں۔''

جب وہ جانے لگی تو بولے ''جب آؤں گا تو لیتا آؤں گا۔''

بعد میں جب ہم بنارس جانے لگے تو مجھے لے کر بازار گئے۔ وہاں بیٹی کے لیے چیزیں لیں۔ ان میں جو خاص چیز تھی وہ ۲۰۰ روپے کی تھی پینتالیس روپے کی گھڑیاں دونوں بیٹوں کے لیے لیں۔ بیٹی کے لیے ۱۳۵ روپے کی لونگ خریدی۔ میرے پیچھے پڑے کہ تم بھی کانوں کے لیے پھول لے لو۔

میں نے کہا ''مجھے ضرورت نہیں ہے۔''

آپ بولے ''بڑا اچھا ہے لے لو۔''

میں نے کہا ''میرے روپے بینک میں رہیں گے۔ جب پہنتی نہیں ہوں تو کیا لوں؟''

کسی طرح میں نے اپنی جان بچائی۔ جو چیزیں لی تھیں ان میں سے تین بھانجیوں کے لیے لی تھیں۔''

میں نے کہا ''یہ اتنی چیزیں کیا ہوں گی۔''

''دیتے وقت کم پڑ جائیں گی۔ کماری وغیرہ جان کھا جائیں گی۔ بہت سی لڑکیاں بھی تو ہیں۔''

کام چھوڑنے سے پہلے ایک صاحب نے ان سے ایک روزنامہ نکالنے کے لیے کہا۔

آپ مجھ سے بولے ''کیا برا ہے۔ روزنامہ نکالنے کو جو کہہ رہے ہیں۔ ۷۰۰ روپے دینے کو کہتے ہیں۔ اور چار سرکاری (ماتحت) ایڈیٹر دینے کو کہتے ہیں۔ اگر تم کہو تو میں کر لوں۔ میری تو خواہش ہے۔ آخر گھر پہنچ کر بھی تو ہنس اور جاگرن کو چلانا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ گھر اپنے پاس سے پیسے بھی لگانے پڑیں گے اور یہاں اخبار کو بس مرتب ہی تو کرنا پڑے گا۔ اس طرح وہ دونوں پتر بھی چلتے رہیں گے اور یہاں میں کام بھی کرتا رہوں گا۔ روپے کی جو دقت پتروں کو چلانے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ یہاں دور ہو جائے گی۔''

میں بولی "مجھے یہاں رہنا ہی نہیں ہے۔"

آپ بولے "تو اس میں کیا ہے چلو ہم دونوں آدمی یہاں سے چلتے ہیں وہاں دیکھ بھال کر کے اور مہینے دو مہینے رہ کر واپس چلے آئیں گے۔"

میں نے کہا "مجھے یہاں بالکل ہی نہیں رہنا ہے۔"

وہ بولے "تمہیں یہاں کوئی خاص تکلیف تو ہے نہیں۔"

"تکلیف یوں نہیں ہے" میں نے کہا "تین جانیں اور تیرہ چولھے والا معاملہ ہے۔ بچے تو پریاگ (الٰہ آباد) میں پڑے ہیں۔ اور ہم دونوں یہاں بمبئی میں۔"

انھوں نے کہا "تو گھر پہنچ کر ہی کون سا اطمینان ہو جائے گا۔ اب کے سال دھنو کو تو الٰہ آباد جانا ہی ہو گا اور ہم لوگ بنارس رہیں گے تو وہ جگہیں تو یونہی ہو گئیں۔"

"وہاں تو اپنے بس میں ہوں گے کیونکہ بنارس اور الٰہ آباد میں کچھ زیادہ فاصلہ تو ہے نہیں۔ وہاں رہنے سے کم سے کم اتنا تو ہو گا کہ کوئی بیمار پڑے، کوئی خوشی غمی ہو تو ایک دوسرے کے پاس پہنچ تو سکتے ہیں۔ یہاں سے تو وہ بھی ممکن نہیں۔ تین دن کا سفر کرو گے تب کہیں جا کر پہنچ پاؤ گے"۔

انھوں نے اس پر کہا "یہ تو وہی بات ہوئی کہ اپنے گھر میں پڑے رہیں گے چاہے کچھ بھی کام نہ ہو۔"

میں نے چڑھ کر کہا "اگر نوکری کرنی ہو تو مجبوری ہے۔ پھر آپ جس مقصد سے یہاں آئے تھے جب وہ پورا نہیں ہو رہا ہے تو یہاں پڑے رہنا بے کار ہے۔"

آپ نے کہا "اگر اور کچھ نہ ہو گا تو بس اور جا کر ن تو چلیں گے ہی۔"

میرے منھ سے نکلا "نہیں چلیں گے تو ان کو چلانے کا کیا آپ نے ٹھیکا لے لیا ہے۔ چلتے ہیں تو وہ کون سی اشرفیاں ہمیں دے دیتے ہیں اور جو بند ہو گئے تو کون سے ہم بھوکوں مرنے لگیں گے۔"

"صحیح طور سے کیے ہوئے فیصلہ کی بھی کچھ اہمیت ہوتی ہے۔ جو چیز آدمی اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے اسے اس سے محبت بھی ہو جاتی ہے۔ جب تک آدمی ہاتھ پیر مار سکتا ہے تب تک اس کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے بچوں کے بارے میں تم فکر کیا کرتی ہو کیا لڑکے لڑکیوں سے کوئی آشا رکھتا ہے۔ کہ وہ یقیناً آگے چل کر آرام ہی پہنچائیں گے۔ یہ کہنا چاہیے کہ چونکہ بچے ہو جاتے ہیں تو ان سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔ اور ان ہی بچوں کے لیے ہم دن رات کیسی کیسی نفس کشی کرتے ہیں لوگوں کا کہنا ہے کہ سنیاسی تیاگ کرتا ہے اور میرا کہنا ہے کہ سنیاسی کیا تیاگ کرتا ہے۔ اچھے سے اچھا کھاتا ہے اور فکروں سے دور رہتا ہے۔ نہ بسنے (جینے) کی خوشی نہ مرنے کا غم کہاں کیا ہوتا اس

کی اسے فکر نہیں اور یہاں گھر گرست والوں کی کیا حالت ہے اس کا حال سنو۔ رات دن بچوں کے آرام اور خوشی کے لیے کون سا ایسا تیاگ ہے کون سی ایسی تپسیا ہے' کون سا ایسا عبدان ہے جس کو گھر گرست والا نہیں کرتا۔ جو گھر انے خوشحال ہیں ان کی بات چھوڑو۔ باقی جو غریب آدمی ہیں اگر ان کے گھر چار روٹیاں پکتی ہیں تو ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بچوں کے پہلے بھر پیٹ کھلا دو۔ اچھی کوئی چیز ہوتی ہے تو لوگ اسے اپنے منھ میں نہیں ڈالتے' بچے کھائیں گے' بس یہی سوچتے ہیں''۔ اپنے کپڑے تار تار ہو گئے ہیں' سردی سے سکڑ رہے ہیں' پیسہ اگر ملے گا تو پہلے یہی خیال ہوتا ہے کہ اول بچے ہیں' ان کے لیے' مزہ یہ ہے کہ اس میں تم ہی لوگ سب سے آگے ہو۔ اور جب بچہ کچھ بن جاتا ہے تو وہ ایسے ماں باپ کے لیے یہ کہنا بھی نہیں چاہتا کہ یہ ہمارے ماں باپ ہیں۔ ان کو آرام پہنچانا تو دور کی بات ہے۔''

میں نے کہا'' تو سب لڑکے ایسے تھوڑی ہیں۔''

آپ بولے'' سب نہ ہوں مگر دنیا تو اسی طرف جا رہی ہے۔''

میں نے کہا'' تو میں اس (بگڑی) کو آپ کیوں نہیں بناتے۔''

'' وہی تو بنانے کو یہاں آیا تھا' نہ بنے تو کیا کروں۔''

بمبئی میں ایک رات جو بخار چڑھا تو دوسرے دن پانچ بجے تک بھی نہیں اترا۔ میں ان کے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے رات کو کھانا نہیں کھایا تھا۔ کوئی چھ بجے کے قریب ان کا بخار اترا۔

آپ بولے'' کیا تم نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟

میں نے کہا'' کھانا تو کل شام سے پکا ہی نہیں۔''

آپ بولے'' اچھا میرے لیے تھوڑا دودھ گرم کرو اور تھوڑا سا حلوہ بناؤ۔''

میں حلوہ اور دودھ لے کر آئی۔ دودھ تو خود پی لیا اور مجھ سے بولے'' یہ حلوہ تم کھاؤ۔''

جب میں حلوہ کھا چکی تو ان کے پاس بیٹھ گئی۔

آپ بولے'' کچھ پڑھ کر سناؤ' وہ گانے کی کتاب اٹھا لو۔''

میں نے گانے کی کتاب اٹھائی۔ اس میں لڑکیوں کی شادی کا گانا تھا۔ میں گا رہی تھی' وہ رو رہے تھے۔ میں پڑھنے میں لگی تھی' ان کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ آپ بولے'' بند کر دو' بڑا دردناک گانا

ہے۔لڑکیوں کا جیون بھی کیا ہے۔کہاں بے چاری پیدا ہوں اور کہاں جائیں گی جہاں اپنا کوئی نہ ہو۔دیکھو یہ گانے ان عورتوں نے بنائے ہیں جو بالکل ہی پڑھی لکھی نہ تھیں۔آج کل کوئی ایک کویتا لکھتا ہے یا کویوں کا سمیلن ہوتا ہوتو لگتا ہے شاعرزمین آسمان ایک کردینا چاہتا ہے ان گانوں کو بنانے والیوں کا نام بھی نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا'' یہ بنانے والے تھے یا بنانے والیاں تھیں؟''

آپ بولے'' نہیں مرد اتنا خیال کرنے والا نہیں ہوسکتا کہ عورتوں کے اندر کے درد کو محسوس کر سکے۔ یہ گیت عورتوں ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔عورتوں کا درد عورتیں ہی جان سکتی ہیں۔اور یہ گانے انھی کے بنائے ہوئے ہیں۔''

میں بولی'' ان گانوں کو پڑھتے سے میں تو نہیں روئی' آپ کیوں رو پڑے؟''

آپ نے کہا'' تم اس کو سرسری نگاہ سے پڑھ رہی تھیں۔اس کے اندر کیا چھپا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش تم نے نہیں کی۔میرا خیال ہے کہ تم نے میری بیماری کی وجہ سے دلیر بننے کی کوشش کی ہے۔''

میں بولی'' یہ بات نہیں ہے۔جن عورتوں کو آپ کمزور سمجھتے ہیں' کوئی ان میں کمزور نہیں ہے،اگر ہیں تو عورت مرد دونوں ہی کمزور ہیں۔دونوں حالات کے ہاتھ میں کھلونے ہیں۔جیسے حالات ہوتے ہیں۔ویسے ہی دونوں ہوتے ہیں۔مردوں ہی کے پاس کون ان کے بھائی بند بیٹھے رہتے ہیں۔ سنسار میں آکر سب اپنی قسمت کا کھیل کھیلا کرتے ہیں۔''

اس پر آپ بولے' جب تم یہ پہلو لیتی ہوتو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کے مطابق اپنے اپنے کو بناتے ہیں۔اور اسی وقت دونوں کو سکھ ملتا ہے جب ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں۔اور اسی میں سکون اور مسرت ہے۔مگر باہر اس کے خلاف ہوتو مرد کی نسبت عورت زیادہ کمزور اور بے بس ہوجاتی ہے''۔

سنہ ۳۴ میں میں بمبئی میں تھی جب ایک مہاشے نے اپنی کمپنی میں ایک فلم تیار کی۔فلم مالک نے ان کو پانچ سو روپے کی مزدوری پیشگی دی اور کل دو ہزار میں سودا پٹا تھا۔باقی روپے فلم تیار ہونے پر دینے کا وعدہ تھا۔جب فلم مکمل ہوگئی اور انھوں نے فلم مالک سے باقی روپے طلب کیے تو وہ لگا حیلے بہانے کرنے۔جب کئی مہینے بیت گئے اور روپے نہیں ملے تو فلم پروڈیوسر نے فلم کمپنی کے مالک کو نوٹس دیا۔نوٹس پاکر فلم مالک نے ان مہاشے (پروڈیوسر) پر پانچ سو روپے کا دعویٰ ٹھونک دیا۔اب اس بے چارے کی پردیش کی بات' موٹے آدمی سے جھگڑا' پاس روپے نہیں تھے' گھبرا گئے۔ان کی دیوی جی میرے پاس آئیں۔میرے پوچھنے پر انھوں نے اپنا قصہ سنایا اور بولیں کہ اگر بابو جی یہ

گواہی دے دیں کہ ہم نے فلم تیار کرتے دیکھا تو ہمارا کیس ان پر ٹھیک طرح سے چل سکے گا۔ اور جیت بھی جائیں گے۔"

میں نے پوچھا "کیا بابو جی بھی اسٹوڈیو گئے تھے۔ اور انھوں نے ان کی فلم تیار کرتے دیکھا تھا؟"

دیوی جی بولیں "بابو جی تو کبھی نہیں گئے تھے لیکن یہ تو آپ سب کو معلوم ہے کہ وہ رات دن وہیں رہ کر فلم تیار کرا رہے تھے۔"

میں نے کہا "اچھا جب وہ آئیں گے تو میں ان سے اس بات کا ذکر کروں گی۔"

ہم دونوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بابو جی بھی آ گئے۔ میں نے بتایا کہ ان بے چاروں کا ایسا قصہ ہے۔ آپ بولے "میں نے انھیں فلم تیار کرتے نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا "آپ کو معلوم تو ہے ہی کہ وہ رات دن فلم تیار کرتا ہے۔ اور اس بے چارے کا یہاں اور کون بیٹھا ہے۔"

آپ بولے "بہو، تم ان کو میرے پاس بھیج دینا۔ اگر وہ صلح چاہیں گے تو میں صلح کرا دوں گا۔ جھوٹ نہیں بول سکتا' کیونکہ میں نے انھیں اسٹوڈیو میں فلم تیار کرتے نہیں دیکھا ہے۔"

وہ بولیں "بابو جی وہ تو لڑنے پر آمادہ ہے آپ صلح کرانے جائیں۔ اور آپ کی کسی طرح بے عزتی ہو۔ یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"

وہ بولے "بہو میرے لیے اس میں عزت اور بے عزتی کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر تمھارا کام ہو سکے تو میں کرنے کو تیار ہوں۔ تم جا کر انھیں میرے پاس بھیج تو دو۔"

وہ بولیں "اسٹوڈیو میں جتنے آدمی ہیں سب جھوٹی گواہی دینے کو تیار ہیں کہ پانچ سو روپے قرض دیے گئے ہیں۔ وہ مع سود کے روپے مانگ رہے ہیں۔"

وہ بولے "اس کی کوئی بات نہیں۔ انسان تو انسان ہی ہے۔ طیش میں آ کر کوئی کام کر بیٹھتا ہے۔ تم جا کر ان کو بھیج دو؟"

وہ تو چلی گئیں۔ میں نے کہا "بے چاری بہت پریشان تھی۔"

آپ بولے "وہ بہت موٹا آدمی ہے جس کے یہاں یہ کام کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "آپ ان کی مدد ضرور کیجیے۔"

انھوں نے کہا ''ہاں ہاں میں ضرور مدد کروں گا' وہ مانے تو۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ صاحب خود ہی آئے۔ آپ بولے'' کیوں' تم ان سے صلح کرنے کو تیار ہو؟''

وہ بولے'' بابو جی آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ جھگڑا کرنے کو تیار بیٹھا ہے۔''

''میری اور ان کی بات جانے دو' تم اپنی بتاؤ کیا تم صلح کرنے کو تیار ہو؟''

''میں صلح کرنے کو تیار ہوں لیکن کوئی آپ کا اپمان کرتا ہو تو میں یہ سہنے کو تیار نہیں ہوں۔''

اس پر آپ ہنس کر بولے'' بھائی میرا کوئی کیا اپمان کرے گا۔ بہت کرے گا تو یہی تو کہے گا نا کہ وہ تو بے ایمانی کرنے چلا ہے اور آپ اس کی پیروی کرنے آئے ہیں۔ اس کو میں سن لوں گا۔ یہ کوئی بات نہیں ہے۔''

خیر وہ راضی ہو گئے۔ آپ بولے'' کل صبح تم میرے پاس آنا تو ہم تم دونوں ان کے پاس چلیں گے۔''

وہ بولے'' بابو جی میں آپ کے ساتھ نہ جاؤں گا' باہر بیٹھا رہوں گا۔ جب بلائیں گے تب اندر آؤں گا۔''

قصہ مختصر اگلی صبح آپ ایک اور مہاشے کو ساتھ لے کر فلم مالک کے پاس پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی بولے'' تم نے یہ کیا واویلا مچا رکھا ہے؟''

وہ بولا'' کیسا واویلا؟ آپ مجھ سے کس بارے میں پوچھ رہے ہیں؟''

آپ بولے'' بھائی تم نے فلم تیار کرائی اور جب اس نے مزدوری مانگی تو آپ نے اس کے اوپر الٹا پانچ سو روپے کا دعویٰ کر دیا۔ مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔

وہ بولے'' پہلے آپ میرا قصہ سن لیجیے۔ وہ بہت بدمعاش آدمی ہے۔ بھائی چارے کا راستہ اس نے چھوڑ کر اُس نے مجھے نوٹس دیا۔ اگر آپ نہ آئے ہوتے تو میں آج اس کو بنا ہتھکڑی پہنائے نہیں چھوڑتا۔ میں نے سب انتظام کر لیا تھا۔ مگر میں آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ ہندی کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔ وہ میرے پاس آئے لیکن صرف صلح کرنے کے لیے۔ آپ ان کو بتائیے ان کے صرف ڈھائی سو روپے اور نکلتے ہیں۔ اس کا چیک دیتا ہوں۔''

آپ نے ان مہاشے کو آدمی بھیج کر اندر بلوایا۔ ان دونوں میں صلح کر کے اور روپے دلوانے کے بعد وہ گھر آئے مجھے وہاں کا سارا قصہ بتایا اور بولے'' اس نے آج شام کو اس فلم کو دیکھنے کے لیے نیوتا

دیا ہے، وہ شام کو آئیں گے۔ اور ہم دونوں کو فلم دکھانے کے لیے لے جائیں گے اور میں بھی شام کو جلدی آجاؤں گا۔"

جس طرح دوسری جگہوں میں آپ کے ملنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اسی طرح جب بمبئی گئے وہاں بھی کافی ملنے والے نکل آئے۔ صبح تو ۵ بجے گھومنے جاتے۔ اس کے بعد ساڑھے سات بجے ناشتہ کرتے اور پان لیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے کہ کام کروں گا۔' اور اس وقت کوئی نہ کوئی شخص ضرور ہی آجاتا اور جو ان کے کام کرنے کا وقت تھا وہ اس کی نذر ہو جاتا۔ اس کے بعد کھانا کھا کر آپ اسٹوڈیو جاتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جب میں رات کو جاگتی تو وہ دو ڈھائی بجے اٹھ کر اسی وقت ادبی کام کر رہے ہوتے۔ دو چار دن میں نے بھی انھیں اس طرح کام کرتے دیکھا۔

ایک دن میں نے کہا" آخر آپ رات کو اٹھ کر کیوں کام کرتے ہیں۔ ایک تو صحت خراب اوپر سے رات کو اٹھ کر کام کرنا۔ کیا آپ اپنے کو مشین سمجھتے ہیں" میرے لہجے میں غصہ تھا۔

آپ بولے" تم ناحق میرے اوپر بگڑتی ہو۔ بتاؤ دن کو بھی کام نہ ہو اور رات کو بھی نہ ہو تو کام ہو کب؟"

میں نے کہا" میں تو سدا سے آپ کو اسی طرح دیکھتی چلی آرہی ہوں۔ تم ہمیشہ اپنے کو پیسا کرتے ہو۔ طبیعت خراب ہو جاتی ہے تو پریشانی مجھے ہوتی ہے۔"

آپ بولے" دن میں تو ملنے والوں سے چھٹی نہیں ملتی' کوئی نہ کوئی ہمیشہ آجاتا ہے۔ جب مجھے پتہ چل گیا کہ دن کا وقت تو ملنے والوں ہی کے لیے ہوتا ہے تو اگر رات کو بھی کام نہ کروں تو کب کروں؟"

میں نے کہا" تو آپ ملنے والوں کے لیے کوئی وقت مقرر کر لیجیے۔"

آپ بولے" تم ہی بتاؤ کیسے وقت رکھوں؟"

" تختی' پہ موٹے حروف میں لکھ کر ٹنگوا دیجیے کہ ملنے کا وقت فلاں ہے۔" میں نے کہا۔

" اچھا' تو اب تمھارے کہنے سے میں بھی بڑا آدمی ہو جاؤں تمھیں یاد ہے کہ نہیں میں جب ایک مرتبہ مہاتما گاندھی سے ملنے پریاگ گیا اور ان سے نہ مل سکا اس سے مجھے کتنی جھنجھلاہٹ ہوئی تھی کہ دو دن کا ہے بھی دیا اور ان سے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ مہاتما جی بڑے آدمی ہیں۔ ان کے اوپر جھنجھلاہٹ نہیں آنی چاہیے تھی پھر بھی مجھے جھنجھلاہٹ آئی اور تم کو بھی۔ اسی طرح جب مجھ سے کوئی

ملنے آئے گا' اور پھر میں کوئی بڑا آدمی بھی نہیں' تب تم سوچو کے وہ اپنے دل میں کیا کہے گا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے وہ بے چارہ کتنی دور سے' کیا کیا آرزوئیں لیے مجھ سے ملنے آتا ہے۔ وہ اپنے دل میں کیا سوچے گا۔ یہی نا کہ یہ بھی بڑے آدمی ہو گئے۔ جس بڑے آدمی کے نام سے میں خود گھبراتا ہوں وہی الزام میرے سر لگے کتنی بری بات ہوگی۔ ارے بھائی ہم سے تو وہی لوگ ملنے آتے ہیں جو ہماری ہی طرح غریب ہیں۔''

میں نے جواب میں کہا ''غریب ہیں یا امیر' سوال تو یہ ہے کہ کام کیسے ہو۔''

انھوں نے کہا ''جیسے ساری زندگی چلتا چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح چلتا رہے گا۔ اس بات کا افسوس ہی کیا ہے۔''

میں نے کہا '' آپ رات کو کام مت کیجیے' اب آپ کو یہاں تنخواہ تو مل ہی جاتی ہے پھر اتنا زیادہ کام کیوں کیا جائے؟''

انھوں نے کہا ''حقیقت یہ ہے کہ اب میں کام زیادہ نہیں کرتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں کہ اسٹوڈیو میں دن بھر گپیں لڑاتا رہتا ہوں' کام کچھ بھی نہیں کرتا۔''

''تو آپ کو صرف گپیں لڑانے ہی کو بلایا ہوگا۔ اتنی بڑی بمبئی میں ان کو کوئی گپیں کرنے والا نہ مل رہا ہوگا۔''

''سچ کہتا ہوں' اسٹوڈیو میں کچھ بھی کام نہیں ہوتا ہے۔ تم مانتی ہی نہیں ہو'' وہ بولے۔

''میں مانوں کیسے'' میں نے کہا ''میں آپ کی عادت کو جانتی ہوں۔ کتنا ہی پیس جاؤ گے۔ پر میرے سامنے یہی کہو گے کہ کام نہیں کرتا ہوں۔

آپ بولے ''سچ بتاؤ' یہاں جب تک رہوں گا تب تک مان لو بیٹھے سے کام چل بھی جائے گا پر جب یہاں سے چلنے کے لیے تیار بیٹھی ہو تو یہ سوچو وہاں کیسے کام چلے گا اور میری عادت بھی خراب ہو جائے گی۔ آدمی چاہے غریب ہو یا امیر اسے اپنی عادتوں کو نہیں بگاڑنا چاہیے۔ کیونکہ جس آدمی کو نکھلے بیٹھنے کی عادت پڑ گئی سمجھ لو کہ وہ آدمی بے کار ہے۔ ہر انسان کی جیت اسی میں ہے کہ وہ خرچ کم کرے اور محنت زیادہ۔ جس کو یہ سبق یاد ہو گیا سمجھو وہ کسی کا غلام نہیں ہو سکتا''۔

میں نے کہا ''یہ تو آپ کی ہمیشہ کی دلیل ہے۔''

آپ بولے ''یہ میری دلیل نہیں ہے' میں تمھیں ایک سچائی بتا رہا ہوں' جو آدمی جتنی اپنی ضرورتیں

بڑھاتا جاتا ہے وہ اپنی غلامی کی بیڑیاں اتنی ہی زیادہ مضبوط کرتا جاتا ہے۔

میں نے کہا'' کچھ ہو میں رات کو کام نہیں کرنے دوں گی۔''

آپ بولے ''نہیں کرنے دو گی' نہیں کروں گا۔''

میں بولی ''چوری سے آپ جیت جائیں گے۔''

آپ بولے'' کیا مجھے باؤلے کتے نے کاٹا ہے جو کام کرتا ہی رہوں۔ نہیں کروں گا۔ مجھے کیا پڑی ہے۔''

اس کے بعد اسٹوڈیو والے ایک دن ان سے بولے ہمارے ساتھ آپ انگلینڈ چلیے۔ ایک سال کے لیے۔ گھر آ کر آپ مجھ سے بولے'' اسٹوڈیو والے کہتے ہیں کہ ایک سال کے لیے انگلینڈ چلیے' وہاں فلم تیار کریں گے۔ پھر ایک سال وہاں رہ کر لوٹنے کے بعد میں جہاں چاہوں کام کروں وہ مجھے دس ہزار روپے سال دیتے رہیں گے۔ پانچ فلموں کے لیے مجھے کہانیاں تیار کرنی ہوں گی۔ ایک طرح کا ٹھیکا سمجھ لو۔''

میں بولی ''میں نہیں جانے دینا چاہتی' میں نہیں جانے دوں گی۔''

آپ بولے ''تمھارا نقصان ہی کیا ہے۔''

'' نقصان کچھ بھی نہ ہو' مگر میں جانے نہیں دوں گی۔'' میں نے کہا۔

''میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ مجھے نہیں جانے دیں گی۔ اس کے لیے وہ کہتے تھے کہ ان کو بھی ساتھ لیتے چلیے۔ ہم ان کا بھی خرچ دیں گے'' وہ بولے۔

''میں نہ جاؤں گی' نہ جانے دوں گی۔''

آپ نے پھر کہا ''تمھارا اس میں نقصان ہی کیا ہے' تمھارے بچے یہاں پڑھتے رہیں گے۔''

میں بولی'' پڑھتے تو رہیں گے' پر میں سب کو چھوڑ کر وہاں جاؤں''؟

اس پر آپ بولے'' تو مجھے ہی اکیلے جانے دو' بھی ہو آئیں' سچ کہتا ہوں بہت اچھا موقع ہے۔ ہمیشہ کے لیے ہم کو چھٹی مل جائے گی۔ بنارس میں آرام سے بیٹھے بیٹھے کام کرتا رہوں گا۔''

میں بولی'' سب اسی طرح چلتا رہتا ہے۔''

آپ بولے" مزدوری کرنے میں کچھ تو آرام ملے گا' ایسے گھر بیٹھے بیٹھے کیا ملے گا۔ ادھر کام بھی نہیں کرنے دینا چاہتی ہو' ادھر باہر بھی نہیں جانے دینا چاہتی ہو تو پھر بتاؤ کیسے کام ہوگا؟"

میں نے جواب دیا" اسی طرح کام چلتا رہے گا۔ نہ میں آپ کو اکیلے جانے دینا چاہتی ہوں نہ بچوں کو چھوڑنا چاہتی ہوں۔"

آپ بولے" پھر مزدوری کرنے دو یہی سب سے آسان ہے۔

کوئی وقت وہ تھا کہ ایک سال کو چھوڑنا بھی مشکل تھا اب وہی میں ہوں کہ نہیں جانتی کتنے دنوں تک مجھے یہاں اکیلے رہنا ہوگا۔ اور جاتے ہوئے نہ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ جاؤں یا نہیں۔ اور یہ سب دو سال کے اندر ہو گیا۔ وہ مہان پرش مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور میں بیٹھی ہاتھ ملتی رہ گئی۔ اس سے پہلے مجھے انداز ہ تھا کہ وہ اتنی جلدی مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس حالت کو تو وہی محسوس کریں گے جنھوں نے اس بارے میں کچھ بھی غور و خوض کیا ہے۔ آدمی کے ہاتھ میں کچھ بے نہیں پھر بھی وہ اپنے کو بہت کچھ سمجھتا ہے۔ ویسی ہی میں بھی ایک ہوں۔ اسی لیے وہ مہان آتما جس کی مہانتا کو میں کبھی سمجھ نہ پائی' اور کیسے سمجھتی؟ پہلے تو یہ تھا کہ وہ مہان سب کے لیے چاہے کچھ بھی رہے ہوں' میرے تو اپنے تھے اور میں ان کی۔ ہم دونوں کے درمیان کسی قسم کی عظمت کہاں ٹھہر سکتی تھی' کیونکہ جہاں اپنائیت ہو جاتی ہے وہاں عقیدت نہیں رہتی۔ اپنا پن اس سے بھی بڑی چیز ہے اور وہ ان چیزوں کے درمیان نہیں رہ سکتی۔ شاید اسی لیے میرے دل میں یہ خیال نہ آیا۔ اسی میں اندھی ہو کر میں ہمیشہ ان پر حکومت کرتی اور وہ خوشی سے میری حکومت مانتے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ایک بڑا مہان پرش کو ایک ننھا سا بچہ مارتا ہے۔ اور مار کر بھاگ جاتا ہے اور وہ مہان پرش اس کی اس ادا پر ہنس دیتا ہے۔ وہ مجھے کبھی کبھی پاگل کہہ دیتے تھے' تم پاگل ہو' مگر اس پاگل پن میں جو خوشی تھی وہ مجھے اب جب کوئی مجھے پاگل کہنے والا نہیں' یاد آتی ہے اور میں سو پاگلوں میں سے ایک ہو گئی ہوں۔ اور سچ مچ میں پاگل ہوں اور اپنے پاگل پن میں سب کچھ بھولی بیٹھی ہوں ورنہ کوئی سمجھدار آدمی میری حالت میں ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اسی لیے میں کہتی ہوں کہ میں پاگل ہوں اور دنیا بھی مجھے پاگل سمجھے۔

مدراس کی سیر

آپ کو مدراس کی ہندی پرچار سبھا نے بلایا تھا۔ آپ آکر مجھ سے بولے" چلو ہم تم مدراس گھوم آئیں۔"

میں نے پوچھا" کس لیے۔"

آپ بولے ''ہندی پرچار سبھا والوں نے بلایا ہے۔''

میں نے کہا ''خرچ بہت پڑے گا۔''

آپ بولے ''دیکھا جائے گا''۔

میں چلنے کے لیے تیار ہوگئی کیونکہ میری بھی خواہش مدراس دیکھنے کی تھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا' ۱۹۳۴ء میں ہم چار آدمی مدراس کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم دونوں' تیسرے ناتھورام پریمی تھے اور چوتھے ایک مدراسی سجن تھے۔ گاڑی میں سوار ہوئے۔ چار چھ ہی اسٹیشن گئے ہوں گے کہ میرے سر میں زور کا درد ہونے لگا۔ ڈبہ اس بری طرح بھرا تھا کہ کہیں لیٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ پہلے میں ضبط کیے بیٹھی رہی۔ مگر جب کسی طرح نہ رہا گیا تو میں نے آپ سے کہا کہ میرے سر میں بری طرح درد ہے' میں بیٹھ نہیں سکتی۔''

آپ بولے ''میں ابھی تمھارے لیے انتظام کیے دیتا ہوں۔''

میں نے کہا ''مجھے زنانے ڈبے میں بٹھال دیجیے۔''

آپ بولے ''نہیں رات کا وقت ہے پھر وہاں کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ میں اکیلے بیٹھنے نہیں دوں گا۔ مان لو تمھاری طبیعت زیادہ خراب ہو تو وہاں کون ہوگا۔''

پریمی جی سے بولے '' آپ میرا اور اپنا بستر اوپر کر دیجیے' ان کے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔''

پھر انھوں نے اپنے ہاتھوں سے ہولڈ اول کھول کر میرے لیے بستر تیار کر دیا۔

مجھ سے بولے ''تمھارے پاس تیل بھی تھا لائی ہو اپنے ساتھ؟''

میں بولی ''تیل کیا کیجیے گا۔''

بولے ''سر میں مالش کروں گا۔''

میں نے کہا ''نہیں' یہ تو بہت بھدی بات معلوم ہوتی ہے۔''

بولے ''قطعاً بھدی نہیں ہے۔ طبیعت خراب ہو تو کیا کسی کی دوا نہ کی جائے' کچھ نہیں' بس تمھیں دھوپ لگ گئی ہے۔ میں ابھی مالش کیے دیتا ہوں' تمھیں نیند آ جائے گی اور درد چھوڑ جائے گا۔''

میرے بہت روکنے پر بھی وہ نہیں رکے اور تیل نکال کر میرے سر کی مالش کرنے لگے۔ واقعی مجھے آرام ملا اور میں سو گئی۔ پریمی جی' اور آپ اور مدراسی سجن جب دس بجے کے قریب کھانا کھانے لگے

تو پریمی جی نے بہت چاہا کہ مجھ کو جگا کر کھانا کھلا دیا جائے مگر آپ بولے ''نہیں جس کو تکلیف ہو اور آنکھ لگ جائے تو اس کو کبھی نہیں جگانا چاہیے۔ حقیقت میں ان کو بہت تکلیف رہی ہے۔ معمولی درد کی شکایت کرنے والی یہ ستی نہیں ہیں ان کو سوتے رہنے دیجیے''۔

میں سوتی رہی۔ ساری رات گاڑی کے چلنے کا مجھے پتہ نہیں پڑا۔

جب صبح چھ بجے گاڑی مدراس پہنچی تو آپ نے مجھے جگایا۔ میں اٹھی تو میری طبیعت تازہ تھی۔

اسٹیشن کے پلیٹ فورم پر کوئی تین سو کے قریب عورت مرد پہلے ہی سے موجود تھے۔ سبوں کے ہاتھوں میں ہار تھے کسی کے ہاتھ میں گلاب کا ہار کسی کے ہاتھ میں کپور (کافور) کا ہار جو خاص طور سے مدراس ہی میں بنتے ہیں۔ ہم تینوں آدمیوں کو انھوں نے ہاروں سے لاد دیا۔ ایسا استقبال اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر ہم تینوں آدمیوں کو لے جا کر ایک مارواڑی سجن نے اپنے یہاں ٹھہرایا۔

جب ہم لوگوں نے رات کے گیارہ بجے فرصت پائی تب آپ مجھ سے بولے ''دیکھو ان اطراف میں ہندی پرچار کتنے زوروں پر ہوا ہے۔ یہ سب مہاتما گاندھی کی محنت کا ثمر ہے۔ جو بھی کام وہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں وہی درست ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ انگریزی پہلے یہیں پر سیکھی گئی۔ ہمارے علاقوں میں اچھے اچھے عہدوں پر مدراسی ہیں۔ اور آج وہی ہندی کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں۔

میرے خیال میں سواگت کرنے کے لیے کم سے کم تین سو سے اوپر آدمی رہے ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندی کا مستقبل روشن ہے۔ ایک بار ہندی زبان کا پروپیگنڈہ کرنے والا جتھا ہمارے اطراف و جوانب میں گیا تھا۔ یہاں جتنی عورتوں کو ہم نے اپنا استقبال کرتے دیکھا ہمارے علاقوں میں اس کے مقابلے میں شاید ایک دو ہی وہاں ان کا استقبال کرنے کو آئی ہوں۔ اور یہاں جو ہمارے دیکھنے میں آیا اس سے تو ایسا لگا جیسے نہ جانے کتنی پرانی دوستی ہے اور کب سے ان سے ہماری واقفیت ہے۔''

میں بولی'' مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جتنی شرافت اور جتنا اپنا پن ان لوگوں میں ہے اتنا کیا' اس کا ایک حصہ بھی ہم میں نہیں ہے۔ جس وقت بنارس میں ہندی کو پھیلانے کا جتھا گیا تھا اس وقت تک میری پانچ۔ چھ کہانیاں تامل اور تیلگو میں ترجمہ ہو چکی تھیں پھر بھی میں بنارس میں رہتے ہوئے بھی ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن نہیں گئی تھی تو پھر اوروں کے لیے کیا کہوں۔''

آپ بولے "نہیں ہمارا علاقہ ہی ایسا ہے۔"

میں نے کہا "سب کوئی کریں، مگر جس کام کو ہم برا سمجھتے ہیں اور اسے برا سمجھتے ہوئے بھی کریں تو ہم سے بڑا گنہگار کون ہوا۔ بمبئی سے روانہ ہوتے وقت میں نے سوچا تھا کہ کسی اجنبی جگہ جارہی ہوں جہاں اپنا کوئی نہ ہوگا۔ مگر یہاں آنے پر اور ان بہنوں کی شرافت دیکھ کر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنی ہی بہنوں کے بیچ میں آ گئی ہوں"۔

آپ بولے "بھئی یہی تو ان لوگوں کی خصوصیت ہے۔"

میں نے کہا "نہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ مجھ سے کہیں اونچی ہیں۔"

دوسرے دن میٹنگ تھی جس میں شرکت کے لیے ہم لوگ گئے تھے۔ پہلے تو میٹنگ ہوئی۔ اس کے بعد مختلف صوبوں کے لوگ جو وہاں آ بسے ہیں یا جو وہاں کام کرتے ہیں انھوں نے وہاں کے لوگوں کی شکایت کرنا شروع کی صاحب ہماری تو یہاں کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔"

آپ سبھوں کو جواب دیتے ہوئے بولے "بھائی حیثیت تو اس حالت میں ہوتی ہے جب بڑی تعداد میں پڑھے لکھے آدمی ایک جگہ رہتے ہیں تب وہ اپنی پوزیشن بناتے ہیں اور تب ہی حیثیت بنتی بھی ہے۔ ہمارے صوبوں کے لوگ تو یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں اسی وجہ سے یہاں ان کی پوزیشن نہیں بن پائی۔ ہمارے صوبوں میں تو پڑھے لکھے لوگ گھر گھسو ہوتے ہیں۔ اب رہے مزدور اور روزگار پیشہ تو انھیں اپنی روزی پیدا کرنے کی فکر رہتی ہے۔ انھیں پوزیشن بننے نہ بننے کی فکر ہی نہیں ہوتی ہے۔ پوزیشن تو بنانے کی چیز ہوتی ہے اور جب وہ بنتی ہے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس صوبے کے جو حضرات دوسرے صوبوں میں جاتے ہیں تو آپ اپنی پوزیشن وہاں بناتے ہیں۔ ہمارے صوبوں میں انگریزی اخباروں کے ایڈیٹروں میں سے اکثر مدراسی ہی ہوتے ہیں۔ کچھ اسکولوں کے پرنسپل بھی مدراسی ہیں۔ ڈوکٹروں میں بھی زیادہ تعداد مدراسی حضرات کی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہاں سب سے پہلے انگریزی زبان کا رائج ہونا ہے۔ جیسے مدراسی بھائیوں نے پہلے انگریزی سیکھنے میں زبردست محنت کی اسی طرح دیکھنا ہندی میں بھی بازی لے جائیں گے۔"

دوسرے دن ہم ایک بہت اونچے مکان کو دیکھنے گئے۔ وہ بہت پرانا مکان تھا۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ "آخر اس کی تاریخ کیا ہے؟"

لوگوں نے بتایا "صاحب اس بات کا پتہ نہیں ہے کہ یہ عمارت کب اور کیوں بنی۔ کئی بار اس کو توڑنے کی کوشش کی گئی کہ آخر یہ نیچے کہاں تک گئی ہے۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔

اس عمارت پر ہم تقریباً پندرہ سولہ آدمی چڑھے تھے۔ جب اس پر کھڑے ہوئے تو پتہ ملا کہ پیر سے بانے پر کمان دیتی تھی، لچکتی تھی۔ آپ کچھ ہی دور گئے اور سر تھام کر بیٹھ گئے۔ بولے "میرا سر چکر کھا رہا ہے۔"

میں آگے نکل گئی تھی انھیں بیٹھے دیکھ کر لوٹ آئی اور پاس بیٹھ کر بولی "کیسی طبیعت ہے"؟

مجھے گھبرائی ہوئی دیکھ کر بولے "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کمان جو چلتی ہے تو شاید اس کی وجہ سے مجھے چکر آرہے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نیچے اتر جاؤں گا۔"

میں نے چاہا کہ انھیں نیچے اتار آؤں کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ یہ کہیں گر نہ پڑیں۔"

آپ نے مجھے یقین دلایا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔

اس کے بعد دو مدراسی صاحبوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں نیچے اتارا۔

خیر اس عمارت کو دیکھنے کے بعد ہم دونوں چامنڈی کا پہاڑ دیکھنے گئے۔ وہ بھی بہت اونچا تھا۔ مگر وہاں تک موٹر چکر کاٹتی ہوئی جاتی تھی۔ میں وہاں بھی ڈر رہی تھی کہ راستے میں آپ کو چکر نہ آنے لگیں۔ میں نے کہا "آپ اوپر نہ جایئے۔" اس پر آپ نے کہا تھا "یہ کوئی بات نہیں۔ وہاں کمان جو ہلتی، لچکتی تھی اس کی وجہ سے چکر آ گیا تھا یہاں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

اس طرح چھ دن جو مدراس میں گزرے مجھے معلوم بھی نہ ہوئے۔ اس وقت مجھے کتنا فخر تھا۔ کتنی خوشی تھی۔ لوگ ان کو اپناتے تھے اور مجھے خوشی اس بات میں تھی کہ یہ میرے ہیں۔

مدراس ہی میں میسور کے ایک صاحب آئے اور میسور چلنے کا نیوتا دیا۔ چھ دن مدراس میں گزارنے کے بعد میسور گئی تو وہاں بھی اسی طرح کا سواگت اور اسی طرح کا جشن ہمارا منتظر تھا۔ وہاں ریاست میسور کے وزیر صاحب سب سے زیادہ گرم جوشی اور شادمانی کے پتلے نکلے۔ وہاں پر علی گڑھ کے ایک صاحب تھے۔ انھوں نے بڑا اصرار کر کے اپنے یہاں ٹھہرایا۔ میسور حقیقت میں بہت ہی خوبصورت اور دل ربا جگہ ہے۔

رات کو جب ہم ساتھ بیٹھے تو آپ نے کہا "جتنا خوبصورت میسور ہے اتنا خوبصورت شاید ہی کوئی دوسرا شہر ہو۔ میں نے تو اتنا خوبصورت شہر نہیں دیکھا۔"

میرے منہ سے نکلا "میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ ہم لوگ یہیں رک جائیں۔"

وہاں بھی جلسے ہوئے۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ آپ بھی کچھ بولیے۔"

ان کی خوش خلقی اور اپنائیت دیکھ کر تو مجھے خود لگ رہا تھا کہ میں کتنی اچھی ہوں اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آرہا تھا کہ یہاں سے جو بہنیں ہمارے یہاں آئی تھیں ہم نے ان کا سواگت تک نہ کیا۔ وہاں ان بہنوں کے درمیان یہ محسوس ہورہا تھا کہ ان کا ہمارا بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ناچار مجھے کہنا پڑا کہ میں تو یہاں غیروں کا گھر سمجھ کر آئی تھی مگر بہنوں آپ لوگوں کے درمیان اور آپ کے خلوص کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ اپنے ہی خاندان کے لوگوں میں ہوں۔''

ان میں ایک بوڑھی عورت تھیں ان کی عمر ٦٠ کے لگ بھگ ہوگی۔ میں نے کہا ''میرا دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ لکشمی اماں کے پاس بیٹھ کر بہت اچھی اچھی گیان کی باتیں ان سے سنوں اور جو میں بنارس میں ان کا سواگت کرنے میں نہیں گئی تھی اس کے لیے ان سے معافی کی طالب ہوں۔''

وہ بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور بولیں ''آپ ایسا کیوں کہتی ہیں۔''

میں نے ان سے کہا ''کہ آپ مجھے آپ نہ کہیں' مجھے تو آپ تم ہی کہیے۔ اور اگر آپ مجھے اپنی بیٹی بنالیں تو اور بھی اچھا ہو۔'' آپ بھی اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے ''یہی تو سب سے بہتر ہوگا۔''

اس وقت واقعی میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ان لوگوں کا اُنس ایسا تھا کہ وہ آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔ اسی طرح پانچ دن ہمیں بیت گئے۔ کئی جگہ دعوتیں کھائیں۔ اور کئی جگہ جل پان کیا (پانی پینا' پان کھانا) جتنا ہی وہ لوگ ہمارے ساتھ بھلمنساہٹ کرتے تھے اتنا ہی ہم لوگ ان کی محبت اور رافت کے بوجھ تلے دبے سے جاتے تھے۔

وہاں سے دوبارہ بنگلور جانے کی دعوت ملی۔ بنگلور میں ہمارے علاقوں کا کوئی نہ تھا۔ اس لیے ہم لوگ ایک مدراسی صاحب کے مہمان ہوئے۔ ان کے یہاں کی عورتیں اس وقت تک ہندی پڑھی ہوئی نہیں تھیں۔ نہ ان کو ہندی آتی تھی نہ مجھے انگریزی۔ اس وقت مجھے کچھ دقت محسوس ہوتی تھی۔ البتہ مردوں میں یہ بات نہ تھی۔ مرد کافی ہندی سمجھتے تھے کیونکہ ان میں ہندی کا پرچار بہت حد تک ہو چکا تھا۔

آپ مجھ سے بولے ''تمھیں تو یہاں بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا ''نہیں' کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

آپ بولے ''کیوں نہیں' عورتوں کی ضرورت عورتوں ہی میں پوری ہوتی ہے۔''

بنگلور کے بعد رامیشورم کے لوگ بھی بلانے کو آئے۔ وہ مجھ سے بولے ''چلو اب رامیشور چلیں۔''

میں نے کہا ''رامیشور جانے کی میری طبیعت نہیں ہے۔''

کہنے لگے "اس میں کیا ہے گھومنا ہی تو ہے"۔

میں بولی "میری طبیعت اب سیدھی بمبئی جانے کی ہے۔"

آپ بولے "پھر موقع ملے یا نہیں۔قریب آ گئے ہیں۔چلنا چاہیے۔"

میں نے کہا "نہیں میری طبیعت نہیں ہے۔"

آپ بولے "آخر بمبئی میں تمھارا کون بیٹھا ہے۔ہم دونوں ہی تو تھے وہاں سو دونوں اب بھی ساتھ ہیں۔"

میں بولی "وہاں لوگوں کے خط پتر تو ملیں گے۔بٹی کا نہ معلوم کیا حال ہے اس کو بچہ ہونے کو تھا۔"

"تو اچھا نہیں چلنے کا ارادہ ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔"

ہم ان تینوں جگہوں گئے اور ہر جگہ ۵'۶ دن تک رکنا پڑا۔اس پر بھی ان لوگوں کا دل سیر نہیں ہوا۔ سب لوگوں نے یہی کہا "صاحب اور کچھ دن ٹھہرتے تو اچھا معلوم ہوتا۔یہ تھوڑے سے دن دیکھتے دیکھتے گزر گئے۔"

ہمارا دل نہیں کرتا کہ آپ کو جانے دیں۔"

سب لوگوں سے یہی وعدہ کیا کہ گرمیوں میں آئیں گے جب ہمارے بچوں کی چھٹیاں ہوں گی۔ ہم پورے خاندان کے ساتھ آئیں گے۔اور اس وقت ہر جگہ کم سے کم ۱۵ دن تک ٹھہریں گے۔"

جب ہم دونوں رات کو ایک جگہ ہوئے تو آپ مجھ سے بولے "دیکھو یہ کتنا خوبصورت علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگ کتنے بھلے مانس اور کتنے نیک خو ہیں۔ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمیشہ کا ان سے تعلق ہو۔اب کی بار جب ہم آئیں گے تو بٹی اور بچوں کو ضرور لے کر آئیں گے۔ان بے چاروں کو بھی علاقہ دیکھنا نصیب ہوگا۔تب یہاں کا آنا اور بھی اچھا لگے گا۔یہاں رہنے میں بہت آنند آئے گا۔"

"اچھا تو مجھے یوں بھی لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

بولے "نہیں یہ فطری بات ہے جب بچے دور ہوتے ہیں تو اپنے میں ایک طرح کی کمی سی آ جاتی ہے اور فکر بھی لگی رہتی ہے۔اب اسی وجہ سے تو تمھاری آگے جانے کی مرضی نہیں ہو رہی ہے۔بٹی کے بچہ ہونے والا تھا نہ معلوم اس کا کیا حال ہے؟"

جب ہم وہاں سے چلے تو سب لوگ اسٹیشن پر پہنچانے آئے۔ اور پونا سے ایک مہاشے کا پتر آیا کہ آپ لوٹتی بار میرے یہاں ضرور آیئے۔''

آپ مجھ سے بولے ''چلو پونا بھی چلو۔''

''میری طبیعت اچاٹ ہے چلیے سیدھے بمبئی چلیے۔'' میں نے کہا۔

آپ بولے ''وہ چالاک آدمی ہے۔ وہ تمھارے مکان کی چابی بھی لیتا آیا ہے اور لکھا ہے کہ چابی اسی لیے (بمبئی سے) لیتا آیا ہوں کہ آپ یہاں بالضرور ٹھہریں۔ جیسے ۱۵ دن باہر بتائے ویسے ہی دو دن ان کے مہمان بھی سہی۔''

میں بولی ''جب ایسا ہے تو چلنا ہی پڑے گا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ جتنی جگہ جاؤ اتنے ہی اپنے ہوتے جاتے ہیں۔ اتنی ہی سب کی محبت ہوتی جاتی ہے۔ اُتنوں ہی کے ساتھ اپناپا ہوتا جاتا ہے اور اتنے ہی بندھن ہمارے بندھتے جاتے ہیں۔''

آپ نے کہا ''اس میں تمھارا نقصان ہی کیا ہے۔ چھوٹے سے دائرے میں رہنے کے بجائے اور وسیع دائرے میں چلا جایا جائے تو میرے خیال میں تو اس میں کوئی نقصان نہیں فائدہ ہی ہے۔''

میں بولی ''فائدہ کچھ بھی ہو اپنی آتما کو تو تکلیف ہوتی ہے۔ مان لیجیے میری خواہش ان سب کو دیکھنے کی ہے اور رہ رہی ہوں بنارس میں اور یہ لوگ اتنی دور۔ بتلائیے ان سے کیسے مل سکوں گی۔''

آپ بولے ''میرا بھی تو وہی حال ہوگا۔''

میں نے کہا ''مردوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ آپ کی خط و کتابت سب سے ہوتی رہے گی۔ کبھی آپ ادھر کا چکر لگا جائیں گے کبھی یہ لوگ بنارس آئیں گے تو آپ سے مل لیں گے مگر مجھ سے ملنے کون وہاں دوڑا جائے گا اور میں کہاں کہاں جاتی پھروں گی۔''

بولے ''جب میں آؤں گا تو تم میرے ساتھ یقیناً آؤ گی اور جب یہ لوگ ادھر جائیں تو بھی تم ان سے ملو گی۔''

وہاں سے روانہ ہو کر ہم پونا آئے۔ ان لوگوں کی خاطر مدارات دیکھ کر بھی طبیعت بہت خوش ہوئی۔ وہاں دونوں مرد عورت میرے بیٹے اور بہو بن گئے اور جب وہاں سے چلی تو مجھے وہی تکلیف پھر ہوئی۔ اس بے چارے نے تو یہاں تک کیا تھا کہ چلتے ہوئے ہمارے ساتھ کھانا بھی کیا تھا اور وعدہ بھی کرایا تھا کہ ہم کسی چھٹی میں دوبارہ پونے آئیں گے۔ لیکن اس کے بعد پونا جانے کا موقع

ہی نہیں ملا۔ ایک پونا ہی کیا اس کے بعد کہیں بھی جانے کا موقع نہیں ملا۔ ہاں وہ لوگ جو کہتے تھے سپنے میں ۵ دن بیت گئے ان کے سپنے کے وہ ۵ دن یاد ہوں یا نہ ہوں کہہ نہیں سکتی اس لیے یہی کہہ سکتی ہوں کہ جب تک جیوں گی تب تک وہ منوہر سوپّج یاد رہے گا۔ اور جب جب ان دونوں کی یاد آئے گی گھنٹہ دو گھنٹہ سب کی وہ الفت مجھے بے چین کر دے گی۔ شاید وہ سوپنا اس جیون میں دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ اور کیسے نصیب ہو جب خود میں ہی وہ نہ رہی جو تھی۔ ایسے میں اگر اس سپنے دیکھنے کی خواہش مجھ میں پیدا ہو تو یہ میرا پاگل پن نہیں تو اور کیا ہوگا۔ پھر بھی میں یہی کہتی ہوں جو سوپنا مجھے دیکھنے کو مل گیا اس کے لیے بھی ایشور کا شکر ہے۔ ورنہ میں ایسی خوش نصیب نہ تھی۔

جب ہم گھر پہنچے تو مجھے وہاں اتار کر آپ بولے ''میں اسٹوڈیو جا رہا ہوں۔''

میں نے کہا ''نہا تو لیجیے۔''

''نہانے لگوں گا تو دیر ہو جائے گی۔'' وہ بولے۔

''دیر ہو گی تو کیا ہوگا۔'' میں بولی۔

''نہیں'' انھوں نے کہا ''جس کے لیے تم گھبرا کر گھر لوٹی ہو اسٹوڈیو جا کر اسے میں دیکھوں۔ لوگوں کے خط آئے ہوں گے۔ بٹی کا بھی حال معلوم ہوگا۔ ابھی لوٹ آتا ہوں۔ صرف چٹھی لینے ہی تو جا رہا ہوں''۔

زیادہ دیر نہیں لگی' ایک گھنٹے میں وہ لوٹ آئے۔ مجھ سے بولے ''بٹی کے یہاں سے تار آیا ہے۔ اس میں بتایا ہے بٹی اور بچہ خیریت سے ہیں۔ بچوں کا بھی خط آیا ہے۔ سب خیریت سے ہیں۔ بٹی کے بچہ ۸ ہی تاریخ کو ہو گیا تھا۔ تب ہی تمھاری طبیعت وہاں اچاٹ ہو رہی تھی۔ شاید ادھر بٹی کی طبیعت ٹھیک نہ ہو گی' بار بار تمھیں یاد کرتی رہی ہو گی تب ہی تم بھی وہاں پریشان تھیں۔''

اس کے بعد ہم دونوں نے اپریل میں بمبئی سے کوچ کیا یہ سنہ ۳۵ کی بات ہے۔ جب وہاں سے چلنے لگے تو آپ بولے چلو بازار ہو آویں اور بچوں کے لیے کچھ سامان لے لیں۔''

میں بولی ''تو جائیے' جاتے کیوں نہیں ہیں؟''

آپ نے جواب دیا ''آخر تم یہاں اکیلی بیٹھی کیا کرو گی۔ تم کو بھی تو کچھ لینا ہوگا۔''

اچانک ان کو یاد آیا ''بٹی کے لیے ناک میں پہننے کے لیے لونگ لینی ہے۔''

وہ لونگ کا قصہ یوں تھا' رکشا بندھن پر بٹی بمبئی ہی میں تھی۔ رکشا بندھن کے دن اس سے بولے'' بٹی کیا لو گی؟''

بٹی بولی ''جو آپ دیں گے وہی۔''

جب یہ بات وہ کہہ رہی تھی گیا نو اس کی طرف لپکا ہوا آیا۔ بٹی ان کے سامنے شرم سے بچے کو چھوتی نہ تھی۔ اس خیال سے کہ بچہ اس کی گود میں آنا چاہ رہا ہے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آپ مجھ سے بولے ''بٹی سے پوچھو'' لونگ کیوں نہیں لیتی۔ یہاں ہیرے جڑی لونگیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔''

اس پر بٹی نے وہیں سے اونچی آواز میں کہا ''جب آپ لا ہی رہے ہیں تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

اس پر آپ بولے ''اگر میں نہ بھی لاتا تو تجھے اس پر مجھ سے لڑائی کرنی چاہیے تھی۔''

میں نے کہا ''تو کیا لڑائی کرنا اچھا ہوتا ہے''؟

آپ بولے ''بہن اور بیٹیاں اپنی دستوری مانگنے میں جھگڑا بھی کرتی ہیں تو مجھے اچھا لگتا ہے۔''

میں نے کہا ''جو گاؤں گیت اور کہانیوں کے گانے آپ نے سنے ہیں شاید اسی سے آپ کو بھی جھگڑا اچھا لگنے لگا ہے۔''

بولے ''ہاں بیچاریوں نے اچھے اچھے گانے بنائے ہیں تو یوں ہی تو نہیں بنائے۔ ہمیں تو انگریزیت چوپٹ کر رہی ہے۔ لگتا ہے وہ ہمیں (ایسے گیتوں اور قصوں سے پیدا ہونے والے) جذبات سے دور لیے جا رہی ہے۔''

یہی قصہ تھا لونگ کا۔

پھر ہم دونوں بازار گئے۔ بٹی کے لیے ۱۲۵ روپے کی لونگ لی اور ایک چندری بھی لی۔ اور چھ چندریاں اور لیں۔ چھوٹے بیٹے بنو کے لیے ہاتھ کی گھڑی لی۔ مجھ سے کان کے پھول کے لیے بولے ''یہ پھول تم لے لو۔''

میں نے کہا ''پھول لے کر کیا ہوگا۔''

آپ بولے ''بہت خوبصورت ہے، لے لو کان میں پہننا۔''

میں نے کہا ''مجھے ضرورت نہیں ہے۔''

آپ بولے ''میں کہتا ہوں لے لو بہت اچھا ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا قیمت ہے اس کی؟''

آپ نے کہا ''بہت دام کا تھوڑی ہے۔ ۵۰ے روپے کا تو ہے ہی۔''

''۵۰ے روپے مفت میں ملتے ہیں'' میرے منھ سے نکلا۔''

بولے'' مفت میں نہیں آتے لیکن تمھارے پاس روپے تو ہیں۔''

میں نے کہا'' روپے ہیں تو بینک میں رہیں گے۔ اسے لے کر ہوگا کیا؟''

وہاں سے تو چلے آئے لیکن گھر آ کر مجھ سے بولے'' آخر تم نے پھول کیوں نہیں لئے؟''

میں نے وہی بات کہی'' پھول لے کر ہوتا کیا؟''

بولے'' پہنتیں اور کیا ہوتا۔''

میں نے کہا'' میں تو قسم کھائے ہوں تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ جس سال مہاتما جی گھور کھپور آئے تھے اور انھوں نے عورتوں کی میٹنگ میں کہا تھا' جس دیش میں مردوں کی کمائی کا اوسط روپے ہو وہاں کی عورتوں کو زیور پہننے کا کیا حق ہے۔ ان کی عورتوں کو زیور نہیں پہننا چاہیے۔ زیور پہنتی ہیں تو اس کے معنی ہیں چوری کرتی ہیں۔ اس سے بہت سی عورتوں نے زیور نہ پہننے کی قسم کھائی' ان میں سے میں بھی تھی۔ تو میری قسم اس وقت کی ہے جب مہاتما جی گورکھپور آئے تھے۔ پھر آپ نے جو ہار لکھنؤ میں بنوایا تھا وہ بھی جیوں کا تیوں رکھا ہوا ہے۔ یہ پھول لے لوں تو اس کو بھی صندوق میں رکھنا پڑے گا۔ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ بینک میں روپیہ رکھا رہے۔ صندوق میں رکھنے کی زحمت سے چھٹی ملی۔ اور بنک کچھ تو روپے کا منافع دیں گے ہی۔ آپ مجھے وہ راستہ بتا رہے ہیں جس میں زحمت تو ہے' آرام کچھ بھی نہیں''۔

آپ بولے'' اگر یہی بات تھی تو اس سال میرے لیے الہ آباد سے انگوٹھی کیوں لے آئی تھیں۔ انگوٹھی کے روپے بھی دیے تھے یا نہیں؟ جب قسم کھائی تھی تو تمھیں خریدنا ہی نہیں چاہیے تھی۔ میں تو تمھارا کہنا مان لوں اور تم نہ مانو!''

'' کون سی ایسی بات ہے جو میں نہیں مانتی؟ ہاں زیوروں کے لیے البتہ قسم کھائی ہے اس میں کہنا کیسے مانوں؟ میں جب عہد کر چکی کہ زیور نہیں پہنوں گی تو اسے کیسے توڑوں۔ بلکہ اس میں تو آپ کو میری مدد کرنی چاہیے''۔

آپ بولے'' مدد کی کیا بات ہے۔ عہد کر لینے کے معنی تو یہ تھے کہ اس دن سے کسی کے لیے زیور بنوائیں ہی نہیں۔''

''اس کے لیے تو میں نے قسم نہیں کھائی تھی'' میں نے کہا ''بال بچے والی ٹھہری' میں خود نہ پہنوں گی تو کیا لڑکے لڑکی بھی نہ پہنیں گے؟''

''اور میں کیا بچہ تھا تو جو میرے لیے انگوٹھی خرید کر لائی تھیں جواب تک میرے ہاتھ میں موجود ہے۔'' وہ بولے۔

''صرف بچے ہی کو تو کوئی پیار نہیں کرتا' پیار بچوں کے لیے بھی ہوتا ہے اور اپنے بڑوں کے لیے بھی۔'' میں نے کہا۔

''اسی لیے تو تم کو بھی کہنا ماننا چاہیے۔ میں تمھاری سب باتوں کو مان لیتا ہوں۔''

میں نے پوچھا ''ایک اس بات کو چھوڑ کر دوسری ایسی کون سی بات ہے جسے میں نہیں مانتی؟ اس بات کو نہ ماننے کی جو وجہ تھی وہ آپ کو بتا ہی چکی۔ اور اس کے لیے مجھے معلوم ہے آپ مجھے معاف بھی کریں گے۔''

بولے ''تم تو خاصی پاگل ہو۔''

صبح کے سے ہمارے گھر کا سب سامان مال گاڑی سے بھیجنے کے لیے پیک ہو رہا تھا۔ آپ کے کئی دوست آئے تھے۔ جو یوپی کے تھے وہ سب سامان مال گاڑی سے بھیجنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ آپ کو ایکا ایک یاد آئی کہ گیا نو کی گاڑی رہ گئی۔

میں نے کہا ''جانے بھی دیجیے۔ الہ آباد میں لے لی جائے گی۔''

مجھ سے بولے۔ ''ارے گیا نو کی گاڑی رہ گئی۔''

آپ بولے ''یہاں گاڑیاں اچھی ملتی ہیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے' مجھے روپے دو' سب سامان تو جا ہی رہا ہے۔ اس کے ساتھ وہ بھی چلی جائے گی۔''

میں نے کہا ''کرایہ دینے کا فائدہ''؟

''یہ تم کیسے کہتی ہو'' وہ بولے ''وہاں چیز بھی اچھی نہیں ملے گی اور روپیہ بھی زیادہ لگے گا۔''

مجھ سے روپے لیے اور خود جا کر گاڑی لے آئے۔ مجھے گاڑی دکھا کر بولے ''دیکھو' یہ ۴۰ روپے کی گاڑی وہاں ۶۰ روپے سے کم کی نہ ملتی۔ کرایہ اگر لگا تو بہت سے بہت چار' پانچ روپے لگے گا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

آپ بولے ''اب سب کے لیے ٹھیک ٹھیک سامان آ گیا۔''

میں نے کہا'' آپ کے لیے تو کچھ آیا ہی نہیں۔''

ہنس کر بولے'' اچھا ہوا' ہم تم دونوں بیٹے کھاتے میں گئے۔ نہ تم نے کچھ لیا' نہ ہم نے کچھ لیا۔''

جب ہم لوگ بمبئی سے روانہ ہونے والے تھے ماکھن لال چترویدی کا کھنڈوا سے تار آیا۔ انھوں نے لکھا تھا'' آپ کھنڈوا آیئے۔''

مجھ سے بولے'' چلو کھنڈوا چلیں۔''

جب ہم لوگ کھنڈوا پہنچے پنڈت جی کئی آدمیوں کے ساتھ پہلے سے اسٹیشن پر موجود تھے جب ہم ان کے مکان پر پہنچے تو پتہ چلا انھوں نے ایک کمرہ پہلے ہی سے ہمارے لیے تیار کر رکھا ہے۔

پنڈت جی کسی کام سے باہر چلے گئے۔ گھر میں ہم دو ہی رہ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا'' کیا پنڈت جی کے گھر میں عورتیں نہیں ہیں؟''

آپ بولے'' معلوم تو یہی ہوتا ہے۔ اچھا آئیں تو ان سے پوچھنا۔''

تھوڑی دیر میں پنڈت جی آ گئے۔ میں نے کہا'' کیا صاحب آپ کے گھر میں عورتیں نہیں ہیں؟''

پنڈت جی بولے'' ہماری ماتا جی اور ہمارے بھائیوں کی بیویاں ہیں۔''

آپ ہنس کر بولے'' سب سے پہلے ان کو اندر لوا لے جایئے۔''

پنڈت جی مجھے لے کر اندر گئے۔ اور سب سے تعارف کرایا۔ پنڈت جی کی ماتا جی مجھے بہت شفیق لگیں۔ وہ مجھ سے کچھ دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ پھر مجھے اندر نہانے کے لیے لوا لے گئیں۔ مردوں نے کھانا باہر کھایا اور عورتوں نے مجھے اپنے ساتھ کھلایا۔ اس کے بعد پنڈت جی ہمیں گھمانے کے لیے لے گئے۔

'' دوسرے دن صبح پنڈت جی ہم لوگوں کو جنگل لوا لے گئے' نہر کا کنارہ تھا جو کھنڈوا سے ۱۵، ۲۰ میل کی دوری پر تھا۔ وہاں پنڈت جی نے ہم دونوں کو ڈال پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک سنترہ رکھتے ہوئے بولے'' اچھا آپ اس کو چھیل کر کھایئے۔ ہم اسی طرح سے آپ کی فوٹو لینا چاہتے ہیں۔''

میں بولی'' نہ میں سنترہ لوں گی' نہ کھاؤں گی۔''

آپ ہنس کر بولے" سارے سنترے ٹوکری کی ٹوکری ان کے سامنے رکھ دیجیے ایسا معلوم ہوگا کہ یہ سنترے بیچ رہی ہیں اور ہم لوگ خرید کر کھا رہے ہیں۔"

میں جھینپتی ہوئی بولی' اگر آپ ایسا کریں گے تو میں ڈال سے اتر آؤں گی ۔ مجھے اس طرح اچھا معلوم نہیں ہو رہا ہے۔"

یہ دونوں آدمی ہنس رہے تھے اور میں جھینپتی جا رہی تھی۔ خیر سنترے ہٹا دیے گئے اور میں نے ہاتھ میں ایک سنترہ لے لیا اور اسی طرح فوٹو لے لیا گیا۔ جب فوٹو ہو گیا تو ہم لوگوں نے سنترے زمین پر بیٹھ کر کھائے۔

" وہ بھی بہت سندر جگہ تھی۔ گھنا جنگل' ندی کا کنارہ' اپریل کا مہینہ تھا مگر دھوپ بہت تیز تھی۔

سنترے کھا کر آپ نے اسی جگہ پڑی ہوئی ایک لکڑی میں سے ایک ٹکڑا توڑ کر اس کی ایک گلی بنائی اور ایک ڈنڈا۔ اور گلی ڈنڈا کھیلنے لگے۔

پنڈت جی بولے" کہو تو ایک فوٹو اس طرح کا بھی لیں۔"

آپ بولے" نہیں صاحب آپ ایسا فوٹو لیجیے گا بھی نہیں' نہیں تو لوگ میری ہنسی اڑائیں گے کہ بڑھوتی میں ان پر گلی ڈنڈا کھیلنے کی دھن کیسی سوار ہے۔"

میں بولی" کیوں اپنی دفعہ کیوں برا لگنے لگا۔ ابھی تو آپ مجھے سنترہ بیچنے والی بنا رہے تھے۔ آپ گلی ڈنڈا کھیلنا کیوں برا سمجھتے ہیں۔ آپ کا گلی ڈنڈا اب بھی گاؤں میں مشہور ہے۔ سب ہی تو گاؤں میں کہتے ہیں کہ آپ گلی ڈنڈا بہت اچھا کھیلتے تھے۔

ہم دونوں آدمی موٹر میں بیٹھ گئے اور آپ پنڈت جی سے گلی ڈنڈے پر باتیں کرنے لگے۔

" صاحب ہم لوگوں کا جیون اب دن پر دن بہت مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک بچوں کا کھیل ہی لے لیجیے۔ اسکول اور کالج میں جو کھیل آج کل بچے کھیلتے ہیں وہ بہت مہنگا ہوتا ہے۔ پہلے گلی ڈنڈا' گولی اور اسی طرح کے بہت سے کھیل تھے جو ان دنوں کے لیے سب سے اچھے تھے اور آج کل کے کھیلوں کو دیکھتے ہوئے بھی کم اچھے نہ تھے۔ ان کھیلوں میں ایک پیسہ بھی کسی کا خرچ نہیں ہوتا تھا اور آج کل کے کھیلوں میں کافی روپے لگ جاتے ہیں۔ مگر کسرت کے لحاظ سے دیکھیں تو دونوں برابر ہیں۔"

اسی طرح کی غور و فکر کی باتیں کرتے کرتے گھر پہنچے۔

پانچ دن ہمارا قیام کھنڈوا میں رہا۔ آپ دو تین اسکولوں میں گئے ۔ دو دن ادیبوں کی میٹنگیں آپ

کی صدارت میں ہوئیں۔ لیکن میں اس دن کے بعد پھر گھومنے گھر سے باہر نہیں نکلی کیونکہ جو آنند مجھے ماتاجی کے پاس ملتا وہ باہر کہاں تھا۔

ایک دن آپ بولے ''چلتی کیوں نہیں ہو''؟

میں بولی ''مجھے تو گھر ہی میں زیادہ اچھا لگتا ہے۔''

ہنس کر بولے ''اب تمھیں وہاں کوئی سنترے بیچنے والی نہیں بنائے گا۔''

میں نے کہا ''اس ڈر سے تھوڑی نہیں جاتی ہوں' حقیقت یہ ہے کہ مجھے یہاں گھر ہی میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ یہاں ماتاجی ہیں۔''

کھنڈوا سے جس روز ہم چلے آپ نے مجھ سے کہا ''چلو ساگر ہوتے چلیں۔ بیٹی کو بھی دیکھ لیں۔''

میں بولی ''آپ نے چٹھی بھیج دی ہوتی تو اچھا ہوتا۔''

آپ بولے ''تار دے دوں گا۔ اسے بھی ساتھ لیتے چلیں گے۔ اگر نہیں بدا کریں گے تو بھی ان لوگوں سے مل تو ہی لیں گے۔''

میں نے کہا ''یہ ٹھیک ہوگا۔''

ہم لوگ ساگر (مدھیہ پردیش) پہنچے۔ اور پانچ روز تک وہاں رہے بھی۔ آپ کے سواگت میں جگہ جگہ میٹنگیں ہوتی رہیں۔ کہانیوں کی کانفرنسیں بھی ہوئیں۔

ایک دن کہانی کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے تو مجھ سے بولے ''تم بھی چلو اور بیٹی کو بھی لیتی چلو۔''

میں نے بیٹی سے کہا۔ ''تم بھی چلونا۔''

بیٹی بولی ''اماں یہاں پردے کا رواج ہے۔ میرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

میں نے ان سے کہا ''بیٹی نہ جا سکے گی اور میری بھی خواہش نہیں ہے۔''

آپ بولے ''چلو بیٹھو' کیا حرج ہے۔''

میں نے کہا ''یہاں لوگ پردا کرتے ہیں۔''

آپ بولے ''پردہ کیسا؟ چلو''

''پردہ ابھی ختم کہاں ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرے گھر میں تو پردہ نہیں ہے۔''

''وقت کے مطابق سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں بوڑھی ٹھہری۔''

بولے''خیر تم چلو۔''

''نہیں میں بھی نہیں جاؤں گی۔''

جب میں نہیں گئی تو وہ واسودیو کے ساتھ گودی میں بیٹی کے بچے کو لے کر گئے۔

پانچویں روز جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو جذبات امنڈ پڑے۔ بیٹی رونے لگی۔ اس کے بچے ہم لوگوں کے ساتھ آنے کے لیے رونے لگے۔

آپ بولے''اس بچے کو لیتی چلو نا۔ تمھارا بھی تو وہاں اکیلے میں جی نہیں لگے گا''

میں نے سمجھایا''بیٹی اور بھی گھبرائے گی۔''

اس پر آپ بیٹی سے بولے''روتی کیوں ہو؟ اسی چھٹی کے بعد دھنو کو بھیجوں گا۔ میں تو اسی خیال سے آیا تھا کہ تم کو لیتا چلوں' مگر ابھی شاید ان کی بہن آنے والی ہیں۔ ٹھیک بھی ہے۔ وہ بے چاری اتنی دور سے آئے گی اور تمھیں دیکھ بھی نہ پائے گی۔ دھنو کو میں بیس پچیس روز ہی میں بھیجوں گا۔''

وہاں سے چل کر ہم الہ آباد آئے۔ اسٹیشن پر ایک رشتے دار کار لیے موجود تھے۔ آپ نے ان سے ہنستے ہوئے پوچھا۔''دھنو وغیرہ کہاں رہ گئے؟ اور تمھیں کیسے خبر ملی؟''

وہ بولے''انھی لوگوں سے۔ تو شاید ان لوگوں کو گاڑی پر آنے کا ٹائم نہ معلوم ہو سکا ہو۔''

''تو چلو بورڈنگ ہاؤس سے ان لوگوں کو بھی لے لیں۔

یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر ایسے جذبات ابھر آئے تھے کہ جیسے اب یہ بنا بچوں کو دیکھے رہ نہیں سکیں گے۔ جیسے قیدی جیل سے چھوٹ کر گھر کے آدمیوں کو دیکھنے کو بے چین ہو۔ سیدھے کار سے بورڈنگ ہاؤس پہنچے اور دروازے پر آواز لگائی۔ دونوں بیٹے اسٹیشن آنے کو تیار ہو رہے تھے۔ آواز سن کر باہر نکل آئے۔

وہاں سے روانہ ہو کر ہم دو دن لکھنؤ میں ٹھہرے۔

میں نے پوچھا''آپ کیا لکر گنج ہی ٹھہرے رہیں گے۔''

آپ نے ہنستے ہوئے جواب دیا ''تو کیسے کہوں کہ نہیں چلوں گا۔''

دوسرے روز آپ میرے بھائی کے یہاں گئے۔ پانچ دن تک ہم لوگ وہاں رہے۔ پانچویں روز آپ مجھ سے بولے ''چلو سوراؤں تمھاری بہن سے مل آئیں۔''

میں نے کہا ''ضرور چلیے۔''

ہم دونوں وہاں بھی ساتھ ساتھ گئے۔ وہاں بھی پانچ دن رہے۔ جب وہاں سے چلنے کو ہوئے تو بہن بولی ''ابھی نہ جانے دوں گی۔ بابو جی انھیں چھوڑتے جائیے۔''

آپ بولے ''یہ تو آپ کی میرے ساتھ ناانصافی ہے۔ گھر میں اور کون ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ جیسے پنجرے میں دو پنچھی ہوں اور ان میں سے ایک کو نکال دیا جائے۔''

بہن بولی ''میری تو خواہش نہیں کہ انھیں جانے دوں۔ میں پانچ۔ دس دن میں کسی کے ساتھ بھجوا دیتی۔ آپ کو تکلیف نہ ہوتی۔

میں نے ان سے پوچھا ''آپ مجھے رہنے نہ دیجیے گا''؟

آپ نے کہا ''تم رہنا چاہتی ہو رہو۔ میں کانپور ہوا آتا ہوں۔''

میں نے کہا ''بنارس ہی کیوں نہیں چلے جاتے''؟

آپ بولے ''اکیلے اس گھر میں مجھ سے رہا نہ جائے گا۔''

میں نے کہا ''آپ تو پریس میں رہیں گے۔''

''آخر رات تو گھر ہی پر کاٹنی پڑے گی'' انھوں نے کہا ''جس گھر میں تم نہیں ہوگی وہاں میں کیسے رہ سکوں گا۔''

میں نے کہا ''اگر یہ بات ہے تو چلیے میں چل رہی ہوں۔''

بہن سے میں نے پرارتھنا کی کہ چھٹی دو۔ ہم دونوں اس کے گھر سے نکلے اور اپنے گھر پہنچے۔ (بنارس میں) دن بھر وہ گھر رہتے۔ پریس تو شاید ہی کبھی گئے ہوں۔ مجھے گھر پر اکیلی چھوڑنے کی ان میں برداشت نہیں تھی۔

ایک روز شہر جا رہے تھے۔ مجھ سے بولے ''تم کیوں نہیں چل رہی ہو؟ تم بھی چلو۔''

میں بولی ''آپ تو چھاپے خانے میں بیٹھیں گے، میں کیا کروں گی؟''

''چلو تمھیں ہم بیلیا پر پہنچا آئیں گے۔ ان کی اماں سے مل لینا۔ آخر یہاں دن بھر بیٹھی بیٹھی کیا کرو گی؟''

میں نے کہا ''نہیں آپ ہی جائیے۔''

بولے ''میں ہی کیوں جاؤں کام ہوتا رہے گا' کبھی پھر چلے جائیں گے۔ مجھے خوشی یہاں ملے گی وہاں کہاں نصیب ہوگی۔ جیسے گیارہ مہینے سے کام چل رہا ہے' ویسے ہی چلتا رہے گا۔ مارو گولی۔''

میں نے پوچھا ''بیلیا پر آپ نہیں جا سکتے''؟

مختصر یہ کہ آپ اس دن نہیں گئے۔

اس کے پانچویں دن الہ آباد سے خط آیا کہ دھنو کو چیچک نکل آئی ہے۔ پتر آپ کو ۷ بجے کے قریب ملا تھا۔

اس دن' دن کو ہم ایک کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ میں سو رہی تھی۔ دو بجے ان کی نیند کھلی۔ دھیرے سے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور جاتے ہوئے دروازہ دھیرے سے بند کرتے گئے۔ اسی سمے میں نے ایک بڑا ڈراؤنا سپنا دیکھا۔ مجھے خواب میں ان کے برابر ہی میں سونے کا دھیان تھا۔ سوپن میں ان کے پیر کو اپنے پیر سے کریدنا چاہتی تھی تاکہ وہ مجھے جگا دیں۔ ایکا ایک دروازہ کھول کر میں ان کے کمرے میں گئی۔ وہ اس وقت کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے گھبرائی ہوئی دیکھ کر بولے ''کیا ہے؟''

''آپ مجھے جگا کر آتے۔ آج کے سپنے سے تو میں بالکل گھبرا اٹھی ہوں۔''

بولے ''مجھے کیا معلوم تھا کہ تمھاری یہ حالت ہوگی۔ اسی وجہ سے میں کہیں باہر نہیں جاتا۔''

شام کو جب دھنو کی بیماری کا خط ملا تو بولے ''کل صبح جانا ہوگا۔''

میں نے کہا ''مجھے بھی لیتے چلیے۔''

آپ بولے ''نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں کوئی اکا' تانگا تو مل نہ سکے گا تم کیسے پیدل چلو گی۔''

میں نے کہا ''نہیں' یہاں میری طبیعت پریشان رہے گی۔''

آپ نے اصرار کرتے ہوئے کہا ''مت جاؤ' بڑی تکلیف پاؤ گی۔''

میں نے کہا ''میری طبیعت گھبراتی رہے گی۔''

آپ بولے ''پچھلے خط میں میں نے اسے ڈانٹا بھی تھا۔ بیماری میں اس سے اسے اور دکھ ہوا ہوگا۔''

''کیوں ڈانٹا تھا؟''

''وہ فضول خرچی کرتا ہے۔''

''روپے کے لیے نہ ڈانٹا کیجیے۔''

''عادت بگڑ جائے گی پھر ان ہی لوگوں کو خود دکھ اٹھانا پڑے گا۔ مجھ سے بولتے بن نہیں پڑ رہا ہے۔ نہ جانے کیسا ہوگا۔''

ہم دونوں صبح ۵ بجے پیدل چلے۔ کچھ دور جانے پر اکا ملا۔ گاڑی چھوٹ گئی۔ تب ہم لوگ لوری سے چلے۔ چار بجے شام کو ہم دونوں پریاگ پہنچے۔ دیکھا کہ دھنو صحت یاب ہو رہا ہے۔ شام ۷ بجے تک ہم لوگ اسی کے پاس رہے۔ اس دن ہم دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔

دھنو جب اچھا ہو گیا تو لگ بھگ اسی وقت چودہ پندرہ دن کی چھٹی بورڈنگ ہاؤس میں ہوئی۔ بورڈنگ ہاؤس کے نوکروں کو دو دو روپے انھوں نے انعام دیے۔ ہم بچوں کو لے کر بنارس آئے۔ بنارس اسٹیشن پر ایک تانگے کو دھنو نے اس لیے واپس کر دیا کہ تانگے والا زیادہ پیسے مانگ رہا تھا۔ وہ دوسرا تانگا بلانے گیا۔ دوسرے تانگے والے کو پتا کرانے میں اسے دیر ہوئی۔ مجھ سے بولے'' دیکھتی ہو لونڈے کو! اگر وہ غریب چار پیسے زیادہ ہی لے لیتا تو کیا ہو جاتا؟ خود کفایت شعاری نہیں کرتے۔ یہ بڑی گندی عادت ہے۔ غریب سے کنجوسی کرنا۔ سنسار بھی عجیب جگہ ہے۔''

میں نے کہا ''اور اگر آپ کی طرح کوئی سادھو نہ بنے تو''

آپ بولے ''بہر حال بری بات ہے۔ جب ہم دوسروں سے حسد کرتے ہیں اور اپنا رونا روتے ہیں تب دوسرے کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کرنا چاہیے۔ آدمی کو دوسروں کو اپنی طرح سمجھنا چاہیے۔ پھر اگر ایسی بات نہ ہو تو دوسروں کے موٹے ہونے پر حسد مت کرو' نہ تمھیں گلہ کرنے کا حق ہے۔ جیسے تم لوگوں کو موٹا نہیں دیکھنا چاہتے' ویسے ہی خود بھی موٹا ہونے کی خواہش مت کرو۔''

میں نے کہا ''یہ تو آپ روس کے ڈکٹیٹر کے لہجے میں بول رہے ہیں۔''

' آپ ہنس کر بولے ''خیر میں تو ویسا نہیں ہوں مگر تم دیکھنا کبھی بھارت کا بچہ بچہ روس کے ڈکٹیٹر سے بھی زیادہ تند خیال ہوگا' تمھیں بھی اس سے غریبوں کے کٹھن کام میں حصہ لینا پڑے گا۔''

میں بولی ''اور آپ کا پھاوڑا۔''

ہنستے ہوئے جواب دیا ''قلم پھاوڑے سے زیادہ طاقت طلب کرتا ہے۔''

میں نے کہا ''پر اس کے چلانے میں گھٹے تو نہیں پڑتے'' یہاں تو دیکھو اور نہ سہی سپاری کاٹنے کا گھٹا تو ہے ہی۔''

آپ بولے ''تمھارے بچوں کا کیا ہے؟''

اتنے میں دھنو تانگا لے کر آ گیا۔ پھر بھی اس سے اور تانگے والے سے کچھ کچھ ہو رہی تھی۔''

آپ بولے ''کیا بک بک کرتے ہو جی۔ تانگا ادھر لاؤ'' قلیوں نے سامان رکھا۔ راستے بھر وہ تانگے والے سے اس کے دکھ سکھ کی کہانی پوچھتے رہے۔

وہاں سے آنے کے تیسرے ہی دن بعد بنّو کو چیچک نکلی۔ پھر وہی پریشانی کا سامنا۔ شام کے وقت اسے ڈھیرے ڈھیرے کوٹھے پر لے جاتے۔ اور اس سے باتیں کرتے رہتے۔ اس درمیان میں نیچے کھانا پکاتی رہتی۔

ایک روز بنّو چارپائی سے اٹھ کر میری چارپائی پر سو رہا۔ میں پہلے ہی سو گئی تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بنّو میری چارپائی پر سویا ہے تو اس سے بڑے پیار سے بولے ''بنّو بیٹا اپنی چارپائی پر جاؤ''۔

....

پیاری رانی

میں تم سے رخصت ہو کر کاشی آیا۔ مگر یہاں تمھارے بنا سونا سونا لگ رہا ہے۔ کیا کہوں تمھاری بہن کی بات کیسے نہ مانتا۔ نہ ماننے پر تمھیں بھی برا لگتا۔ جس سے تمھیں انھوں نے روکا میں جی مسوس کر رہ گیا۔ تم تو اپنی بہن کے ساتھ وہاں خوش ہوگی، مگر میں یہاں پریشان ہوں۔ جیسے ایک گھونسلے میں دو پرندے رہ رہے ہوں اور ان میں سے ایک کے نہ رہنے پر دوسرا پریشان ہو۔ تمھارا یہی نیائے ہے کہ تم وہاں موج کرو اور میں یہاں تمھارے نام کی مالا پھیروں، تم میرے پاس رہتی ہو تو میں حتی الامکان کہیں باہر جانے کا نام نہیں لیتا۔ اور تم ہو کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ میں ۱۵ تاریخ کو الہ آباد یونی ورسٹی میں مدعو کیا گیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ابھی تک نہیں آیا۔ نہیں تو کب کا تمھارے پاس پہنچ چکا ہوتا۔ اس لیے میں صبر کیے بیٹھا ہوں۔ اب تم ۱۵ تاریخ کو آنے کے لیے

تیار رہنا۔ سچ کہہ رہا ہوں گھر مجھے کھائے جا رہا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا سب ہی کی طبیعت اسی طرح فکر مند ہو جاتی ہے یا میری ہی۔ تمھارے پاس روپے پہنچ گئے ہوں گے۔

بنی بہن کو میری نمستے کہنا بچوں کو پیار۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خط کے ساتھ ہی میں بھی پہنچوں۔

جواب جلد لکھنا۔

تمھارا دھنپت

بٹی کو آم زیادہ پسند تھے۔ بٹی جب سے سسرال گئی تھی تب ہی سے آپ پہلے اسے آم بھیج کر بعد میں خود کھاتے۔ سنہ ۳۵ کی بات ہے۔ آپ لکھنؤ گئے تھے۔ وہاں سے دسہری اور سفید ہ لائے۔ جس روز بنارس پہنچے اسی دن بمبئی سے منشی کا تار آیا کہ آؤ۔

آپ بولے "دھنو کے ہاتھ بٹی کو آم بھیج دینا میں تو بمبئی جا رہا ہوں۔"

"دھنو لے جائے تو بات ہے" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں لے جائے گا" انھوں نے کہا" آم کا بٹی کو شوق ہے۔ اگر آم دھنو نہ لے جائے تو اسے جانے بھی نہ دینا۔"

میں نے یقین دلایا" آپ جیسا کہہ رہے ہیں ویسا ہی کروں گی"۔

وہاں سے آپ لوٹے" آم بھیج دیے تم نے؟"

میں نے کہا" ہاں۔"

ادبی بورڈ کی میٹنگ اپریل ۳۶ء میں وردھا میں تھی۔ آپ مجھ سے بولے" وہاں سے لوٹتے ہوئے میں بٹی کو لیتا آؤں گا۔ وہاں خط لکھ دو۔"

میں نے کہا" میں پہلے ہی لکھ چکی ہوں۔"

جب چلنے لگے تو میں نے کہا" دیر نہ لگائیے گا۔"

انھوں نے کہا" ممکن ہے کہ ایک آدھ دن کی دیر ہو جائے۔ کئی جگہ جانا ہے۔ مجھے خود واپس ہونے کی جلدی رہتی ہے۔ ہاں ساگر میں شاید دیر لگ جائے۔"

جس دن لوٹے میں نے دیکھا بیٹی ساتھ نہیں ہے۔ میں دروازہ کھولنے نیچے گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر بنا جواب دیے ہی اوپر چلے آئے۔ میں نے اوپر جا کر پوچھا ''بیٹی کیا ہوئی؟''

آپ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے ''بیمار ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا ہوا ہے؟''

بولے ''گربھ تھا گر گیا ہے۔ مجھے تو پہنچتے ہی ڈوکٹر نے بتایا۔''

میں نے پوچھا ''آپ اس سے ملے کہ نہیں۔''

''ملا کیوں نہیں۔ دو دن رہا بھی۔ اگر اس کی یہی حالت رہی تو وہ بے موت مر جائے گی۔ نہ معلوم ان گدھوں کو کب سمجھ آئے گی۔ اس بیسویں صدی میں بھی یہ گدھے کے گدھے ہی ہیں۔''

میں بولی ''کوئی خود بیماری کر لیتا ہے!''

آپ کا یہ کہتے کہتے گلا بھر آیا کہ ''یہ سب ہمارے کرم کا پھل ہے''۔

اسی رات کو میرے یہاں چوری ہوئی۔ چوری میں ایک ہزار نقد اور ۱۵۰۰ روپے کے زیور گئے۔ چور کا پتہ نہ لگا۔ چوری ایک کھانا پکانے والے مہراج نے کی تھی۔ جب کچھ بھی پتہ نہ لگا تو بولے ''تم زیوروں کا شوق کرتی نہیں۔ تمھارے بکس ہی میں رکھے رہتے تھے۔ اس بے چارے کی بیوی پہن کر خوش ہوگی۔ ہاں تمھیں روپوں کا افسوس ہوگا۔ کیونکہ پریس کے مزدوروں کی تنخواہ دینی تھی۔ مگر اس کی بھی کیا پرواہ۔ کہیں نہ کہیں سے تنخواہ دے ہی دی جائے گی''۔

میں نے کہا ''میرے ڈھائی ہزار نکل گئے آپ کو مذاق سوجھا ہے۔''

اس پر آپ ہنستے ہوئے بولے ''تم ڈھائی ہزار کی چنتا کر رہی ہو آدمی کا ایک دن جیون ہی چلا جاتا ہے۔

اور ہم کچھ نہیں پاتے۔ تم کو تو یہی سوچ کر خوشی منانی چاہیے کہ بیٹی مرنے سے بچی۔ وہ مکمل طور سے اچھی ہو جائے یہی کیا کم ہے۔ سمجھوں گا تین مہینے میں نے مزدوری نہیں کی۔''

میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آ کر بیٹی کو خط لکھنے بیٹھی۔ آپ بھی وہاں سے میرے کمرے میں آ گئے۔ بولے ''کیا لکھ رہی ہو؟''

'بیٹی کو خط لکھ رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

آپ بولے ''ذرا میں لکھ دوں گا''

میں نے پوچھا ''کیوں؟''

آپ بولے ''تمھارے دماغ میں وہی چوری کی بات گھسی ہے۔ اسے بھی لکھ دوگی۔ بیمار لڑکی پڑھ کر اور افسوس کرے گی۔''

میں نے کہا ''آپ ہی لکھ دیجیے۔''

آپ نے خود پتر لکھا۔

جون کا مہینہ تھا۔ دھنو اور بنو کو بٹی کو لانے بھیج رہے تھے۔ دھنو سے بولے ''جاکر باغیچے سے ایک سیکڑہ آم لوا لاؤ۔''

دھنو بولا ''بوجھا ہو جاتا ہے۔ بہن تو اب خود یہیں آنے والی ہے۔''

آپ بولے ''بوجھا کیا ہو جائے گا' تم کیا اپنے سر پر لے کر جاؤ گے۔ بٹی آئے گی پرواسو یہ کو تو نہیں کھانے کو ملیں گے۔ اسے نہیں کھانا چاہئیں؟''

اسے تو کہا ہی تھا' صبح جب آپ گھومنے گئے تو چھ روپے کے آم خریدے اور جب آدمی کو لیے آئے تو مجھ سے بولے ''آموں کو تم ٹھیک ٹھاک طرح سے بند کر دینا۔''

میں بولی ''یہ پکے آم کیا ہوں گے''؟

آپ بولے ''ان بچوں کو دے دینا' نہیں تو یہ بٹی ہی کے آموں میں سے نکال نکال کر کھانا شروع کر دیں گے''۔

سنہ ۳۲ میں بٹی کے بڑا بچہ پیدا ہوا تھا۔ اس کے ہونے کا وہاں سے تار آیا۔ آپ نیچے ہی سے مجھے آواز دینے لگے' ''نیچے آؤ'' ''تمھیں خوش خبری سنائیں۔''

میں آنگن میں کھڑی ہو کر بولی ''کہیے کیا ہے؟''

آپ بولے ''بٹی کے بچہ ہوا ہے۔ دونوں اچھی طرح ہیں۔''

میں نے کہا ''ایشور کو دھنیہ واد۔''

اس کے یہاں جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ دویدی جی کا استقبال کرنے کے لیے بلاوا ملا۔ اسی دن تار بھی آیا کہ بٹی سخت بیمار ہے چلے آیئے۔ پریس میں یہ اطلاع ملی وہاں سے آپ گھر آئے۔ اوپر گانا بجانا ہو رہا تھا۔ آپ نے نیچے سے آواز دی ''اسے بند کرو اور یہاں آؤ۔''

جب میں نیچے پہنچی تو بولے ''اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔''

میں نے کہا'' کہیے' کیا ہے؟''

آپ بولے'' بیٹی سخت بیمار ہے۔ ساگر کے اسپتال میں اٹھا کر لائی گئی ہے۔ اب اس سے کون سی گاڑی جاتی ہے۔

ہمیں روانہ ہونا چاہیے یا الہ آباد تک لوری سے چلیں؟ وہاں سے کوئی نہ کوئی گاڑی مل ہی جائے گی۔''

یہ کہہ کر ٹائم ٹیبل دیکھنے لگے۔ پتہ چلا اس وقت کوئی بھی گاڑی الہ آباد جانے والی نہیں تھی۔

میں نے کہا'' صبح چلیں گے۔''

اس دن انھوں نے نہ کھانا کھایا۔ نہ پانی پیا۔ صبح کے وقت ہم دونوں چلے۔ یہ وہاں سے روانہ ہو کر نو بجے الہ آباد اترے۔ اس کے بعد ساگر جانے والی کوئی ٹرین نہ تھی۔ اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ہم گئے۔ مجھ سے بار بار پوچھتے'' بتاؤ بیٹی کی حالت کیسی ہوگی؟'

میں کہتی'' میں بھلا جانتی ہوں؟ ایشور جانے''

وہاں کچھ دیر ٹھہر کو بولے'' چلو لکر گنج سے خبر لائیں۔''

لکر گنج پہنچے تو پتہ چلا کہ وہاں کوئی خبر نہیں تھی۔''

آپ بولے'' نہ جانے اس کی کیا حالت ہے۔ اب بھگوان ہی کا سہارا ہے۔''

کسی طرح دن بھر مصروف رہے۔ رات کو نو بجے کی ٹرین سے ساگر کو چلے۔ ٹرین میں بھی بار بار اس کی حالت کے بارے میں مجھ سے پوچھتے۔ میں نے ان کی بے قراری کو دیکھ کر خود کو پتھر کا بنا لیا تھا۔

صبح جب کٹنی سے ٹرین کی بدلی ہوئی تو میں نے کہا'' آپ ہاتھ منھ دھو لیجیے۔ بیٹی اچھی ہے۔''

یہ سن کر وہ کھل پڑے بولے'' سچ''؟

میں نے کہا'' ہاں ان لوگوں نے گھبراہٹ میں تار دے دیا۔ آپ ہاتھ منھ دھو کر کچھ ناشتہ کر لیجیے۔''

ایک بجے کے لگ بھگ ہم ساگر پہنچے۔ پلیٹ فورم پر واسودیو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھڑا تھا۔'' بیٹی کیسی ہے''؟ انھوں نے فوراً واسودیو کے بھائی کے پاس جا کر اس سے پوچھا۔

'' اچھی ہے۔''

اس کے ہاتھ میں دو روپے دیتے ہوئے بولے "مٹھائی تو لے لو۔"

جب ہم لوگ ہسپتال پہنچے تو لکشمن سے بولے "پہلے مجھے بیٹی کے پاس لے چلو۔"

بیٹی کو کاٹ (بیڈ) پر پڑی دیکھا بخار چڑھا ہوا تھا۔ بچہ پالنے میں پڑا تھا۔ بیمار بیٹی ہمیں دیکھ کر رو پڑی۔ بیٹی کا رونا سن کر بولے "گھبراؤ مت اچھی ہو جاؤ گی۔" پھر بچے کو دیکھ کر بولے "اس گلاب کے پھول پر ایشور دیا کرے۔"

آٹھ دن تک آپ وہاں رہے۔ آٹھویں دن ایسا معلوم ہوا کہ بیٹی کا بخار اتر گیا ہے بیٹی سے بولے "اب ہم چلیں؟" "تم جیسے ہی مکمل طور سے اچھی ہو جاؤ گی دھنو آ کر لے جائے گا۔"

بیٹی بولی "یا مجھے لے چلیے یا اماں کو چھوڑتے جائیے۔"

"تمھیں لے جانے کی ڈاکٹر کی رائے نہیں ہے بیٹی۔"

مجھ سے بولے "تم رہ جاؤ۔ بچے بھی تو اکیلے ہیں۔"

جب آپ وہاں سے چلے آئے تو اطلاع ملی کہ بیٹی کو پھر بخار چڑھا ہے۔ یہاں آنے پر روزانہ ایک خط آتا ایک جاتا۔ اپنے دوستوں کو تو آپ نے یہاں تک لکھ دیا کہ میری لڑکی کی حالت بہت نازک ہے۔ یہاں جب دونوں بچوں کی چھٹی ہوئی تو انھیں بھی وہیں بھیج دیا تاکہ طبیعت نہ گھبرائے۔

بیٹی کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ گھر پر وہ کوئی دو مہینے اکیلے رہے۔ نہ کھانا ٹھیک سے ملتا تھا نہ پانی۔ پیچش کی شکایت ہو گئی اس دوران دانت میں بھی درد ہوا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ بیٹی کی طبیعت اب کچھ ٹھیک ہو رہی ہے تو واسودیو کو لکھا "بیٹی کی ماں کو بھیج دو۔ دونوں لڑکوں کو روک لو۔ جیسے ہی ڈاکٹر اجازت دے تم دھنو وغیرہ کے ساتھ بیٹی کو پہنچا جاؤ۔"

قصہ مختصر جب بیٹی صحت یاب ہوئی تو اس کی ساس مجھے دیوری لوا لے گئیں۔ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو وہاں واسودیو کے بہنوئی بیمار پڑ گئے۔ اس بات پر مجھے غصہ آیا کہ اب یہ وداع نہیں کر رہی ہے۔ میں جھلا اٹھی۔ واسودیو نے میرے غصے کو ٹھنڈا کیا اور بولے "آپ چلیے تب تک کل صبح میں ہسپتال کے بہانے لے کر آؤں گا۔ آپ تب تک دیوری میں رکی رہیے"

دو روز میں دیوری میں رکی رہی۔ تیسرے روز میں بنارس چلی آئی۔ گھر میں نو بجے کے قریب پہنچی۔ آپ کمرے میں بیٹھے لکھ رہے تھے۔ ہوا یوں کہ جیسے ہی ہمارا تانگہ پہنچا اور آپ نے مجھے دیکھا بولے "تم آ گئیں؟"

میں بولی ''ہاں آ گئی؟''

انھوں نے پوچھا ''تم کیا بیمار تھیں''؟

میں نے کہا ''میں تو بیمار نہیں تھی آپ البتہ بیمار دکھائی دے رہے ہیں۔''

میں آگے بڑھی کہ سامان اتروالوں آپ بولے ''نہیں میں اتروالیتا ہوں۔''

پھر بیٹی کو میرے ساتھ نہ دیکھ کر بولے ''بیٹی کو کیوں نہیں لائیں''؟

میں نے کہا ''پہلے سامان اتروایئے تو میں آپ کو وہاں کا قصہ سناؤں۔''

پھر میں نے وہاں کی داستان سنائی۔ واسودیو کے نہ آنے کی بات بھی بتائی۔ پھر آپ نے بڑے لمبے لمبے خط لکھے۔ میں کھانا کھا کر سوگئی۔ نہ میں جلدی اٹھی نہ آپ نے مجھے جگایا۔

تین بجے قریب جب میں اٹھی تو آپ میرے پاس آئے اور بولے ''میں جا رہا ہوں پرلیس مجھے پان دو'' میں نے انھیں پان دے دیا۔ وہ ادھر پریس گئے ادھر ان کے جاتے ہی واسودیو بیٹی کو لیے پہنچا۔ جب وہ اندر آ گئے تو میں نے لڑکے کو بھیج کر بابو جی کو کہلوایا کہ بیٹی آ گئی ہے۔ آپ دھنو کے ساتھ خود چلے آئے۔ آتے ہی بچے کو گود میں اٹھالیا۔ بولے ''دیکھو اس کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ پھر اپنے آپ کہنے لگے ''ایشور کی دیا ہے کہ بچہ دیا۔''

اس دن سے آپ بچے کو گھنٹوں کھلاتے۔

بیٹی کے آنے کے تیسرے دن یہ طے ہوا کہ اسے لیڈی ڈاکٹر کو دکھا دینا چاہیے کہ اب تو کوئی خرابی نہیں ہے۔ مجھ سے بولے ڈاکٹر تھنگما کو بلاؤ۔'' (Thangama)

میں نے پوچھا ''اس کی فیس کیا ہے؟''

بولے ''وہاں جانے پر ۸ روپئے یہاں بلانے پر ۱۶ روپئے ایک روپے گاڑی کا کرایہ۔''

میں بولی ''کیوں روپے مفت میں پھینکتے ہیں۔ وہیں چلے چلیں۔''

میری رائے انھیں ٹھیک جچی اور انھوں نے تانگا بلایا۔ بیٹی کو لیے میں اتر رہی تھی کہ وہ گر پڑی۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر واسودیو کو لیے لپکے۔ میں نے بیٹی کو سنبھالا۔ آپ جا کر رونے لگے۔ جب میں بیٹی کو سنبھال کر پہنچا چکی تو دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں۔

میں نے کہا ''آپ بھی خوب ہیں۔ کسی کا پیر پھسل جائے تو کیا ہوا۔ بس!''

آپ بولے ''گرتے سب ہی ہیں پر اس کی حالت تو دیکھو۔ بے چاری کو چوٹ کتنی لگی''

میں نے کہا ''کوئی خاص چوٹ نہیں لگی ہے۔ زم بک (ایک مرہم) لگا دیا۔ اب ٹھیک ہے۔''

بولے ''زم بک کہاں ملا؟''

میں بولی ''میرے اوپر جاتے ہی دھنو سائیکل پر جا کر لے آیا۔''

میرے ساتھ ساتھ آپ بھی اتر آئے اور بیٹی سے بولے ''کیسی ہو؟ چوٹ کیا زیادہ لگی؟''

بیٹی نے کہا ''نہیں بابو جی چوٹ زیادہ نہیں لگی ہے۔ زم بک ملنے سے آرام آ گیا۔

اس کے دوسرے دن ایک نائن کو بلوایا اور اس سے بولے ''تم ان دونوں کی خوب سیوا کرو۔ جو کچھ تم مانگو گی وہی میں دوں گا۔ شرط یہی ہے کہ دونوں تندرست ہو جائیں۔''

نائن بولی ''جتنی ممکن ہے میں اتنی سیوا کروں گی۔ یہ تو میری بہن ہی ہیں۔ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔''

نائن اس دن سے رات دن بچے اور بیٹی کی خدمت کرنے لگی۔ بیٹی بھی اچھی ہو گئی اور بچہ بھی۔

اسی بیچ میں نائن ایک دن بیمار پڑی۔ ملیریا ہوا تھا۔ تین چار دن تک اس کی خدمت میں نے اور بیٹی نے کی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا جاتی تھی اُسے حالانکہ ہم نے بہت روکا لیکن وہ مانی نہیں۔ ناچار میں نے اسے جانے دیا۔

جب آپ شام کو پریس سے آئے تو پوچھنے لگے ''رام دئی کی طبیعت کیسی ہے؟ اس کا بخار اترا؟''

میں نے کہا ''اسے بخار تھا لیکن وہ تین بجے کے لگ بھگ اپنے گھر چلی گئی۔''

''کیوں جانے دیا؟''

''روکا تو بہت تھا پر وہ مانتی تب نا۔''

آپ بولے ''اس کے گھر والے سوچیں گے کہ جب تک اچھی رہی تب تک تو رکھا اور جب بیمار پڑی تو یہاں پہنچا دیا۔ یہاں رہتی تو میں اس کی دوا بھی کرتا۔ اچھی ہو جاتی۔ بے چاری کتنی سیوا دونوں کی کرتی تھی۔ اتنی سیوا تو کوئی اپنی بھی نہ کر پاتی۔ تم دونوں کو علیحدہ بڑی مصیبت ہوئی۔ پھر اس کے یہاں بد پرہیزی ہو گی۔ جلدی اچھی بھی نہ ہو گی۔ کل کونین منگوا کر کچھ روپوں کے ساتھ اس کے گھر بھجوا دو۔''

اگلے دن شام کو جب پریس سے لوٹے تو مجھ سے بولے" جو اپنی سیوا کرتا ہو اس کی سیوا کو ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔

ہمارے یہاں تو نوکر کو کوئی آدمی ہی نہیں سمجھتا حالانکہ گھر کے آدمی ہی کی طرح نوکر بھی ضروری ہوتا ہے۔ہم لوگوں میں وہ بات نہیں پائی جاتی جو انگریزوں میں ہے۔انگریز کے نوکر جب مالک کو پانی دیتے ہیں تو مالک کہتا ہے" تھینک یو"۔

میں نے کہا" یہاں لٹھ (گنوار) رہتے ہیں۔ماں بی بی کو تو ڈنڈوں سے پیار کرتے ہیں۔نوکر کو تھینک یو کریں گے؟"

آپ بولے" تب ہی تو پینتیس کروڑ پر مٹھی بھر انگریز حکومت کر رہے ہیں۔اپنے گھر میں ماں بی بی سے سیدھی طرح بات نہیں کرتے انگریزوں کی جوتیاں چاٹتے ہیں۔

جب آپ ناشتہ کرنے بیٹھتے تو گیانو کو گود میں لے کر اسے دو چار چمچے دودھ روز پلاتے' سنترہ چساتے۔کھانا کھا کر اٹھنے پر گیانو کو گود میں لے کر نیچے اتر جاتے۔وہاں گھٹنوں فرش پر لٹا کر کھلاتے۔کبھی کبھی وہ دونوں ہاتھوں سے ان کی مونچھیں پکڑ لیتا۔اس کے ہاتھ کو مونچھ سے دھیرے دھیرے الگ کرتے۔کبھی کبھی وہ اسی جگہ فارغ بھی ہو لیتا۔اسے صاف کر کے اوپر دے جاتے۔بچے جو فرش پر پخانا کر دیتا تو اسے صاف کر کے بچھاون دھوپ میں ڈال دیتے۔جب پتہ چلتا تو کہتی" کسی کو بلا کر صاف کرا لیتے۔"

آپ بولتے" مہاتما جی تو دوسروں کا صاف کر دیتے ہیں' میں اگر اپنے کا صاف کر دیتا ہوں تو کیا حرج ہے۔"

شام کو چار بجے بچے کو گود میں لے کر باہر ٹہلتے۔بعد میں جب دو بچے ہو گئے تو ایک کو گود میں لے لیتے' دوسرے کو انگلی پکڑا دیتے۔وہ بچے ان سے اتنے ہل مل جاتے کہ میں لینا چاہتی تو ان کی گود میں منہ چھپا لیتے۔پانچ بجے پھر سب بچوں کے ساتھ آ کر بیٹھتے۔پاس پڑوس کے جوان لڑکے بھی انہیں گھیر کر بیٹھتے۔ایسی باتیں کرتے کہ وہ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔وہ باتیں کیا ہوتیں نصیحتیں ہوتیں۔ان دونوں بچوں کو بھی تب تک اپنے ہی پاس رکھتے۔اس لیے نہیں چھوڑتے تھے کہ چھوٹے پر وہ بٹی کے پاس جائیں گے اور بٹی وہاں سے اٹھ جائے گی۔

ایک دن آپ بولے" تمھیں اچھا نہ لگتا ہو۔مجھے اچھا لگتا ہے پہلے میرا نام رائے' سے تھا۔اس لیے اپنے بڑے بچے کا نام شری پت رائے اور چھوٹے کا امرت رائے رکھا۔اب میں" چند' کر کے مشہور ہوں اس لیے اس کا نام چند پر ہوگا۔

میں بولی "نام بڑے درشن چھوٹے۔ پتہ نہیں یہ کیسے نکلیں گے۔ کہیں بدمعاش نکلے تو لوگ اس نام کی بھی کھلی (ہنسی) اڑائیں گے"۔

گیانو کو گود میں لیے ہوئے تھے۔ اس کا منہ چوم کر بولے "سن بدمعاش میرے نام کی لاج رکھیو"۔

میں نے کہا "آپ تو یہ واقعی سب سمجھ گیا۔ ابھی سے پڑھا بھی دیجیے۔ بڑے بڑے ناول یہ بھی لکھے گا۔ خوبیاں خامیاں سب اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ آپ کے نانا کون سے بڑے بھاری لیکھک تھے آپ کیسے لیکھک بن گئے۔؟"

آپ بولے "ضرور نانا صاحب میں کوئی بات رہی ہوگی۔ جس سے میں اسی طرح کا ہو سکا ہوں۔ نانا کا اثر نواسے پر کم نہیں پڑتا۔ باپ کی خوبی کے لڑکیاں کم لیتے ہیں"۔

میں نے پوچھا "وہ کیسے"؟

آپ بولے "یہ قدرت کی دین ہے۔ جو خوبیاں خامیاں اپنے لڑکے لڑکیوں میں نہیں ملتیں وہی نواسوں اور پوتوں میں ملتی ہیں۔

سنہ ۱۹۳۵ کی بات ہے بمقام کاشی

رات بھر آپ کو بخار چڑھا رہا اتنا کہ دودھ بھی نہیں لے سکے۔ صبح چار بجے کے قریب بخار اترا۔ بعد میں روزانہ کی طرح ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ ہنس کے لیے ایڈیٹوریل لکھنے بیٹھ گئے۔ دو دھ گرم کر کے جب میں ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا آپ لکھنے میں مصروف ہیں۔ میں نے کہا "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کیا کر رہا ہوں ہنس کے لیے اداریہ لکھ رہا ہوں۔ لکھنا تو کل ہی چاہیے تھا"۔

میں نے کہا "آپ بھی خوب ہیں۔ کل دن بھر اور آج رات بھر پڑے رہے اور صبح ہوئی نہیں کہ لکھنے بیٹھ گئے۔ میں انتظار ہی کر رہی تھی کہ آپ شاید دروازے سے ہی نہیں آئے۔ زیادہ کام ہی سے آپ بیمار بھی پڑے ہیں۔ آج دوسرا دن ہے کھانے کی کون کہے دودھ تک آپ نے نہیں لیا"۔

آپ بولے "پانچ منٹ کی مہلت دو کمپوزنگ کرنے والا آ گیا ہے"۔

میں بولی "اب میں ایک سیکنڈ کی مہلت آپ کو نہیں دوں گی" اور ہاتھ سے قلم چھین کر بولی۔

"اب اٹھیے پیجیے"۔

بولے ارے بھائی میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر وہ کیا کمپوز کریں گے"۔

"میں نے کمپوزنگ وغیرہ کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے" میں نے کہا۔

"ارے بھائی تم نے ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ میں تو ٹھیکہ لیے بیٹھا ہوں۔" "پھر 'ہنس' کیسے چھپے گا۔ وقت پر رسالہ اگر نہیں چھپا تو گاہک یہ تھوڑی سمجھیں گے کہ میں بیمار ہو گیا تھا۔ وہ تو وقت پر 'ہنس' چاہتے ہیں۔ انھوں نے روپے دیے ہیں" میں بولی" یہ کوائف پیچھے کیجیے گا۔ اگر آپ لکھیں گے تو میں پھاڑ دوں گی۔ چلیے اٹھیے۔"

میری اس دھمکی پر اٹھ کر آئے اور ناشتہ لیا۔ وہ ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ نیچے سے آدمی آیا اور بولا 'ہنس' کے لیے میٹر دیجیے۔"

میں نے کہا" چلو ایک گھنٹے میں دیتے ہیں میٹر"

آدمی تو چلا گیا آپ بولے" تم نے مجھے لکھنے نہیں دیا وہاں آدمی بے کار بیٹھے ہیں"۔

میں نے کہا" تو کون سا 'ہنس' موتی اگل رہا ہے۔"

آپ ہنس کر بولے" صاحب 'ہنس' موتی اگلتا نہیں چگتا ہے۔"

میں بولی" ہاں کھاتا ہے۔ جب دیکھو ایک نہ ایک بلا اپنی جان کو پالے رہتے ہیں۔ آپ کو آرام سے رہنا ہی نہیں آتا۔ سوکھ کر ہڈی رہ گئے ہیں۔ وہی مثال ہے' دانا نہ گھاس' کھر یا دن رات' پرسوں رات بھر بخار چڑھا رہا' کل دن رات پڑے رہے۔ آج جب بخار اترا تو سویرے سے 'ہنس' کا چرخا لے کر بیٹھ گئے۔ اور کام ایسا کہ جس کا کن چھپے اور نہ بھوی' ابھی اسی مہینے میں معلوم ہوا کہ ۸ سال کے اندر کوئی تیس ہزار کی کتابیں چھپیں اور 'ہنس' اور جاگرن اور تمھارا پریس سب کھا گیا۔ اگر ان کتابوں کی روشنی ہی ہوتی تو کوئی ۱۲۰۰۰ ہزار روپے بنا کسی محنت کے گھر آ گئے ہوتے۔ اس لئے کوئی تین ہزار روپے کاغذوں والوں کے سر سے دینے پڑے جس کے لیے آپ بمبئی گئے ہوئے تھے۔"

آپ بولے" تم ناحق غصہ کرتی ہو۔"

"میں نے اسی دن آپ سے کہہ دیا تھا کہ ایسے کام سے باز آیئے۔ اس کو چھوڑیئے' مگر آپ تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہیں۔ پھر میں کہتی ہوں' ایسے کاموں سے کیا فائدہ جن کے پیچھے تن' من' دھن کو پوجا کی آگ میں ڈالنا پڑے۔"

آپ میرے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے بولے" رانی تم بھولتی ہو۔ اس میں میں کوئی تیاگ نہیں کر رہا

ہوں نہ کوئی تپسیا۔ جب کوئی تیاگ تپسیا نہ کرتا ہو اور شوق سے اپنا کام کرتا ہو تو اسے (آہوتی چڑھانا) اپنے تن من دھن کو وچار کی آگ میں ڈال دینا کہنا چاہیے۔ جیسے جواری کو جوا، شرابی کو شراب، افیمچی کو افیم میں مزہ ملتا ہے اور اگر اس کو یہ چیزیں نہ ملیں تو پریشان ہوتا ہے تو اس میں اس کا کوئی تیاگ تھوڑی ہے۔ اسی طرح اگر میں کام نہ کر پاؤں تو مجھے سکھ شانتی نہیں ملتی۔"

"یوں کہیے آپ کو بھی نشہ ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں نشہ ہے لیکن اچھا نشہ ہے۔ شاید میرے اس نشے سے کسی شخص کا بھلا ہو جائے۔"

"پہلے آپ اپنا بھلا تو کر لیجیے۔ دوسروں کو کیا ہوگا اس کو تو ایشور جانے۔ خود تو سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں اور دوسروں کی فکر میں دیوانے ہو رہے ہیں۔"

اس پر آپ بولے "دیا ہوتا ہے اس کا کام ہے روشنی کرنا سو وہ کرتا ہے۔ اس سے کسی کا فائدہ ہوتا ہے یا نقصان اس سے اس کو کوئی بحث نہیں۔ اس میں جب تک تیل اور بتی رہیں گے تب تک وہ اپنا کام کرتا رہے گا۔ جب تیل ختم ہو جائے گا تب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس ٹھنڈے چراغ کو نہ تو تم کبھی پوچھتی ہو کہ کہاں گیا نہ دوسری تم کو ڈھونڈنے آتے ہیں۔"

میں غصے اور رنج کے ساتھ بولی "سب چراغ بجھتے ہوتے ہوں گے مگر آپ تو ایک بستی کے چراغ ہیں بجھانے کی چیز نہیں ہیں۔ بجھتی چیز کا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ مگر آپ کے ساتھ تو یہ معاملہ نہیں ہے۔ آپ کے ساتھ تو میں بیاہی گئی ہوں اور آپ میرے ہیں۔ اس لیے مجھے حق ہے کہ میں آپ کی حفاظت کروں اور آپ عرصہ دراز تک میرے رہیں۔"

آپ بولے "یہ تم غلطی کرتی ہو۔ لکھنے والے کی زندگی ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ مجبور ہوتا ہے۔ اس میں تم اور میں کیا کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں مجبور ہیں۔"

میں نے کہا "میں تو آپ سے مجبور ہوں جو کہنا نہیں مانتے۔"

آپ بولے "رانی تم خود ہی مجبور ہو۔ میں دیکھتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ جو روگ مجھے لگا ہے وہ کہیں تم کو نہ لگ جائے۔ اسی لیے بار بار منع کرتا ہوں کہ تم اس بلا میں مت پڑو۔ مگر تم مانتی ہی نہیں۔

پہلے آرام سے تو رہتی تھیں مگر نہیں تم بھی ایک بلا پال رہی ہو۔"

میں نے کہا "میں آرام سے ہوں میں اس طرح کی بلائیں پالتی ہوں کہ جس سے کہ اپنا خون جلے۔"

اس پر آپ نے کہا ''تب ہی تو آپ اتنی تگڑی ہیں!''

جن باتوں پر میں پہلے نکتہ چینی کرتی تھی آج انھیں کو دل سے چاہتی ہوں اور سب سے زیادہ ''ہنس'' کو جس کے لیے نادر شاہی حکم میں نے دیا تھا کہ اگر یہ نقصان دے گا تو اس کو بند کر دوں گی۔ انھی دنوں 'ہنس' کو ہندی پرچار سبھا (بورڈ) کو دے دیا تھا کہ اس کا نقصان کہاں تک برداشت کیا جائے۔ مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں کوئی دس مہینے تک رہا اس کے بعد جولائی کے مہینے میں 'ہنس' سے ضمانت مانگی گئی اور ہندی پرچار سبھا نے اس کو بند کر دیا۔ آپ بیمار پڑے ہوئے تھے۔

آپ مجھ سے بولے ''رانی ایک ہزار روپے بینک سے نکلوا کر جمع کرا دو اور 'ہنس' کو پھر سے جاری کرو۔''

میں نے کہا ''پہلے آپ اچھے تو ہو جائیے۔ ابھی آپ خود تو بیمار پڑے ہوئے ہیں اوپر سے 'ہنس' کی فکر طاری ہے۔''

آپ بولے ''میری بیماری سے اور 'ہنس' کے نقصان کی بحث سے کیا حاصل۔''

میں بولی ''کام کون کرے گا۔''

آپ بولے ''میں آدمی ٹھیک کیے دیتا ہوں۔''

میں نے پوچھا ''آخر پرچہ کون نکالے گا؟ کس آدمی کو ٹھیک کیے دے رہے ہیں؟''

''جینیندر اس کے لیے تیار ہے۔''

دوسرا اسے ہوتا تو میں شاید کچھ بولتی بھی۔

ایک ہزار میں نے بینک سے نکلوا کر جمع کرا دیے۔

جب وہ نہیں رہے کئی دوستوں نے صلاح دی کہ 'ہنس' کو بند کر دو۔ اب بھلا میں اس کو کیسے بند کرتی۔ میں نے لوگوں کو جواب دیا 'بھائی میں اس کو چھوڑ نہیں سکتی۔ سب لوگوں نے کہا کہ ابھی تک تو یہ چلتا تھا اب آگے کیسے اس کو چلائیے گا؟ میں نے ایک ہی جواب ان کو دیا کہ جب میرے پتی پتا ہونے کے ناتے اسے نہ چھوڑ سکے تو میں اس کی ماتا ہوں۔ اور ماں بے کار اور نکمے بیٹے کو پھر ایسی حالت میں جب اس کا پتا نہ ہو شاید زیادہ پیار کرتی ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ لائق اولاد کو تو سب ہی پوچھتے ہیں' پیار کرتے ہیں' اپنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں' لیکن بے کماؤ اور نکمے کو کون پوچھے۔ پھر ماں ڈرتی ہے کہ کہیں بھاگ جائے' زہر کھا کر مر جائے ماں کو چھوڑ کر اس کو کون پوچھنے

والا بیٹھا ہے۔ یہاں تک ہوتا ہے کہ ایشور بھی اچھے ہی کو چن چن کر لیتا ہے۔ پھر دوسروں کا کہنا ہی کیا ہے۔ ایک ماتا ہی ایسی ہے جو اچھے برے سبھی کو چھاتی سے لگائے رکھتی ہے۔ یہی حالت میری اور میرے جنس کی ہے۔

جیتندر کی ماں گزر گئی: ۱۹۳۵ء

جیتیندر کمار کا دلی سے خط آیا کہ ماں مر گئی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے میرے پاس آئے اور بولے ''جیتیندر کا کیا ہو گیا۔ اس کی ماں مر گئی۔''

مرنے کی خبر سن کر میں بھی سنّ ہو گئی۔ بولی ''ہوا کیا تھا؟''

آپ بولے ''ان کو جھوڑ کر (جانندر) بہت پہلے سے تھا۔ باپ تو پہلے ہی مر چکے تھے۔ اب ماں چل بسیں۔ بڑا دکھی ہوگا۔ پھر اس کی ماں بڑی شفیق ہستی تھیں۔ ابھی تک سارا بوجھ انھی کے سر پر تھا۔ جیتیندر گھر کی طرف سے لاپرواہ تو بے فکر رہتا تھا۔ جہاں جی چاہے چلا جاتا تھا۔ ماں اس کے لیے سب کچھ تھی۔ جیتیندر کو اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتی تھیں۔ جتنی ہی کہ وہ خائف رہتی تھیں اتنی ہی دلیر بھی تھیں۔ میں دو بار ان سے ملا ہوں۔ ایسے پیش آتی تھیں جیسے ان کے گھر میں کا ایک فرد ہوں۔ خاطر مدارات بھی اپنوں ہی کی طرح کرتی تھیں۔

''جیتیندر کے ماما بھی تو انھی کے ساتھ تھے'' میں نے کہا۔

''وہ بھی بہت شریف النفس مہاتما کا خطاب غلط تھوڑی ہے۔ دیکھنے میں بھائی بہن الگ معلوم ہوتے تھے۔ پر دونوں کے اندر ایک ہی روح کارفرما تھی۔ اور جیتیندر کو دیکھ کر تم سوچ لو کہ وہ لوگ کیسے تھے۔ اکثر لڑکے باپ کے نہ رہنے پر آوارہ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے لڑکا لڑکی دونوں کو صحیح راہ پر لگا دیا۔ انھیں دونوں کی ریاضت کا پھل ہے کہ جیتیندر ایسا ہے۔ اگر کوئی گنوار عورت ہوتی تو ایسی تربیت دے سکتی تھی؟ اس کا (خط) پیار ہی دونوں بچوں کے لیے زہر ہو جاتا۔ پیار میں جیتیندر ان کی جان تھا مگر اچھائی کے لیے۔ برائی کے لیے نہیں۔ اس بے چارے کے لیے تو دنیا ہی ویران ہو گئی۔''

میں نے کہا ''جیتیندر خود اچھی فطرت کا انسان ہے''

وہ بولے ''لڑکوں کی اچھائی برائی کا پتہ تو بعد میں چلتا ہے اب جو کچھ جیتیندر کریں گے ان ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہوگا۔ پھر وہ بہو اب کیسے رہ سکے گی۔ اس کا پیار کرنے والا تو کوئی نہ رہا۔ وہ تو لڑکی کی طرح ہے ابھی۔''

میں بولی ''چل بھی تو وہی بستے ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی ضرورت یہاں نہیں ہے۔ ایشور کے یہاں بھی نہیں ہے۔''

اس پر وہ بولے ''ابھی جیتیندر کی ماں کی عمر ہی کیا تھی۔ زیادہ نہیں تھی۔ ابھی اسے مرنا نہیں چاہیے تھا۔ اب وہ سب اکیلے ہو گئے۔''

میں نے کہا ''اب تو وہ سورگ سدھار یں۔ انھیں تھوڑی معلوم ہوگا کہ ہمارے جیتیندر کو دکھ ہوگا یا سکھ؟ ابھی کی بات نہ کہیے بے چاری نے تکلیفیں اٹھائی ہوں گی۔ ان تکلیفوں نے انھیں تو کھڑا کر دیا۔ پر خود گر گئیں۔ انھیں کون سکھ ملا؟ کل چار ہی مہینے کا جیتیندر رہتا۔ ان کی عمر بیت گئی بچوں کو پالنے پوسنے میں۔ ان کا جسم ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بے حیا ہوتیں تو شاید زندہ بھی نہ رہتیں۔''

یہ کہتے ہوئے میرے آنسو نکل رہے تھے' ان کی تو یہ حالت پہلے ہی سے تھی۔'

گلا صاف کرتے ہوئے آپ بولے ''اسی سے ایشور پر وشواس نہیں ہوتا اگر سچ مچ ایشور ہے تو کیا دکھیوں کو دکھ دینے ہی میں اسے مزہ آتا ہے۔ پھر بھی لوگ اسے دیالو کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سب کا پتا ہے۔ پھلا پھولا باغ اجاڑ کر وہ دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ دیا تو اسے آتی نہیں۔ لوگوں کو روتے دیکھ کر شاید اسے خوشی ہوتی ہے۔ اگر ایشور ایسا ہی بے رحم ہے تو اسے ایشور کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ جو اپنے دست نگراں (آشرتوں) کے دکھ پر دکھی نہ ہو وہ کیسا آقا (ایشور) ہے۔

میں بولی ''کون جانے کون اس کا دست نگر اپنے کو سمجھتا ہے اور کون نہیں۔''

آپ بولے'' کہنے کو تب سب ہی کہتے ہیں کہ وہ تو سب کا ماتا' پتا ہے۔ پھر یہ کیسی بے رحمی' یہ تو بچوں کا کھلواڑ ہو گیا۔ دن بھر گھروندا تیار کیا۔ لیپا پوتا' شام کو گھر جاتے سمے اسے برابر کر دیا۔ جیسے ان بچوں کے دلوں میں کوئی پریم نہیں۔ کوئی جذبہ نہیں' اس معاملے میں اسے پاگل ہی کہنا ٹھیک ہوگا۔''

میں بولی ''لوگ تو کہتے ہیں اپنے نصیبے کے مطابق'' سبھی کو بھگتنا پڑے گا۔''

آپ بولے ''جب تم لوگ یہ کہتے ہو کہ بغیر ایشور کی مرضی کے پلک تک نہیں جھپک سکتے تو کیسے ایشور ہم سے ناانصافی کراتا ہے۔ جو اچھا سمجھے وہی ہم سے کرائے' جس سے ہم دکھی نہ ہو سکیں۔ کچھ نہیں یہ سب دھوکے میں ڈالنے والے خیالات ہیں بس خود کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لیے یہ ڈھونگ رچے گئے ہیں۔ اور نہیں تو ہم جب بظاہر کوئی برا کام خود نہیں کرتے تو لوگ کہتے ہیں پچھلے جنم میں کوئی برا کام کیا ہوگا' اسی کا یہ پھل ہے۔ اور میں کہتا ہوں یہ گورکھ دھندا ہے۔ اس بے چاری کو یہاں کون سا سکھ ملا۔ جیتیندر کی' آتما اندر سے اس کے لیے تڑپ رہی ہے۔ اس کی تصویر

آنکھوں میں گھوم رہی ہوگی پر وہ اب کہاں ملے گی ۔ اس کا جی جانے کیسا ہوگا ۔ دو بچوں کا باپ ہوگیا پر ابھی تک اسے گرہستی کی ذرا بھی چنتا نہیں تھی ۔ جو کچھ ضرورت ہوتی اسے وہی بے چاری پورا کرتی ۔ اب ان لڑکیوں کو کون پوچھے گا ۔ ایسا لگ رہا ہے اس وقت سب ہی یتیم ہو گئے ۔ وہ بھی تو اکیلی تھی پر سب کا بھار خود اٹھائے ہوئے تھی ۔ میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ چلوں ۔ پر جاؤں کیسے ۔''

انھی دنوں میرے داماد وا سودیو پرساد آئے ہوئے تھے ۔ میں نے کہا ''جب بیٹی چلی جائے تو آپ چلے جائیے گا ۔''

بولے ''اس وقت تم اکیلی رہ جاؤ گی اور اگر میں ایک دن کے لیے گیا بھی تو کیا گیا ۔ یہ تو محض فرض کی ادائیگی ہوگی ۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا ۔''

میں نے کہا ''اگر یہی رونا ہے تو اسے یہاں کیوں نہیں بلا لیتے''

آپ بولے ''یہ سب سے اچھا ہوگا'' پھر تھوڑے توقف سے بولے ''سب سے اچھا میں ہی رہا ۔ کبھی کبھی تو تھوڑی سی تصویر ماں کی میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے ۔ کیونکہ میں جب اس کے دکھوں کا اندازہ لگاتا ہوں تو مجھے اپنے ماں کی تصویر دکھائی دیتی ہے ۔''

میں نے کہا ''تکلیف تو محسوس کرنے کی چیز ہے ۔''

وہ بولے تمھارا کہنا ٹھیک ہے ۔ کیونکہ اگر میری ماں رہی ہوتیں تو میں اس سے کہیں آگے ہوتا ۔ خیر یہ تو سوچنے کی باتیں ہیں ۔ مگر اس بے چارے کو تو ابھی بہت دن رونا ہوگا ۔ اس کے لیے تو آج سنسار ہی سونا ہو گیا ۔ اس کے ماما کو بھی بڑا دکھ ہوا ہوگا ۔ پر کیا کر سکتے ہیں ۔ اس نے اپنی بہن کی پریم میں سارے سنسار کو ٹھکرا دیا تھا ۔ کیا وہ کم دکھی نہ ہوں گے؟ پر کوئی کیا کر سکتا ہے''

میں بولی ''میں تو انھیں دیکھ بھی نہیں سکی''

آپ بولے ''دیکھا ہوتا تو اور بھی دکھ ہوتا''

میں نے ان کو دیکھا وہ کئی دن تک اداس رہے ۔ اپنے میں جیسے کھوئے سے رہتے تھے ۔ ان دنوں جب بھی کوئی بات چھڑتی اس میں ان کا ہی ذکر آجاتا ۔ شاید انھوں نے اپنے دل میں جینیندر کے دکھ کی تصویر بٹھا لی تھی ۔ میرا اندازہ ہے جینیندر کے برابر ہی ان کو بھی صدمہ پہنچا تھا ۔

گاؤں میں آخری بار جانا اور چھجوں کا بنوانا ۔ ۱۹۳۵ء

بمبئی سے لوٹنے کے بعد میں گاؤں رہنے کو چلی گئی ۔ جون کے مہینے میں لڑکی بھی آگئی ۔ مکان کی

چھتیں بری طرح سے ٹپک رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ چھت تو بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ مزدور چھتوں کی مرمت کرنے کے لیے بلائے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ مرمت سے کام نہیں چلے گا۔ چھت پوری بنوانی پڑے گی۔ اس کو ڈھلوانا ٹھیک ہے۔

جس وقت چھت کھودی جا رہی تھی مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ وہیں مزدوروں کے ساتھ موجود ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ کمرے میں کام کر رہے ہوں گے اوپر جا کر دیکھا تو آپ دھوپ میں بیٹھے مزدوروں سے باتیں کر رہے تھے۔

میں بولی" آپ دھوپ میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ چلیے آرام کیجیے۔"

آپ بولے" کیوں نہ میں بھی تھوڑی سزا بھگتوں۔"

میں بولی" یہ سزا نہیں ہے ڈیڑھ دو سو کی چپت پڑ جائے گی۔"

آپ نے ہنستے ہوئے کہا" تم ڈیڑھ دو سو کے لیے روتی ہو۔ ان بے چاروں کی سمجھو جن کا سب مال و متاع بھونچال میں لٹ گیا۔"

میں بولی" یہ تو بھونچال کی مہربانی ہے۔"

آپ بولے" ایشور کو دھنیہ واد دینا چاہیے۔"

میرے منھ سے نکلا" اگر بھونچال نہ آتا تو ابھی اس آفت سے بچ جاتے۔ ایشور پہلے مصیبت ڈالے پھر دھنیہ واد کے لائق ٹھہرے۔"

آپ خود شروع سے آخر تک چھت بنوانے میں لگے رہے۔ اس کے بعد چھجے کی مرمت ہوئی۔

بنی کے بچے کو سوکھا ہو گیا تھا۔ اس کے علاج اور مکان کی مرمت وغیرہ کے جھگڑے میں پڑنا پڑا۔

اگست تک ہم لوگ وہیں رہ کر پھر شہر میں آ گئے۔ تین چار مہینے شہر میں رہے۔ گودان اسی زمانے میں چھپ رہا تھا۔ منیجر سے بھی جھگڑا ہو گیا تھا۔ بنی بھی بچے کے ٹھیک ہوتے ہی دسمبر میں اپنے گھر چلی گئی۔ شہر سے اپنے گھر جانے کی انھیں فرصت نہیں ملی۔ کوار میں دسہرے کے دن بولے" چل کر مکان کی مرمت تو کروا لو۔"

میں نے کہا" دیوالی کے تو ابھی کافی دن پڑے ہیں۔"

بولے" نہیں تو محض بیس روز ہیں۔ اس بار کی طرح پھر سب جلدی جلدی کرنا پڑے گا۔"

میں ہنستی ہوئی بولی "مکان کو جانے کا دل چاہ رہا ہے؟"

آپ بولے "نہیں جی ابھی سے جائیں گے تو آرام سے دھیرے دھیرے کام ہوگا۔"

ہم لوگ دسہرے کو پھر گاؤں گئے۔ ساتھ میں گائے بچھڑے بھی تھے۔ جھوسا کھلی سب وہیں سے پہنچ گئے۔ پھر کام شروع ہوا پھر وہی رنگ روغن سفیدی چلنے لگے۔ خیر دیوالی کے دن خوب اچھی طرح سے دیوالی منائی گئی اور اسی دن آپ مجھ سے بولے "اس سال پانچ سیر تیل آنا چاہیے۔"

دیوالی تو ٹھیک ٹھیک ہوگئی بیٹی کا چھوٹا بیٹا البتہ بیمار پڑا۔ اس کے اچھے ہونے کے بعد جب وہاں سے پھر شہر آنے لگے تو وہی بھیڑ جمع ہوگئی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میں دوسری جگہ برابر آتی جاتی رہتی ہوں تب ہی میری روانگی پر اتنے لوگ کیوں جمع ہو جاتے ہیں جیسے بدیش جا رہی ہوں۔

آپ دروازے پر کھڑے تھے مجھ سے بولے "جلدی کرو دھوپ ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "کیسے جلدی کروں؟ لوگوں سے دو بات بھی نہ کروں تو وہ من میں کیا کہیں گے۔ کیا محسوس کریں گے" پھر میں ایک آدمی سے بولی "ننداں کا پلنگ کرا کرا کے بھیتر رکھوا دو۔"

آپ بولے "دس پندرہ دن میں تو پھر آؤ گی رہا رہنے دو" یہ کہہ کر آپ باہر نکل گئے۔ آپ کافی دیر باہر کھڑے رہے۔ جب بڑی دیر ہو گئی تو آپ بولے "میں چل رہا ہوں۔ تم دیر نہ کرنا۔"

جب مجھے جانے میں دیر ہوتی ہی گئی تو آپ اپنی چچیری بہن کے ساتھ اکے پر آگے بڑھے۔ میرا اکہ پیچھے گیا پھر نہر پر ان کے اکے کے ساتھ میرا اکہ پہنچا۔ آپ اپنے اکے سے اتر کر میرے اکے پر آکر بیٹھے۔

میں نے کہا "بیٹی کو وہاں چھوڑ آئے۔"

آپ بولے "میں نے اکے بان کو سمجھا دیا ہے۔ آ رہا ہے پیچھے۔ میں نے سوچا تم اکیلی اکے پر جا رہی ہو اس لیے ادھر آ گیا۔ میں بولی "اب تک آپ پہنچ گئے ہوتے۔"

بولے "تم کو اکیلی جاتے دیکھنا برا لگتا ہے۔"

وہی آخری جانا تھا۔

بڑے دن پر جانے والے ضرور تھے۔ پر جا نہ سکے۔ بڑے دن سے پہلے بیٹی بھی گھر چلی گئی۔ میں نے بڑے دن پر ان سے کہا ضرور تھا کہ "آپ کا مکان چلنے کا تھا کیا ہوا؟"

آپ بولے'' چلتے تو پر لڑکوں کی چھٹی سات آٹھ دن کی ہو رہی ہے۔ یہاں ضروری کام بھی پورا کرنا ہے۔ گودان بھی تو ابھی نہیں چھپا۔''

ہنس کو مرتب بھی آپ ہی کر رہے تھے۔

''میں یہاں آ جایا کروں گا دن میں۔ وہاں اکیلے رہنے سے تمھیں تکلیف ہی ملے گی۔ ابھی یہیں رہو پھر چلے چلیں گے۔ کوئی نوکر تو ہیں نہیں کہ پھر چھٹی نہ ملے گی۔''

اس بار جب وہ دیوالی پر گھر گئے تھے انھوں نے اپنے پڑھنے کی پرانی چیزیں کتابیں رسالے کاغذات جھاڑ پونچھ کر بڑے اطمینان اور طریقے سے رکھی تھیں۔

'گودان چھپ جانے پر سکون اور آرام سے تین چار مہینے گھر رہنے کا ان کا خیال تھا۔ پر انھیں تو مکمل سکون ملنے والا تھا پھر گھر کیوں جاتے۔ میں البتہ اس گھر میں جاتی ہوں۔ لیکن گھر سمجھ کر نہیں دیوتا کا مندر سمجھ کر۔ مجھے وہاں جانے پر تھوڑی شانتی ضرور ملتی ہے۔ وہیں تو اپنا سب کچھ تھا۔ مگر مندر میں جانے پر جیسی شانتی لوگوں کو ملتی ہے ویسی مجھے نہیں ملتی۔ کیونکہ وہ گھر تو اب دیوتا سے خالی ہے۔ وہاں جانے میں ان لوگوں کو سورگ کی لالچ رہتی ہے اور اس لالچ سے ہی ان کو شانتی ملتی ہے۔ مگر میں تو ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ میرا دیوتا ابھی کچھ دن پہلے وہاں ہنستا تھا، بولتا تھا، کھاتا پیتا تھا سب کچھ کرتا تھا۔ وہ میرا تھا میں اس کی تھی۔ وہ میری پوجا کرتا تھا میں اس کی۔ مندر جانے والوں کو شانتی ملتی ہے پر مجھے درد ملتا ہے۔ مگر یہی درد تو میری جان ہے۔

سنہ ۱۹۳۵ کی بنارس کی بات ہے۔ رات کا سمے تھا ایک ہم دونوں ہی گھر پر ہی تھے۔

میں بولی'' اب کی بار جب کونسل کا چناؤ ہو تو آپ کھڑے ہوئیے۔''

آپ بولے'' مجھے کھڑا نہیں ہونا ہے۔ میں اسی میں اچھا ہوں۔''

میں بولی'' کیوں؟ کھڑے ہونے میں کیا نقصان ہے؟ آپ کانگریس کی طرف سے کھڑے ہوئیے۔''

آپ بولے'' میری زندگی کا مقصد کونسل میں جانے کا نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا'' آپ کی زندگی کا کیا مقصد ہے؟''

آپ نے اس پر ہنستے ہوئے کہا۔'' میرا کام کونسل میں کام کرنے والوں پر نکتہ چینی کرنا ہے۔''

میں نے کہا'' کیا آپ نے نکتہ چینی کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ کہ گھر میں بیٹھے بیٹھے سب پر نکتہ چینی کرتے رہیں؟''

آپ بولے ''جو ادیب کا کام ہے وہی میں کروں گا۔ آخر وہ لوگ جو کام کریں گے تو اس پر رائے زنی کوئی تو دے گا۔''

میں نے کہا ''شاید آپ اسی ڈر سے وہاں نہیں جاتے'' کہ دوسرے آپ پر نکتہ چینی کریں گے۔''

آپ بولے ''یہ بات نہیں ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ جو ادیب ہوتا ہے اس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوتی ہیں برائی اس میں ہوتی ہی نہیں ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید ایشور بھی بے قصور نہ ہوگا۔ اس لیے جب تک ہماری کمزوری یا غلطی کوئی ہم کو سمجھا نہ دے تب تک ہم کو ہماری غلطی کیسے معلوم ہو کہ سچا خیر خواہ اسی کو سمجھنا چاہیے جو ہماری کمزوریاں اور غلطیاں ہمارے سامنے رکھ دے۔''

''اکثر تو تنقید کرنے والوں پر چھینٹے ہی اچھالتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ سچے تنقید کرنے والے نہیں ہوتے، وہ تو تنقید کے بہانے آپس میں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ تنقید کرنے والے کا کام بڑی ذمے داری کا ہوتا ہے۔ اسے جس پر تنقید کرنا ہو اس کے بارے میں پوری معلومات پہلے حاصل کر لینی چاہیے پھر قلم اٹھانا چاہیے۔ یہی تو ادیب کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔''

میں ہنس کر بولی ''تو آپ اس کے لیے اپنے کو ٹھیک سمجھتے ہیں؟''

آپ بولے ''میں کسی پر تنقید میں کبھی حصہ نہیں لیتا، اپنے بس بھر اس سے اپنے کو الگ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں نے کہا ''اسی طرح دوسرے لکھنے والے بھی خود کو سمجھتے ہوں، جو ہم کو برا لگتا ہے۔''

آپ بولے ''اگر ایسا ہوتا تو شاید آج کسی کو اپنے اوپر تنقید بری نہ معلوم ہوتی۔''

اس رات کو بہت دیر تک باتیں ہوئیں اور انھوں نے یہ باتیں مجھے ٹھیک طرح سے سمجھائیں۔ جو مجھے مغالطہ تھا دور ہو گیا تو میں بولی ''پہلے ہی سمجھا کر میرا مغالطہ دور کر دیا ہوتا تو آج مجھے کیوں اتنی دیر تک بک بک کرنی پڑتی۔''

آپ بولے ''اس کے بارے میں تم نے مجھ سے آج سے پہلے پوچھا ہی نہ تھا'' پھر ہنس کر بولے ''تم پاگل ہو۔''

اس پاگل پن کی مثال پر میں بھی ہنس دی۔

اگست-۱۹۳۵ء

کاشی کا واقعہ ہے۔ جس مکان میں ہم لوگ رہتے تھے اسی میں پریس اور بک ڈپو بھی تھا۔ اس گھر میں وہ اور میں بس دو آدمی تھے۔ بچے پریاگ میں پڑھتے تھے۔ لڑکی سسرال میں تھی۔ کتابوں کا اسٹوک بھی اوپر کے ان دو کمروں میں تھا جن میں ہم نہ رہتے تھے۔

رات کے دس بجے ہوں گے۔ ہم دونوں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ اس وقت ہمارا نوکر بھی جا چکا تھا۔ بڑی زور کی بارش ہوئی اور ساتھ ہی آندھی بھی آئی۔ اسی کے ساتھ ہی گھر کی بجلی بھی فیل ہوگئی۔ آپ ہنستے ہوئے بولے ''یہ اچھا مزہ رہا۔ آندھی اور پانی تو گئے تھے ان کے ساتھ روشنی بھی غائب ہوگئی۔''

میں نے کہا ''ہاں' سب مزہ مزہ ہی تو ہے۔''

تو آپ بولے ''کہیں کتابوں کے گھر میں تو پانی نہیں آرہا ہے۔ پر دیکھا جائے تو کیسے دیکھا جائے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔''

میں نے کہا 'کسی طرح تو اندھیرے کو اجالا کرنا پڑے ہی گا۔''

اب لالٹین دیکھتی ہوں تو اس میں تیل ندارد۔ کسی طرح کنوری میں تیل ڈال کر کڑوے تیل کا دیپک جلایا۔ جب کتابوں کے اسٹوک کے کمروں میں پہنچی تو ایک میں تو خیر ٹھیک تھا' دوسرے میں چھت پھٹ جانے سے تیزی سے پانی آرہا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس کے پاس ایک تیسرا کمرہ بھی تھا۔ اس میں جلدی جلدی کتابیں پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر اسٹوک سے وہ کمرہ بھرا تھا۔

وہ بولے ''بھیگنے سے مفت میں بیمار پڑ جاؤ گی۔ جب کوئی تیسرا آدمی ہی نہیں تو کون انھیں ہٹائے۔''

میں بولی ''میں بیمار نہیں پڑوں گی۔ بیٹھے بیٹھے نقصان بھی تو نہیں دیکھا جاتا اور پھر سے بھی نہیں ہے۔ ساری کتابیں چوپٹ ہو جائیں گی۔ اب اس کو ہاتھ لگا کر ہٹانا چاہیے۔''

ہم دونوں بھیگ تو بری طرح گئے لیکن نقصان تھوڑا ہی ہوا۔ کتابیں بچالیں۔ اس کے بعد ہم دونوں نے کپڑے بدلے۔

اسی روز جاڑا دے کر مجھے بخار چڑھا اور کئی دن تک میں بیمار رہی۔ آپ میرے پاس بیٹھے افسوس

کی باتیں کرتے رہتے تھے کہ مجھے تمھارے اوپر کبھی غصہ آتا ہے، کبھی رحم۔ میں اس روز منع ہی کرتا رہ گیا کہ کتابیں بھیگنے دو مگر تم نے نہ مانا۔ تمھاری بھی وہی بچپنے پن کی عادت ہے۔ کہ جان جائے پر جمع جتھا نہ جانے پائے۔"

میں نے کہا "کون میں مری جاتی ہوں۔ یوں ہی اگر بخار آ جاتا اور میں پڑ جاتی تو آپ کس کو دوش دیتے؟

میں تو اسی میں خوش ہوں کہ آپ بیمار نہیں پڑے۔ میں پڑی تو مجھے آرام ہے مگر ہاں اگر آپ بیمار پڑ گئے ہوتے تو مجھے پریشانی ہو جاتی۔"

آپ طنز بھری ہنسی ہنستے ہوئے بولے "کیوں نہیں، اپنا سر بچے۔ دوسرے کا سر بیل برابر۔ تم کو تب برا لگتا جو میں بیمار پڑتا۔ تم اپنی طرح میرے بارے میں کیوں نہیں سوچتی ہو۔ گھر جیسے مجھے کھانے کو دوڑتا ہے اور کام دھندا جائے بھاڑ میں۔"

میں بولی "میں اچھی ہوں اور کافی اچھی ہوں۔ آپ اس کی چنتا چھوڑ دیں۔"

آپ میرے سرہانے بیٹھے تھے۔ ہلکی سی چپت میرے گال پر لگاتے ہوئے بولے "تم پاگل ہو۔"

۱۹۳۶ کی بات ہے۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔

آپ بولے "مجھے دلی جانا ہے۔"

میں نے کہا "کیا کوئی کام ہے؟"

آپ بولے "ہاں، مجھے ریڈیو والوں نے ریڈیو پر کہانی پڑھنے کے لیے بلایا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی اسی مہینے میں تو ہولی بھی ہوگی۔"

"تم بھی چلو" انھوں نے کہا۔

"میری کیا ضرورت آ پڑی۔" میں نے کہا۔

"ضرورت کی بات تھوڑی ہے۔ ہولی میں تم یہاں اکیلی رہ کر کروگی کیا؟" وہ بولے۔

"ایک جانے کی ہی بات تو نہیں ہے، خرچ بھی تو کرنا پڑے گا۔"

ہنستے ہوئے بولے ''تم کو سب سے زیادہ خرچ کی فکر رہتی ہے۔''

''فکر نہ کروں؟ مفت میں پیسے آتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''چلو بھائی۔ تمھیں وہاں روپے مل جائیں گے۔ گھر سے روپیہ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔''

''اگر گھر سے خرچ نہ کرنے پڑیں گے تو کیا آکاش سے ٹپک پڑیں گے؟''

آپ بولے ''سمجھ لو آکاش ہی سے ٹپک پڑیں گے۔ ریڈیو والوں نے مجھے سو روپے دینے کو کہا ہے۔ اس میں شاید دس' پانچ روپے بچا بھی لیں گے۔''

میں نے کہا ''اور اگر میں نہ جاؤں تو اس سے زیادہ بھی بچ سکتے ہیں۔''

وہ بولے ''تم تو ایسی کہتی ہو جیسے ایک دیہاتی کہاوت ہے کہ مرے نہیں تو گھر گھر ہو۔''

میں بولی ''یہ تو اسی طرح ہوا اللہ میاں بڑے سیانے' پہلے کاٹ لیے دو آنے'' ملیں گے تو پیچھے' خرچ آپ نے پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔''

میں نے کہا ''تب کیا آپ دلی جا رہے ہیں یا الہ آباد؟''

اس پر آپ بولے ''الہ آباد آتے ہوئے لوٹیں گے۔ ابھی تو سیدھے دلی جانا ہے۔''

میں نے کہا ''تیوہار کو اپنے ہی گھر رہنا ٹھیک ہوگا۔''

''گھر پر بھی تو سونا سونا رہے گا۔ بلکہ وہاں جینیندر کی موجودگی کی وجہ سے اچھا رہے گا۔ اس کی بہو وغیرہ بھی ہوں گی۔ اس سال اس کی ماں بھی نہیں ہے۔ ان لوگوں کا بھی جی بہل جائے گا''

میں چلنے کے لیے راضی ہوگئی۔ بولی ''روپے بھی کافی ملیں گے۔''

آپ بولے ''وہاں مجھے سو روپے ایک کہانی پر ملیں گے' وہ خرچ ہوں گے۔''

''اگر میں نہ جاؤں تو وہ روپے بچ جائیں گے'' میں نے کہا۔

''تم بھی خوب ہو۔ خرچ سے بھی بچا جائے گا؟''

ہم دونوں سیدھے دلی گئے۔ دلی پہنچنے کے تیسرے دن ہولی ہوئی۔

جینیندر کے یہاں ہم دونوں ٹھہرے تھے۔ ناشتہ کرکے میں' مہاتما بھگوانو دین' آپ اور جینیندر بیٹھے تھے۔

بیس پچیس آدمیوں نے ایک ساتھ آکر ان لوگوں کو نہلانا شروع کیا۔ یہ تینوں رنگ میں بری طرح ڈوب گئے۔ میں ایک طرف کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ایک مہاشے میری طرف بڑھے۔ دوسرے صاحب نے کہا "نہیں نہیں آپ کے اوپر مت ڈالو۔

سب لوگ ایک ساتھ انھیں نہلا رہے تھے اور آپ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو میں نے دیکھا ان کے سارے کپڑے تر ہو چکے ہیں۔ سارے بدن میں رنگ اور گلال بھر گیا تھا۔

میں بولی "آپ تو جیسے رنگ ڈلوانے کے لیے بالکل تیار بیٹھے تھے۔"

آپ نے ہنس کر جواب دیا "ہولی کے دن سبھی تیار رہتے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے" میرے منھ سے نکلا۔

پھر میں نے ان سے کہا "آپ کپڑے اتار ڈالیے نہیں تو زکام ہو جائے گا۔"

انھیں ان دنوں تھوڑی تھوڑی کھانسی ہو رہی تھی۔ کپڑے بدل کر بیٹھے ہی تھے کہ دوسرا غول آگیا۔ جو حالت پہلے ہوئی تھی وہی پھر ہوگئی۔ میں صاف کپڑے پہنے آرام سے بیٹھی تھی۔ اور ان لوگوں کی حالت پر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

آپ نے بھی ہنستے ہوئے کہا "تمھیں ہنسی سوجھی ہے، ہم لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔ واہ!!"

ہم دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ جیتیندر کی بی بی آکر بولیں "اماں ہٹ جاؤ۔ عورتوں کی ٹولی آ رہی ہے۔"

آپ بولے "اب ہٹیں گی کیوں؟"

میں بولی "تو میری بھی آپ ہی کی سی گت ہو جائے گی۔"

آپ بولے "ہولی ہی ہے۔ سوائے اس کے اور کیا ہونا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں صاحب معاف کیجیے۔"

ہم دونوں میں یہ بات ہو رہی تھی کہ (جیتیندر کمار کے ماما مہاتما بھگوان دین) مہاتما جی بولے

"آپ میرے کمرے میں چلے جائیے۔ نہیں تو واقعی وہ لوگ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں چپکے سے دروازے بند کر اندر بیٹھی رہی۔ جب عورتیں ہولی کھیل کر چلی گئیں تو آپ بولے "تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اس طرح کہیں کوئی آدمی گھبراتا ہے۔"

میں بولی ''مجھے بھوت بننا اچھا نہیں لگتا۔''

دن بھر میں انھوں نے دو تین کرتے بدلے، پر سب کے سب رنگ گئے، شام کو میں نے کہا ''اب صاف کپڑے پہن لو۔ کھانسی بڑھ گئی تو مزہ آ جائے گا۔''

آپ ہنس کر بولے ''میں پھول کا بنا ہوا نہیں ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر کہیں بیماری ہو جاتی ہے؟''

شام تک ہم لوگ اس طرح بیٹھے رہے۔

شام کو جب ریڈیو پر اپنی کہانی سنانے جانے لگے تو مجھ سے بولے ''تم بھی چلو۔''

''میں بھلا وہاں کیا کروں گی۔'' میں نے کہا۔

''آئی ہو گھومنے یا گھر میں بیٹھنے؟ چلو چل کر دیکھو ریڈیو پر لوگ کیسے بولتے ہیں'' انھوں نے کہا

''میری طبیعت جانے کو نہیں کر رہی ہے۔'' میں بولی۔

اس دن میں بڑی مشکل سے ان کے ساتھ گئی۔

دوسرے دن اردو اور ہندی کے ادیبوں کی ایک میٹنگ ہو رہی تھی۔ شاید آپ کی ہی تعظیم میں ہو رہی تھی۔

آپ پھر مجھ سے چلنے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ جب میں چلنے پر راضی نہ ہوئی تو آپ بولے'' تم گھر میں بیٹھنے کو اس طرح آئی ہو کہ باہر جانے کے نام سے گھبراتی ہو۔''

میں نے کہا ''وہاں کوئی نئی چیز تو ملے گی نہیں۔ اس میں ادیب اور ایڈیٹر ہوں گے۔ آپس میں تو تو میں میں کریں گے۔ ان لوگوں کے درمیان بیٹھنے کی مجھے سچ مچ خواہش نہیں۔ ان لوگوں سے خدا بچائے۔ یہ دونوں آفت کے گھر ہیں۔''

اس پر آپ نے ہنس کر کہا ''اسی آفت کی ایک شاخ تم بھی تو بن رہی ہو۔''

میں بولی ''میں اپنے کو ان لوگوں سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ کام تو کچھ ہوتا نہیں، بس آپس میں تو تو' میں میں کرتے ہیں۔''

آپ بولے'' کیسے اپنے کو الگ رکھتی ہو؟ ابھی جنوری کے پریاگ مہیلا سمیلن (عورتوں کے جلسے) میں تو تم سبھا پتری بنی ہوئی تھیں۔ جب جانتی ہو تم کو اسی طرح کرنا ہے تب اس سے گھبرانے کا کیا کام۔''

میں بولی ''طبیعت نہیں کہتی تو کیسے جاؤں؟''

اس دن وہ بغیر میرے چلے گئے۔ دوسری صبح ہم لوگ پرانی دلی دیکھنے گئے۔ پہلے قطب مینار کی سی۔ آپ نیچے کھڑے بڑے غور سے ہر ایک چیز کو پڑھنے والی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

مہاتما جی بولے ''اوپر چلیے گا؟''

آپ بولے ''میں تو اوپر نہیں جاؤں گا۔''

میں بولی ''میں تو جاؤں گی۔''

آپ نے ہنس کر کہا ''مینار کے اوپر چڑھ کر اسے پامال کروگی؟''

میں بولی ''وہ کیسے۔ میں دیکھنے جارہی ہوں نہ کہ پامال کرنے۔''

آپ نے کہا ''دیکھو نا تم نیچے ہو وہ کتنا اوپر ہے۔ جب تم اس کے اوپر پہنچ جاؤ گی تو اس کا بھی بڑاپن پامال ہو جائے گا۔''

میں نے کہا ''تو کیا پھر درشن نہ کروں؟''

آپ بولے ''ہاں اکثر ایسے ہی ہوتا ہے۔''

میں ان کی ان باتوں پر گہرائی سے سوچنے لگی۔ میں اسے دیکھتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو گرتے جاتے تھے۔ اس کی تاریخ کو جان کر میرا دل گھٹ رہا تھا۔ اس مینار کو دیکھتی ہوئی میں سوچ رہی تھی ''جانے کتنی یادیں کھو گئیں۔ اس بنانے والوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کوئی کرے تو بے کار ہوگا۔ انسان کو ہمیشگی نہیں ہے جب ایشور کی بنائی ہوئی چیز کو ہمیشگی نہیں ہے تو انسان کی چیز کو کیسے ہوگی۔ یہ ایک تماشہ ہے انسان کچھ بھی نہیں ہوتا۔

رہ رہ کر یہی خیال میرے دماغ میں ناچ رہے تھے۔

ہم سب مینار پر چڑھنے کے لیے ادھر چلے۔ میرے دل میں اتنے جذبات تھے کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بعد میں جب ہم لوگ مینار سے نیچے اترے تو انھوں نے کہا ''تمھاری تو عجیب حالت ہے۔ چلو پرانی دلی دیکھنے چلتے ہیں۔''

پرانی دلی میں میں نے بادشاہوں کے محل دیکھے۔ ان میں ابھی بھی یادیں ناچ رہی تھیں۔ اتنے

دنوں کے بنے وہ محل بالکل تعمیر نو لگ رہے تھے ۔ بادشاہوں کی ہندو اور اسلامی * (مسلمان) رانیوں کے مندر اور محل جدا جدا بنے تھے ۔ دونوں کے طور طریقے الگ الگ تھے ۔ ان محلوں کو دیکھ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ پہلے کے لوگوں میں کتنی ایکتا تھی ۔ وہاں بھی میں آنسو نہ روک سکی ۔

میں بولی " یہ مختلف قسم کی آمیزشیں بہت ہی اچھے ڈھنگ کی ہیں ۔ ان دونوں میں آپس میں خوب پٹتی ہوگی ۔ ایک دوسرے کے بھگت تھے ۔ جتنی کھینچ تان ادھر آپس میں ہو رہی ہے اتنی او رکبھی نہ ہوئی ہوگی ۔

پھر میں بولی " یہ لوگ ہندو لڑکیوں کو کیوں بیاہتے تھے؟ "

آپ بولے " جب شوق سے لوگ ان کے یہاں شادی بیاہ کرتے ہوں تو حرج کیا ہوا مسلمانوں نے سماجی ترقی کی ہے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو برابر سمجھنا چاہیے ۔ "

میں نے کہا " اب تو بہت جلد ان لوگوں کو ایک دوسرے سے راز مٹادینی ہوگی ۔ "

آپ بولے " ہمارے اور ان کے درمیان انگریزوں نے بیر کا بیج بویا ہے ۔ "

میرے منہ سے نکلا " اچھا! "

بولے " جی ہاں ۔ جب سے انگریز یہاں آئے تب ہی سے وہ ان لوگوں کو ابھار رہے ہیں ۔ "

یعنی لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آجانی چاہیے ۔ " میں نے کہا ۔

" پینتیس کروڑ آدمیوں پر یہ ڈیڑھ لاکھ حکومت کر رہے ہیں ۔ " انھوں نے کہا ۔

وہ سارا دن ہم لوگوں نے وہاں بتایا ۔ ایک ایک چیز کو باریکی سے سمجھاتے ہوئے ہم لوگوں کو گھرا لائے ۔

دلی میں ہم آٹھ روز رہے ۔ اس کے بعد ہم پریاگ (الہ آباد) چلے گئے ۔ الہ آباد اترنے پر دوسری ٹرین پکڑنے تک ہمارے پاس تین گھنٹے کا وقت تھا ۔ آپ اسٹیشن ہی پر بولے " تمھارے لیے محض تین گھنٹے ٹائم ہے ۔ "

میں جب بھائی کے گھر پہنچی تو آپ میری بھابھی سے بولے " میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا ۔ "

یہی آپ کی آخری ہولی تھی ۔

میری بھاوجوں نے ان سے ہولی کھیلی ۔ میں نے حالانکہ منع کردیا تھا تب بھی آپ پر خوب ابیر پوتی گئی ۔ آپ خاموش بیٹھے تھے وہ لوگ رنگ لگا رہی تھیں ۔ جب وہ رنگ لگا چکیں تو میں بولی " آپ بھی ان لوگوں کو رنگ لگائیے ۔ "

آپ نے قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے کہا "اس لمبے گھونگھٹ میں چہرہ ملنا تو مشکل ہے۔ اس سے یہی اچھا ہے چپ چاپ بیٹھا رہوں۔"

اس کے بعد بھاوج نے بہتیرا روکنے کی کوشش کی پر آپ یہی کہتے رہے "مکان پر کوئی نہیں ہے جلدی پھر آؤں گا"۔ گھر پہنچی تو دیکھا گھر سونا ہے۔ بھابی نے کھانا بنا کر ساتھ کر دیا تھا۔ ہم دونوں نے کھایا۔

صبح کے وقت وشودھالیہ سے بہت سے آدمی ہولی ملنے آئے۔ میری بھابھی نے ہولی کھیلنے کے لیے مجھے ایک رنگین ساڑی دی تھی۔ میں نے گھر پر اسے پہن لیا۔ جب آدمی لوگ مل کر چلے گئے تو مجھ سے بولے "یہ ساڑی تم پر اچھی نہیں لگتی۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

بولے "یوں ہی جاؤ اس کو بدل دو۔"

میں جا کر ساڑی اتار کر آئی ہی تھی کہ ماسٹر لوگ آ گئے۔ ان لوگوں سے وہی آخری ملاقات تھی۔ کیا وہ بیتے ہوئے دن پھر دیکھنے کو نہیں ملیں گے؟ دن وہی رہتے ہیں اور راتیں وہی رہتی ہیں۔ ساز و سامان وہی رہتا ہے۔ پر وہ آدمی نہیں رہتے۔ تب پھر کیسے کہا جائے کہ وہی دن ہیں۔ دنیا کا کاروبار جیوں کا تیوں چلتا رہتا ہے۔ جن کے اچھے دن بیت جاتے ہیں وہ ہاتھ ملا کرتے ہیں۔ ہاں وہ نہ مٹنے والی تصویر دل کے اندر ایک کسک پیدا کرتی رہتی ہے۔ سچ کہا جائے تو مستقل وہی چیز ہے جو دل کے اندر درد پیدا کرتی رہے۔ جو مٹنے والی چیز ہے وہ اپنی نہیں ہے۔ آج ہے کل نہیں۔ ہاں اپنا درد ہی مرتے دم تک ساتھ رہتا ہے۔

۱۹۳۶ء

اپریل کا مہینہ تھا۔ آپ کو لاہور سے بلاوا آیا۔ کہانی سمیلن تھا۔ مجھ سے بولے "بھائی لاہور سے نیوتا آیا ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ چلا جاؤں۔ مگر یہ بھی سوچتا ہوں کہ تم بھی چلتیں تو بہتر تھا۔ چلی چلو اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

میں بولی "میں ابھی کئی جگہ گئی ہوں تھک گئی ہوں اور پھر دوسری بات گھر پر بھی تو کوئی نہیں ہے۔"

آپ بولے "گھر میں اور بیٹھا ہی کون ہے۔ یہاں اکیلی رہوگی اور مجھے بھی فکر لگی رہے گی۔ ساتھ ساتھ دونوں رہیں گے۔ اور تم گھوم بھی آؤ گی۔"

میں بولی ''مہینوں سے گھومتے ہی تو بیتا ہے' اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں تو خرچ بھی زیادہ پڑے گا۔''

آپ بولے ''ارے بھائی میرا خرچ تو وہ دے ہی دیں گے جنھوں نے بلایا ہے۔ تمھارا خرچ میں دوں گا۔''

میں نے کہا ''تو کیا وہ روپے فالتو ہیں' بنا محنت کے آئیں گے''؟

آپ بولے'' کیسے روپے تمھارے یہاں ہوں جنھیں تم بغیر محنت کے سمجھو؟''

میں بولی ''آکاش سے روپوں کی بارش ہو' تب۔ اور محنت ہی کر کے آئے تو وہ چاہے میں نے دیے چاہے آپ نے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

''تو آکاش سے جب روپوں کی بارش ہوگی تب بھی تو انھیں چن کر ہی رکھنا پڑے گا۔ تب بھی تو محنت ہی ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ سر پر روپے گریں تو چوٹ بھی لگ جائے۔ تب تم شاید چننے بھی نہیں دو گی۔ کہ کہیں چوٹ نہ لگ جائے۔'' انھوں نے کہا۔

''میں جانا ہی نہیں چاہتی ہوں۔ میں گھومنے سے گھبرا گئی ہوں بلکہ یہ خواہش بھی نہیں ہے کہ آپ کو بھی جانے دوں۔ کم سے کم دس پندرہ دن لگ جائیں گے۔ آپ وہاں رہیں گے اور میں گھر میں بیٹھی گھبرایا کروں گی'' میں نے کہا۔

''میری مرضی خود جانے کی نہیں تھی مگر جانے سے بچ سکوں تب نا۔''

''لیڈر رہنا کیا آسان ہے'' میں نے طعنہ کستے ہوئے کہا۔

''ارے بابا کون لیڈر بننے کا خواہش مند ہے۔'' انھوں نے کہا'' میں تو تمھیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ گھر میں بیٹھا کام کرتا ہوں' مجھے ہی کون باہر آنند مل جاتا ہے! ایک تو کام کا نقصان ہو دوسرے پریشانی۔ گئیں تو تم بھی تھیں کیا آنند ملا؟ دوبارہ چلنے کا نام تک نہیں لے رہی ہو حالانکہ میرے ساتھ گئی تھیں۔ مجھے تو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ تس پر تمھاری چنتا۔''

میں نے کہا'' جائیے صاحب' آپ ٹھہرے ادیب۔ آپ سے بحث میں کون جیت سکتا ہے۔''

جس تاریخ کو آپ آنے کو کہہ گئے تھے آئے اس کے تیسرے دن۔ جب آئے میں جھلائی ہوئی بیٹھی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی میرے منھ سے نکلا'' اچھا! آپ بہت جلد آگئے۔ جس تاریخ کو آنے کا

پ کہہ جاتے ہیں اس تاریخ پر آپ کبھی نہیں آتے۔ اور جب جاتے ہیں تو شاید گھر والوں کی یاد بھی نہیں رہتی۔ اور شاید کبھی یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس دیری کا گھر والوں پر کیا اثر پڑتا ہوگا۔ جاتے وقت تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی جانے کی مطلق مرضی نہیں ہے مگر وہاں جا کر یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ وہاں گھر پر ہمارا کوئی انتظار بھی کرتا ہوگا۔ آپ کو نہیں معلوم ہوگا کہ یہ تین دن میں نے کیسے کاٹے ہیں۔ میں تو تار دلوانے جا رہی تھی۔ جب منیجر کو بلوایا تو اس سے معلوم ہوا کہ شاید وہاں نہ ہوں۔ چل دیے ہوں گے۔ اسی طرح کرتے کرتے آج تیسرا دن ہے۔"

میرے منھ پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولے "پہلے پاگل رام میری بات تو سن لو۔"

میں تنک کر ایک کھڑی ہوگئی اور بولی "میں بات نہیں سنتی۔ آپ نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔"

آپ بولے "ارے بھائی میں تو خود ہی تمھارا قیدی ہوں۔ میں تم کو چھوڑ کر بھاگنے والی ہستی تھوڑی ہوں۔ میں تو تم سے اسی لیے کہتا تھا کہ تم میرے ساتھ چلو۔ تم چلیں ہی نہیں۔ میں تو جانتا تھا کہ بلاتے لوگ ایک کام کے لیے ہیں مگر وہاں جانے پر سب کو میری ضرورت ہو جاتی ہے۔ سنو میں تو خود گھبرا رہا تھا کہ تم گھر میں اکیلی ہو۔ وہاں کئی جگہ مجھے لیکچر دینا پڑا۔ ایک دن تو لیکچر میں دیری ہوگئی۔ کئی جگہ لوگ پکڑ لے گئے۔ کل دن بھر مجھے بخار چڑھا رہا۔ رات کے دو بجے بخار اترا ہے میں جن کے مکان میں ٹھہرا تھا صبح ان کو خبر بھی نہیں دی چپکے سے تانگہ کر کے اسٹیشن بھاگا ہوں تب جا کر دس بجے کی گاڑی ملی ہے۔ اور اس وقت گھر پہنچ پایا ہوں۔ پرسوں کا کھانا کھائے ہوں۔"

میں نے پوچھا "آخر آپ نے ان لوگوں کو خبر کیوں نہیں دی۔ وہ کیا سمجھے ہوں گے۔"

آپ بولے "ان کو خبر دیتا تو آج بھی نہیں چھٹکارا پاتا۔ کہتے رات بھر آپ کو بخار چڑھا رہا ہے آج جانے نہیں دیں گے۔"

میں بولی "اچھا وہ ایسے بھلے مانس تھے کہ آج بھی نہ آنے دیتے۔"

وہ بولے "اچھا تم ہی بتاؤ کہ تمھارے گھر کوئی آتا اور بیمار پڑ جاتا تو تم اسے جانے دیتیں؟ اور کئی بار میں دیکھ بھی چکا ہوں کہ میں شاید مان بھی جاؤں مگر تم تو کبھی جانے نہیں دیتیں۔"

میں نے کہا "میں تو میں ہوں۔"

تس پر آپ بولے "تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنے منہ پر طمانچہ مارا۔ تمھاری ہی ہار ہوگی۔ جیسے تمھارے گھر کوئی آتا ہے تو تم اس کی ذمہ دار ہو جاتی ہو اسی طرح جب دوسرے اپنے یہاں بلاتے ہیں تو وہ

بھی اسی طرح مہمان کے ذمے دار ہو جاتے ہیں۔ مان لو سفر میں میری طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی تو تم کس کو دوش دیتی" انھی کو تو۔"

میں نے کہا" اب لڑائی جھگڑا جانے دیجیے' میں تھوڑا گرم دودھ لاؤں' پی لیجے اور کچھ دیر آرام کیجئے۔"

بولے" ہاں لاؤ' تھوڑا سا دودھ پی لوں۔ اور شاید تم نے بھی کچھ نہیں کھایا ہے۔"

"میں کیوں نہ کھاتی' میں تو گھر پر تھی۔" میں نے کہا۔

آپ بولے" سچ بتاؤ۔" میرا خیال ہے تم نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔"

"کھاتی کیوں نہیں' کھایا تو ہے۔" میں نے پھر کہا۔

بولے" منہ سوکھا سا معلوم ہوتا ہے' میرے خیال میں تو تم نے خود کو بھوکا رکھا ہے اسی غصے میں بیٹھی رہی ہو۔ تمھیں میری قسم سچ بتاؤ۔"

ان کے قسم دینے پر مجھے بتانا پڑا کہ میں نے بھی دو دن سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ مجھے چڑتا ہو رہی تھی اور ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔ میں نے کہا" میں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔

آپ بولے" تم بے وقوف آدمی ہو۔ اکیلی رہو تو تم کھانا ہی نہیں کھاؤ۔ چلو تم بھی دودھ پیو۔ میرا خیال ہے تم نے کھانا بنایا ہی نہیں ہے۔"

وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چوکے میں گئے۔ انھوں نے خالی دودھ ہی پیا۔ میں بھی تھوڑا دودھ پی کر پان لے کر ان کو دینے لگی۔ پان لے کر بولے" میرے سر میں کچھ درد سا ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا سر میں تیل مل دوں۔"

آپ بولے" نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

میں نے تیل لے کر ان کے سر کی مالش کی۔ مالش کے بعد بولے" درد بھاگ گیا۔"

میں نے کہا" تو اب سر میں کنگھی کر دوں؟"

آپ کنگھی کرواتے ہے بولے" اگر کوئی آ جائے اور دیکھ لے تو کیا ہو؟ اپنے دل میں یہی سوچے گا کہ اچھے رئیس ہیں' بی بی سر میں تیل بھی ملے اور کنگھی بھی کرے۔"

میں بولی ''تو کیا کوئی جرم ہے؟ اپنے گھر میں بھی لوگ اس طرح کرتے ہیں۔''

بولے '' کہاں تک خدمت کروگی۔ لاؤ' میں تمھارا ہاتھ داب دوں۔ خیر صاحب مت دبواؤ۔ میرے اوپر ڈانٹ بھی پڑی' خدمت بھی ہوئی' میں ہی اچھا رہا۔''

پہلے یہ باتیں روزمرہ کی تھیں' آج وہی کہانی ہو رہی ہیں۔ آدمی کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کو کبھی کوئی بھول کر بھی نہیں سوچتا۔ اب اس سے کہیں زیادہ درد ان واقعات کو سوچنے میں ہو رہا ہے۔ میں نے کیا یہ سوچا تھا کہ یہ کہانی مجھے کبھی لکھنی پڑے گی؟ مگر نہیں۔ وقت سب کچھ کروا لیتا ہے۔ انسان وقت کے ہاتھ میں کھلونا ہے۔ جس طرح وقت کھلواتا ہے انسان اسی طرح کھیلتا ہے۔ اسی میں ایک میں بھی ہوں۔

مئی ۔ ۱۹۳۶ء

''گودان'' چھپ چکا تھا۔ منگل سوتر کا پلاٹ سوچ رہے تھے۔ چھپ کر گودان میرے پاس پڑھنے کو آیا۔ میں اسے پڑھ رہی تھی۔ آپ اپنے کمرے میں اکیلے تھے۔ میں اپنے کمرے میں تھی۔ میں ہوری کی موت کی بات پڑھ رہی تھی۔ اس کی موت پر مجھے رلائی آ گئی۔ روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ آپ کمرے سے پان کھانے کے بہانے میرے کمرے میں آئے۔ وہ اپنے کمرے میں اگر اکیلے ہوتے تو کسی نہ کسی بہانے سے میرے کمرے میں ضرور آتے۔ میں رونے میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ ان کے آنے کی مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔ میرے پاس بیٹھ کر وہ بولے'' بتاؤ روتی کیوں ہو؟''

میں کیا جواب دیتی کیوں کہ میں بول تک نہیں پارہی تھی۔ مگر انھیں میرے رونے کا کارن معلوم ہو گیا۔ گودان کی کھلی کتاب میرے سینے پر پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر الگ رکھتے ہوئے بولے'' تم بڑی پاگل ہو خیالی باتوں پر رونے بیٹھ جاتی ہو۔ اس پر آپ کو ناز ہے کہ عورتوں کو رونے کا مرض نہیں ہوتا۔ اب کیوں خود ایسا کر رہی ہو؟ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ باتیں خیالی ہیں! بھلا کسی دوسرے کا لکھا ہوتا اور تم روتیں تو ایک بات تھی'' میں جھینپ کو مٹاتی ہوئی بولی'' آپ نے اس بے چارے کو مارا کیوں؟ اس بے چاری جھنیا کو بیوہ بنا دیا۔''

تب آپ ہنس کر بولے'' تم ہار گئیں۔ اس کا تمھیں جرمانہ دینا پڑے گا۔ چل کر میرے کمرے میں بیٹھو۔''

اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں پنکھا لگا ہوا تھا۔ اسے کھول کر بولے'' اب مجھے پان تو کھلاؤ' اور ہنس دو تو تمھیں اپنے ناول کا پلاٹ سناؤں۔''

میرے ساتھ ہی وہ میرا پان کا ڈبہ (پاندان) بھی لے گئے تھے ۔ میں نے ان کے منھ میں دو بیڑے پان دیے اور بولی ''ابھی نہیں سنوں گی ۔''

آپ بولے ''مت سنو ۔''

میں نے کہا ''میرا دل نہیں چاہ رہا ۔''

پھر وہ بولے ''نہ معلوم تم کب سے رو رہی ہوگی ۔ اچھا تم سو جاؤ ۔ کہو تو میں تمھارا سر دبا دوں ''

میں بولی ''نہیں ' میرے سر میں درد نہیں ہو رہا ہے ۔''

میرے منع کرنے پر بھی انھوں نے میرا سر دبانا شروع کر دیا ۔ مجھے نیند بھی آ گئی ۔ وہ کب تک میرا سر دباتے رہے اس کا مجھے ذرا بھی ہوش نہیں ۔ جب میں سو کر جگی تو ان کی اس حرکت پر مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی ۔

کیا ان سب باتوں کو سوچ کر میں سکھی رہ سکتی ہوں ؟

۱۹۳۵ء

میں شہر میں تھی ۔ گاؤں سے ایک نائن آئی' اس کا لڑکا بغیر بتائے بھاگ گیا تھا ۔ وہ اسے دیکھ کر بولے ۔

''کیا حال چال ہیں ؟''

اس نے لڑکے کے بھاگنے کی بات ان سے کہی ۔

آپ بولے ''آخر وہ بھاگ کر گیا کہاں ؟''

وہ بولی ''آج آٹھ دن سے پتہ نہیں ہے ۔''

ان آٹھ دن میں وہ بھی مریض جیسی ہوگئی تھی ۔

آپ نے پوچھا ''کیا تم بیمار تھیں ؟''

وہ بولی ''میں بیمار نہیں ہوں ۔ یہ لڑکے کی چنتا سے ایسی حالت ہوگئی ہے ۔''

''بچہ تو ہے نہیں جو گھبراتی ہو ۔ اب تو اسے تمھاری فکر کرنی چاہیے ۔'' انھوں نے کہا ۔

''وہ رو رو کر مری جا رہی ہے ' خبر ہے ؟'' میں نے کہا ۔

''فضول رونا نہیں چاہیے۔''

''نہیں، فکر تو ہوتی ہی ہے۔''

آپ بولے ''بچہ تو ہے نہیں۔ جوان ہے اسی لیے بھاگ گیا۔ خودغرض ہے، نالائق ہے۔ تو آرام سے نہیں رہ... وہ تیری فکر نہیں کرتا تو جب اس کی مرضی ہوگی چلا آئے گا۔ جوان لڑکوں کے بھاگنے پر رونا نہیں چاہیے۔ لڑکی بھی تو نہیں ہے کہ بدنامی کا خوف ہو۔''

وہ بولی ''جی نہیں مانتا نہ چاچا جی۔''

آپ بولے ''اگر وہ بیمار ہوتا تو تمھاری چنتا صحیح بھی جاتی۔ یا کوئی اسے جبرا پکڑ لے گیا ہوتا۔ تب رونا چاہیے تھا۔ تب تم اس کی فکر کرتیں۔ جب اس میں پریم نہیں ہے تو اس کی کیا دوا۔''

اس نائین نے اپنے بچوں کو بڑی کٹھنائی سے جلایا تھا۔ وہ اپنے پرانے دنوں کو یاد کر کے رو پڑی۔

آپ بولے ''تم بے کار کیوں جان دیے جا رہی ہو۔ تمھیں وہاں اچھا نہ لگتا ہو تو یہاں پڑی رہو۔ مجھے اس طرح کے لڑکوں پر رحم نہیں آتا۔ تجھے جو ضرورت ہو اپنی چاچی سے مانگ لیا کر۔''

میں بولی ''یہ لونڈے کے لیے مر رہی ہے اسے چاہیے کیا۔''

وہ بولے ''یہ اس کی غلطی ہے، کہہ تو دیا۔''

''کہاں تک صبر کرے۔'' میں نے کہا۔

ایک مہینے تک وہ پریشان رہی۔ جب وہ آتی تو اسے اسی طرح سمجھاتے۔ اسی بیچ میں وہ روتے روتے ہمارے یہاں بیمار پڑ گئی۔ آٹھ دن تک اسی جگہ پڑی رہی۔ دوا اپنے ہاتھ سے اسے دیتے۔ آٹھ روز کے بعد اس کا دوسرا لڑکا آیا اور اسے لوا لے گیا۔ اس کے جانے کے سمے وہ گھر پر نہیں تھے۔ لوٹنے پر سنا تو بولے۔

''ناحق جانے دیا۔ اپنے دل میں اس نے کیا سوچا ہوگا۔''

''میں بھیجنے تو نہیں گئی تھی۔ اس کا لڑکا آکر لوا لے گیا۔ میں تو اسے روک رہی تھی پر وہ نہیں مانی۔'' میں نے کہا۔

اس کے لیے انھوں نے کئی بار روپے بھجوائے۔''

ان کا اصول تھا کہ نوکر کو نوکر مت سمجھو۔ نوکر تو اپنا ایک مددگار ہوتا ہے۔ تم کو نوکر کی ضرورت ہوتی

ہے نوکر کو تمھاری۔ دونوں کو ایک سی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔ وہ ہم لوگوں کو اکثر اسی طور سمجھاتے تھے۔ اور سب لوگوں کو بھی یہی سمجھایا کرتے تھے اور ان کے سامنے اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔

اتنی بڑی بیماری میں، میں نے انھیں صرف دو بار غصہ کرتے دیکھا نہیں تو زیادہ تر شانت رہتے تھے۔ روگی تو کرودھی اور چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ پر وہ ایسے نہیں ہوئے۔ ہمیشہ پرسکون رہے۔ نہ پہلے غصیل اور چڑچڑے تھے نہ بیماری میں ہوئے۔ صبح جیسے ہی انھیں ناشتہ کروا چکتی ویسے ہی میرے ناشتے کی فکر انھیں ہو جاتی۔ جب تک میں ناشتہ نہ کر لیتی وہ ہٹ کرتے ہی رہتے۔ انھیں ہمیشہ میرا خیال رہا۔

ایک روز ان کا غصہ دیکھ کر میں گھبرا گئی۔ دھنو کو پریس میں کچھ چھپوانے کے لیے کہا تھا۔ دھنو سے پوچھا۔ ''چھپا۔''

دھنو نے کہا ''ابھی نہیں۔''

زور سے ہاتھ پٹختے ہوئے بولے ''کیوں نہیں چھپا''؟

میں نے پرارتھنا کر کے کہا ''کیا ہے؟ یہ آپ کیا کرتے ہیں؟''

وہ ہانپتے ہوئے بولے ''اس لونڈے کو دیکھتی ہو۔ میرا کہنا نہیں مانتا۔''

میں بولی ''لڑکا ہی تو ہے۔ بھول گیا ہوگا۔''

آپ بولے ''نِکھٹو آدمیوں پر مجھے کرودھ آتا ہے۔ یہ تھوڑا بہت کام کیا دیکھنے لگا ہے کہ سمجھتا ہے میں بہت لائق ہو گیا۔''

میں بولی ''کرودھ نہ کیجیے۔ ابھی بچہ ہے، گھبرا گیا ہے۔''

اس روز وہ شانت ہو گئے۔

ایک روز چارپائی ہی پر پاخانہ ہو گیا۔ ان کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ میں پاخانہ صاف کر رہی تھی۔ میرے منھ سے نکلا ''سارے کپڑے گندے ہو گئے۔''

انھوں نے سمجھا شاید جل کر میں نے ایسا کہا ہے۔ اس پر بولے ''میرے نزدیک مت آنا، مرنے دو'' اس دن میں گھبرا کر بولی ''غصہ مت کیجیے۔''

جب چپ ہو گئے تو ساری بات میں نے سمجھائی "میری بدقسمتی ہے کہ آپ بیمار ہیں۔ آپ کے لیے بھلا میرا ایسا فیصلہ ہو سکتا ہے۔"

آپ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے "مجھے معاف کر دو رانی۔"

میں نے کہا "مجھے کوئی اپنا دکھ تھوڑی ہے۔ ہاں اس کا دکھ ضرور ہے کہ کرودھ کرنے سے آپ کی کمزوری بڑھ جائے گی۔ آئندہ آپ کرودھ مت کیجیے گا۔"

دو بار کرودھ کرتے میں نے انھیں دیکھا ہے۔ مگر مجھے ڈانٹنے کا انھیں افسوس ہوا تھا۔ جس آدمی نے اپنی زندگی میں سب کو سکھی رکھنے کی کوشش کی ہو وہ مہان آتما کسی کو بھی دکھ پہنچا سکتی تھی؟ میں تو خیر ان کی ہی تھی۔

۱۹۳۶ء کی جنوری

صبح آپ گھوم کر گھر لوٹے۔ ناشتے کے لیے آئے تو ہنس کر بولے "کھانے کو تو اچھی سے اچھی چیزیں کھاتا ہوں مگر جسم میں کچھ بل نہیں محسوس ہوتا۔ میں گھومنے جاتا ہوں تو پیر تھکے تھکے سے لگتے ہیں۔"

میں بولی "آپ کو بمبئی میں بھی تو اسی طرح محسوس ہوتا تھا۔ آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھلا دیجیے اور دوا شروع کیجیے۔ پتہ تو چلنا چاہیے۔ تاکہ آخر ایسا ہوتا کیوں ہے۔"

آپ بولے "تم بھی عجب آدمی ہو۔ ذرا سی بات سن کر تل کا تاڑ کر دیا۔ ایسے ہی ہو جاتا ہے۔ پھر میں بھی تو اب ساٹھ کے لپیٹے میں ہوں۔ کام ہو تو جوانوں سے بھی بہتر کر سکتا ہوں۔ پھر کیا کیا جائے؟ اب دن پر دن ایسے ہی بیتیں گے۔ جس بڑھاپے کو میں ختم کرنا چاہتا ہوں وہ اب شاید مجھ پر ہی حاوی ہونے والا ہے۔ میں بھی جلدی ہار ماننے کا نہیں کیونکہ اگر میں اس کا لوہا مان جاؤں تو وہ مجھے اور ستائے گا۔ اس سے زیادہ مضبوط بن کر اس سے لوہا لینا پڑے گا۔"

میں غصے سے بولی "تمھاری ہمیشہ کی پینے کی عادت ہے۔ اسے بھلا تم چھوڑ سکتے ہو۔"

آپ بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولے "جب میں اسے اب تک نہیں چھوڑ سکا تو اب بھلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ ایک طرح سے وہ اب میرا پیشہ ہو گیا ہے۔ اب وہ وہ الگ تھوڑی ہو سکتا ہے۔" یہ سن کر مجھے اور بھی غصہ آیا۔ میرے منھ سے نکلا اگر اس سے تمھاری ماں ہوتیں تو بنا تمھیں دو نمبر کیے یہ ہرگز نہ مانتیں۔"

اس پر آپ اسی طرح ہنستے ہوئے بولے ''وہ ہوتیں تو میری ایسی عادت پڑتی ہی کیوں۔''

''تو یہ سب کچھ کیا مجھے دکھانے اور چڑھانے کے لیے ہے۔''

تب آپ ہنستے ہوئے بولے ''کیا معلوم۔ یہ دیکھنے کے لیے ہی اگر تم بنی ہو تب؟''

اس پر میں اور بھی جھلائی۔ کہاں تو میں نے سوچا تھا کہ شاید میرے ڈانٹنے پر وہ اپنے کو ڈوکٹر کو دکھانے کی حامی بھر لیں گے کہاں وہ اس کا الٹ کر رہے تھے۔

پھر وہ بولے ''سنو مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ ڈوکٹر کے پاس جاؤں گا ایک نہ ایک بیماری ضرور بتادے گا۔''

میں بولی ''کیا ڈوکٹر سے آپ کی دشمنی ہے؟ کیسے بیماری نہ ہونے پر بھی بیماری بتادے گا۔''

بولے ''تم جانتی نہیں ہو ان کا یہی پیشہ ہے۔ جو کہتا ہوں اسے مان لو۔''

''دکھلانے میں تو شاید حرج نہیں ہے۔ آگا پیچھا سوچنے کی ایسی کوئی ضرورت نہیں۔''

''دکھاؤں گا۔ کل اور دیکھ لوں تب جاؤں گا ڈوکٹر کے پاس۔ اب تو خوش ہونا؟ لاؤ پان دو۔ اب تک تو کافی کام ہو گیا ہوتا۔ فضول کی بک جھک ہوئی۔

[illegible]ے دن میں نے پوچھا ''گئے تھے؟'' (تیسرے دن)

آپ بولے ''کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ اسی طرح کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات کے لیے آدمی ڈوکٹروں کے پیچھے دوڑتا رہے۔ تو دنیا کا کام تو بس ہو چکا۔ رات دن ڈوکٹر ہی کے پھیر میں پڑا رہے۔''

اب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ روگ انھیں بمبئی سے ہی لگا تھا۔ وہ اپنے کام کی دھن میں اسے بھلائے بیٹھے تھے۔ میں بھی اندھی بنی بیٹھی تھی۔ اب جب سب کھو گیا تو اپنی نادانی پر ہاتھ مل مل کر پچھتا رہی ہوں۔ جو مورکھوں کا کام ہے حالانکہ میں جانتی ہوں کہ بے مقصد سوچنے سے کیا فائدہ ہوگا پھر بھی جی نہیں مانتا۔ اصل میں یہ بات ٹھیک ہی ہے۔ اسے چھوڑ کر میرے ہاتھ میں ہے ہی کیا؟ دل اور دماغ تو سدا ساتھ رہتے ہیں اور رہیں گے۔''

۱۶؍جون ۱۹۳۶ء

آپ کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ شام کو پانچ چھ بجے کے لگ بھگ جب لوٹے تو اس وقت

میں کمرے میں لیٹی تھی۔ گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ دونوں لڑکے 'لڑکی کو بلانے گئے ہوئے تھے۔ آپ گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھے میرے پاس آئے۔ بولے'' تھوڑا پانی پینے کو لادو' بڑی زور کی پیاس لگی ہے۔''

میں نے اندر سے تھوڑی سی مٹھائی لاکر ان کے سامنے رکھ دی۔''

اس کو کھانے کے بعد بولے'' تھوڑا گڑ دو اور تھوڑا پانی۔''

میں نے پوچھا'' آپ گئے کہاں تھے؟ اتنی پیاس کیسے لگ گئی؟''

آپ بولے'' شہر چلا گیا تھا۔ کل چھپنے کے لیے کاغذ نہیں تھا۔''

میں نے کہا'' مجھ سے تو کہہ کر جاتے بھلے آدمی۔ اس لُو اور دھوپ میں بنا کہے چل دیے۔''

'' میں آیا تھا' تم سو رہی تھیں۔ جگانا مناسب نہ سمجھا۔ سوچا تمھارے سوتے تک میں کام کر کے چلا آؤں گا مگر ایسا الجھا کہ تین بجے کا گیا چھ بجے لوٹا۔''

میں بولی'' اس وقت جاتے۔''

آپ بولے'' شام کو کیسے جاتا۔ رات کو لوٹتا تو اور دیر ہو جاتی۔ تم تب تک اکیلی رہتیں۔ کئی دنوں سے جانے کا سوچ رہا تھا۔ پر وقت نہیں ملتا تھا۔ صبح گھومنے جاتا ہوں پھر کام کا سے آجاتا ہے۔ شام کو جاؤں تو تم اکیلی پڑ جاؤ۔ اکیلی گھبراتیں نہیں تم؟''

میں نے کہا'' گرمی اور لو کو دیکھا جائے تو شام ہی اچھی تھی۔''

اس پر آپ بولے'' یہ سب امیروں کے نخرے ہیں۔ کیا گرمی کی وجہ سے کوئی کام بند رہتا ہے؟ آخر وہ بھی تو آدمی ہی ہیں'' میں بولی'' آپ کیسی باتیں کرنے لگتے ہیں؟ جیسے دنیا بھر کے ٹھیکے دار آپ ہی ہیں۔''

کچھ دیر تک اسی طرح باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ان کے گاؤں سے ایک نائن آگئی۔ اس سے وہ گاؤں کا حال احوال پوچھنے لگے۔ چراغ جلنے کا سے ہو گیا تھا۔ میرے پاندان سے پان نکال کر اسے کھاتے ہوئے وہ اپنی بیٹھک میں چلے گئے۔ نو بجے رات تک کام کرتے رہے۔

میں نے جا کر کہا'' چل کر کھانا تو کھا لیجیے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔''

آپ گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے'' ابھی نو ہی تو بجے ہیں۔''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا'' آپ کے یہاں نو سے زیادہ بجتے ہی نہیں ہیں۔''

آپ بولے" گھڑی کو میں رشوت تھوڑی دیتا ہوں۔ گھڑی تو تمھارے سامنے رکھی ہے دیکھ لو۔"

کھانا کھانے بیٹھے تو ایک روٹی مشکل سے کھائی ہوگی کہ بولے" مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

میں نے کہا" آم کا پنا ہے۔ اسے کھا لیجے (پی لیجیے)

اس پر آپ بولے" نہیں جی اب کچھ کھانے کو طبیعت نہیں ہوتی۔"

میں بولی" گرمی بہت پڑ رہی ہے۔ پنا فائدہ کرتا۔ خیر مت کھائیے۔"

جا کر اس نائن کو میں نے کھانا کھلایا۔ جب میں کھانا کھا چکی تو انھیں پانی دینے گئی۔ سوچا یہ تھا کہ پانی دے کر آؤں گی تو نائن سے پاؤں دبواؤں گی۔ میری طبیعت کچھ بھاری تھی۔ جب ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا مسند کے سہارے بیٹھے ڈیسک پر کچھ لکھ رہے ہیں۔

مجھے دیکھ کر بولے" نہ جانے کیوں پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔"

میں نے پوچھا" کب سے۔"

آپ بولے" جب سے کھانا کھا کر آیا ہوں تب سے۔"

میں بولی" کیا بات ہے آپ نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا پھر کیوں درد ہونے لگا؟"

میں اسی جگہ کھڑی تھی کہ آپ کو قے آنے لگی۔ میں دوڑی۔ ان کی پیٹھ اور گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کے بعد انھیں الٹی کروائی۔ پھر ان کو پان اور الا پچئی دی۔ پان منہ میں ڈالنے ہی کو تھے کہ پھر انھیں قے آ گئی۔ پھر ایک قے ہوئی۔ تبارہ جب قے ہونے لگی تو میں گھبرا گئی۔ میں بھی بیت الخلا گئی۔ واپس آئی تو دیکھا آپ کلی کر کے بیٹھے ہیں میں بولی" کیسی طبیعت ہے۔"

آپ بولے" پیٹ میں درد ہے ہاں قے اب نہیں معلوم ہوتی۔"

انھوں نے اپنا پیٹ مجھے دکھایا۔ پیٹ کی نس موٹی پڑ گئی تھی۔ پیٹ کی پھولی ہوئی نس دیکھ کر اور درد کا سن کر میں گھبرا گئی۔" میں کسی ڈاکٹر کو لے آتی ہوں۔" میں نے کہا۔

" گھبراؤ نہیں" آپ بولے اور یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے انھوں نے کرسی پر بٹھایا۔ ان کے پاس بیٹھ کر میرا او چار ہوا کہ انھیں پودینہ وغیرہ پیس کر کیوں نہ دیا جائے۔ میں دوا کو ٹنے پیسنے لگی۔ نائن سے پانی گرم کرنے کو کہا۔ دوا لا کر انھیں پلائی۔ بوتل میں گرم پانی بھر کر ان کے پیٹ کی سنکائی کرنے لگی۔ اس دن تین بجے کے بعد ان کے پیٹ کا درد شانت ہوا۔ پیٹ کا درد کسی قدر مدہم پڑنے پر انھیں تھوڑی نیند آ گئی۔ میں بھی اپنی چارپائی پر سو رہی۔

اسی دن انھیں خون کے دست آنے لگے۔ اس دن سے نہ انھوں نے بھر پیٹ کھانا کھایا نہ نیند بھر

ہوئے۔ تین چار روز تک ہومیو پیتھک دوا کھاتے رہے۔ ۲۲ تاریخ کو ایلو پیتھ ڈوکٹر کے پاس گئے۔ اسی دن رات کو بچے آئے۔ رات کو میں نے کھانے کے لیے کہا تو آپ بولے ''میری کھانے کی اچھا بالکل نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''تھوڑا دودھ ہی لے لیجئے۔''

آپ بولے ''بھائی اچھا نہیں ہے تو کیسے لوں۔''

بچوں نے کہا ''ہم لوگ مغل سرائے میں کھا چکے ہیں۔''

دونوں لڑکے بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔''

جو آدمی رات کو دو چار گھنٹے میرے اکیلے رہنے پر تکلیف محسوس کرتا تھا اور اپنے کو لو اور گھام (گرمی) میں بغیر روک ٹوک کے چلنے کو اس خیال سے تیار رکھتا تھا کہ شام سے پہلے گھر لوٹوں کیا اس آدمی کو میں اپنی زندگی میں بھول سکتی ہوں؟ میں چاہے جہاں جاؤں اور بڑی رہوں میں وہی ہوں۔ ان کی دید تو اب دشوار ہوگئی ہے ان سے کسی طرح کی تعاون کی مجھے امید نہیں۔ واہ ری قسمت! کہاں سے کہاں لا پٹخ دیا۔ مجھ ایسی بے روح کو خدا ابھی زندہ رکھے ہے' کیوں؟ ہاں آشا تو خوب چیز ہے۔ جس کو زندہ میں نہیں پا سکتی اس کو پانے کی آشا مرنے کے بعد ہے۔ ایک آشا ہی ہاتھ میں ہے آشا میں بڑا بل ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے

اپنے پہرے دیکھئے جاگ دوسرے کے پہرے لگ جائے آگ

اس کو میرے پتی دیو نے خوب خوب سمجھا اور خوب نبھایا۔ مگر میں؟ جیسے جواری سب کچھ ہار کر تنہائی میں بیٹھ کر چپکے چپکے آہیں بھرتا ہے اسی کی طرح کی ایک میں بھی ہوں۔

اگست ۱۹۳۶ء

گورکی کی موت پر' آج' آفس میں میٹنگ ہونے والی تھی۔

رات کو جب آپ کو نیند نہیں آئی تو آپ اٹھ کر اپنی تقریر لکھنے لگے۔ ان دونوں مجھے بھی رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ آپ زمین پر بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔

میں بولی'' آپ یہ کیا کر رہے ہیں''؟

بولے'' کچھ نہیں''

میں بولی'' نہیں کچھ نہ کچھ تو ضرور لکھ رہے ہیں۔''

تب بولے'' پرسوں 'آج' کے دفتر میں گورکی کی موت پر میٹنگ ہونے والی ہے۔''

میں بولی'' کیسی میٹنگ؟ طبیعت اچھی نہیں' تقریر لکھنے بیٹھ گئے۔ پتہ ہے دو بجے ہیں؟''

آپ بولے'' نیند نہیں آتی تو کیا کروں۔ تقریر تو لکھنی ہی پڑتی۔''

میں بولی'' جب طبیعت ٹھیک نہیں تو تقریر کیسے لکھی جائے گی۔''

آپ بولے'' ضروری تو ہے۔ بنا لکھے کام نہیں چلے گا۔ اپنی خوشی سے کام کرنے میں آرام یا تکلیف کا پتہ نہیں چلتا۔ جس کو آدمی فرض سمجھ لیتا ہے اس کے کرنے میں اسے کچھ بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ ان کاموں کو آدمی سب سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔''

میں نے پوچھا'' یہ میٹنگ ہے کیسی؟''

آپ نے کہا'' شوک سبھا ہے'' (دکھ کی محفل)

میں نے کہا گورکی کون سے ہندوستانی تھے۔''

آپ بولے'' یہی تو ہم لوگوں کی تنگ دلی ہے۔ گورکی اتنا بڑا ادیب تھا کہ اس کے بارے میں یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ کس قوم کا تھا۔ ادیب ہندوستانی یا یورپین نہیں دیکھا جاتا۔ وہ جو لکھے گا اس سے سبھی کو فائدہ ہوگا۔''

میں نے کہا'' ٹھیک ہے۔ اس نے ہندوستان کے لیے بھی کچھ لکھا''؟

آپ بولے'' تم غلطی کرتی ہو رانی! ادیب کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جسے وہ الگ الگ بانٹ دے۔ ادیب کے پاس تو بس اس کی ریاضت ہی ہوتی ہے وہی سب کو دے سکتا ہے۔ اور اس سے سب لوگ فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ ادیب تو اپنی ریاضت کا شمہ بھر بھی اپنے لیے نہیں رکھ چھوڑتا۔ اور لوگ جو ریاضت کرتے ہیں وہ تو اپنے لیے ہوتی ہے' ادیب جو ریاضت کرتا ہے اس سے عوام کا بھلا ہوتا ہے۔ وہ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کرتا۔''

میں بولی'' گاؤں والوں میں تو شاید ہی کوئی گورکی کا نام جانتا ہو۔

آپ بولے'' یہاں کے گاؤوں کی کیا ہے یہاں کے آدمی تو اپنے کو نہیں جانتے۔ پھر اس کے معنی یہ نہیں کہ لوگوں کے لیے کچھ کام ہی نہیں کیا جائے۔''

میں بولی'' جانتے کیوں نہیں۔ تلسی' سور' کبیر وہ کس کو نہیں جانتے۔''

آپ بولے" ان کے جاننے والے بھی گاؤں میں تھوڑے ہی ہیں۔ اس کی وجہ ہے تعلیم کا نہ ہونا۔ ابھی تعلیم یہاں بہت کم ہے۔ اسی وجہ سے یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ تھوڑے لوگوں کے لیے ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب گھر گھر تعلیم پھیل جائے گی تو کیا گوری کا اثر گھر گھر نہ ہو جائے گا؟ وہ بھی تلسی اور سور کی طرح گھر گھر پوجے جائیں گے۔"

" یہاں والوں کو تو پہلے اپنوں کی پوجا کرنی چاہیے۔ آگرے کا کوی سمیلن (مشاعرہ) آپ کو یاد نہیں رہا کیا؟

" جب ہری* اودھ جی کو بھری سبھا میں برے الفاظ کہے گئے تھے۔ آپ ہی اس پر بگڑے بھی تھے۔ اور لوگ تو چپ رہ گئے تھے۔" اس پر آپ اور گہرائی میں ڈوب کر بولے" اس میں لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کی بدقسمتی ہے۔ کیونکہ جب تک ان کے دلوں میں ان کے لیے عزت اور محبت نہ ہو تب تک ان کی نصیحت کو کیسے قبول کر سکتے ہیں۔"

میں بولی" وہ لوگ سب سے زیادہ عقل مند خود ہی کو سمجھتے ہیں۔ پہلے کے لوگ ایم۔ اے بی۔ اے کی ڈگریاں نہیں ہتھیائے رہتے تھے کہ اس سے اپنی لیاقت ناپ سکیں۔ ان کی عقیدت کی شاید یہی وجہ تھی۔"

آپ بولے" ڈگریوں سے یہ سب نہیں ہوتا بلکہ ایشور کی دی ہوئی ایک خاص طاقت ہوتی ہے۔ کبیر یا تلسی کو کوئی ڈگری ملی تھی؟ مگر ان لوگوں نے جیسی چیزیں دیں ویسی کیا اب لوگ دے پا رہے ہیں؟ پھر اور سب تو جانے دو آج بھی گاؤں میں جو گیت عورتیں گاتی ہیں وہ کیا کسی شاعری سے کم ہیں۔ وہ عورتیں تو اپنا نام تک نہیں لیتیں۔"

اسی طرح باتیں کرتے کرتے چار بج گئے۔ سامنے ڈیسک پر گھڑی رکھی تھی' دیکھ کر بولے" مجھے تو نیند نہیں آ رہی تم بے کار میں کیوں جاگتی رہیں۔ کہیں تمھاری بھی طبیعت خراب ہو جائے تو اور بھی مصیبت ہو۔ جاؤ سو رہو۔"

میں بولی' مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔"

آپ بولے" لیٹ تو جاؤ میں بھی لیٹتا ہوں۔"

میں اسی جگہ چارپائی پر لیٹ رہی۔ میں ڈر رہی تھی کہ میرے وہاں سے چلے آنے پر وہ پھر کام کرنے لگیں گے۔ اور کوئی خوشی کی بات بھی نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ لکھتے وقت ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

صبح ہوئی دوسرے دن میٹنگ میں جانے کو تیار ہوئے تو میں بولی'' آپ چل تو سکتے نہیں بے وجہ جارہے ہیں۔''

آپ بولے'' تانگے پر جانا ہے۔ پیدل تو جا نہیں رہا ہوں۔''

میں بولی'' زینے پر چڑھنا اترنا تو ہوگا نا۔''

آپ بولے'' یہ تو لگا ہی رہتا ہے۔ میری طبیعت نہیں مانتی۔''

میں نے ان کے ساتھ بڑے لڑکے کو کردیا۔ گھر میں نیچے تک پہنچانے خود آئی۔ میں یہ ڈر رہی تھی۔ کہ کہیں یہ سیڑھیوں پر اترتے ہوئے گر نہ جائیں۔

جب وہ وہاں سے لوٹے تو میں پھر دروازے پر ملی۔ جب وہ اوپر چڑھنے لگے تو بہت روکنے پر بھی ان کے پیر لڑکھڑا گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے آرہی تھی تاکہ انھیں میرا سنبھالنا معلوم نہ ہو۔ اوپر آنے پر چارپائی پر لیٹ گئے۔ سُست پڑ گئے۔ میں ان کے پاس بیٹھی دھیرے دھیرے ان کے پیر دبا رہی تھی۔ جب وہ کچھ ستا لیے تو بولے۔

''میں وہاں کھڑا نہ ہو سکا۔ تقریر کو پڑھنا تو دور رہا۔ ایک اور صاحب سے تقریر پڑھوائی۔''

میں بولی'' میرا کہا آپ مانیں تب نا۔ مفت میں پریشانی اٹھانی پڑی۔''

آپ بولے'' کمزوری آئے یا کچھ اور کہیں اس طرح بیٹھا جاتا ہے۔''

میں نے کہا'' جب اس طرح کرنے سے نقصان ہوتا ہے تو تقریر کسی اور سے بھجوا دی ہوتی۔''

آپ بولے'' ایسا خیال نہیں تھا۔ ہاں کمزوری بہت ہوگئی ہے۔''

میں بولی'' تھوڑا دودھ پی لیجیے۔''

اس پر آپ بولے'' کھاتا پیتا تو سب ہوں۔''

میں نے کہا'' کیا کھاتے پیتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔''

آپ بولے'' گورکی کے مرنے سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ میرے دل میں یہی آرہا ہے کہ گورکی کی جگہ لینے والا کوئی نہیں رہا۔''

گورکی کی موت کا ذکر وہ کئی دن تک کرتے رہے۔ جب جب گورکی کے بارے میں باتیں کرتے

تب تب ان کے دل میں ایک طرح کا درد سا اٹھتا دکھائی پڑتا۔ گورکی کے لیے ان کے دل میں بے انتہا عقیدت تھی۔ وہی ان کا آخری خطبہ تھا۔ گورکی کا کوئی ہم پلہ ادیب ان کی نگاہ میں نہیں آتا تھا۔ اکثر ان دنوں گورکی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ کون جانتا تھا کہ دو مہینے بھی نہیں بیتنے پائیں گے کہ وہ خود چلے جائیں گے' جس کے چلے جانے سے ہندی ادب کا اور خاص طور سے میرا تو ستارہ ہی ٹوٹ گیا۔ گورکی کے لیے وہ اتنے دکھی تھے۔ اب وہ ہم لوگوں کے لیے کیوں دکھی نہیں ہوتے۔ پر اس پر میرا گلہ کرنا عبث ہے۔

۲۵ رجولائی ۱۹۳۶ء

ان کو پہلے ۲۵ جون کو خون کی قے ہوئی تھی۔ اسی دن سے ان کو نیند نہیں آتی تھی۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ پت کی خرابی سے ہوا ہے۔ ساتھ ہی میں ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا میں نے ایسے کتنے ہی مریض اچھے کر دیے ہیں۔ اس کی باتوں سے ہم دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔

ایک روز گھوم کر آپ لوٹے تو مجھ سے بولے۔

''میں راستے میں چلتا ہوں تو پیر تھرتھرانے لگتے ہیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے خون بھی تو ڈھائی تین سیر کے قریب نکل چکا ہے۔''

وہ کھانے میں احتیاط برتتے تھے۔ ان کا یہ طریقہ ایک مہینے تک چلتا رہا' پر ایک دن بھی وہ بیٹھے نہیں۔

اسی میں انھوں نے منگل سوتر کے کتنے ہی صفحے لکھ ڈالے۔ اور دوسرے کام بھی بیچ بیچ میں کرتے رہے۔ کبھی دن میں گھومنے گئے تو مکھن اور ہری ترکاریاں اپنے ساتھ لیتے آئے۔ جیسی کہ ان کی پہلے سے عادت تھی۔ طاقت نہ ہونے پر بھی وہ اپنے کو کمزور نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مہینے تک ان کا یہی معمول رہا۔ حالانکہ اسی دن سے ان سے پورا کھانا نہیں کھایا جاتا تھا۔ دوسری قے انھیں ۲۵ جولائی کو ڈھائی بجے رات کو ہوئی۔

انھیں نیند نہیں آتی تھی اس لیے ان کے پیروں تلوؤں اور سر کی میں مالش کرتی تھی۔ رات کو ایک بجے ان کا سر سہلا رہی تھی کہ کسی طرح انھیں نیند آ جائے۔ کہ آپ مجھ سے بولے ''اب تم سو رہو۔ کب تک بیٹھی رہو گی۔''

میں نے کہا ''میں آپ کی فکر میں ہوں اور آپ میری۔''

آپ بولے ''تم سو جاؤ گی تو میں بھی سو جاؤں گا۔''

میں اسی کمرے میں تخت پر لیٹ گئی۔ آپ دھیرے سے اٹھے۔ بیت الخلا جانے لگے۔ وہاں پہنچ کر بیٹھتے ہی آپ کو پھر قے آ گئی۔ آواز سن کر دوڑی گئی۔ اس وقت وہ اتنے ڈھیلے پڑ گئے تھے کہ اٹھ بیٹھ بھی نہیں پا رہے تھے۔ ایک بار پھر قے کا خون ہم دونوں کو تر کر گیا۔ اس کے بعد پانی مانگ کر میں نے ان کا منہ دھویا۔ کلی کرا کر انھیں چارپائی پر لے آئی۔ تھوڑی دیر بعد طبیعت کچھ سنبھلی۔

اس وقت تک تینوں بچے بھی جاگ چکے تھے۔

میں دھنو سے بولی ''جا کر ڈوکٹر کو بلا لاؤ۔''

آپ بولے ''لڑکے کو اس وقت مت پریشان کرو۔ ڈوکٹر ایشور نہیں ہے' صبح چلا جائے گا۔ جا کر قلم دوات اور کاغذ لاؤ' یہ باتیں انھوں نے جلدی جلدی کہیں۔ پھر بولے ''اب میں نہیں بچنے کا۔ کم سے کم کاغذ تو دو۔''

میں بولی ''اس کا ہوگا کیا؟''

''تمھارے بیٹھنے کا ٹھکانا تو کرتا جاؤں۔''

میں نے کہا ''گھبرائیے نہیں۔ آپ اچھے ہو جائیں گے۔''

بولے ''اٹھو' لاؤ۔''

میں بولی ''اندر چلیے۔''

وہ میرے منہ کی طرف دیکھ کر رو پڑے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ میں آنسوؤں کو چھپانا چاہتی تو ضرور تھی پر مجبوری بھی کوئی چیز ہے۔ پھر بھی میں اپنی ہمت پیدا کر کے اپنے سہارے انھیں اندر لے آئی۔ چارپائی پر جب انھیں لٹا دیا تو وہ پھر بے ہوش سے ہو گئے۔ پہلی بار بھی وہ اسی طرح سست پڑ گئے تھے۔ میں خاموش بیٹھی تھی۔ بیٹھی کیا تھی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔

جب صبح ہوئی تو وہ اٹھے بیت الخلا گئے۔ اس دن وہ سارے دن غفلت میں رہے۔ اس دن تین بجے کے قریب انھیں تھوڑا سا دودھ دیا۔ اب اس ڈوکٹر پر سے میرا اوشواس اٹھ گیا۔

ڈوکٹر گپتا کو بلوایا'' تین چار روز تک اس کی دوا ہوئی' مگر اس کی دوا سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب انھیں روزانہ قے ہونے کے وقت کی سی گرمی رہنے لگی۔ جب اس کی دوا سے بھی کوئی نفع نہیں ہوا تو میں لکھنؤ چلنے پر اصرار کرنے لگی۔ ان دنوں بنارس کی ایکسرے کی مشین خراب پڑی تھی۔

بولے ''ٹھیک کہتی ہو۔ لکھنؤ چلو۔''

لکھنؤ کو روانگی کے دن ساتھ چلنے کو میں مصر ہوئی۔

آپ بولے ''تمھارے ساتھ چلنے سے کیا ہوگا؟''

میں بولی ''کیوں؟''

بولے ''کوئی ضرورت تمھارے وہاں جانے کی نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا ''دھنو جائے گا؟''

بولے ''دھنو کے ساتھ جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے کہو تو تمھارے اطمینان کے لیے لیتا جاؤں۔''

لکھنؤ وہ دس گیارہ روز رہے۔ وہ گیارہ دن کیسے کٹے کیسے بتاؤں۔ وہاں سے جو چٹھیاں آتی تھیں ان کی عبارت بھی گول مول ہوتی تھی۔ میں لکھنؤ جانے کو تیار ہی تھی کہ وہ آ گئے۔ دروازے پر جب ان کا تانگا آیا تو میں سن رہ گئی۔ اس سے اچھے تو وہ لکھنؤ جانے سے پہلے تھے!

کسی طرح انھیں اوپر لے گئی۔ جب اوپر لانے لگی تو دروازے پر پوچھا ''کیسی طبیعت ہے؟''

بولے ''ٹھیک ہے۔''

اوپر پہنچتے پہنچتے انھیں گری ہوگئی۔

میں نے جلدی سے ان کو ایک بغل کی چارپائی پر لٹا دیا۔

کچھ دیر میں بولے ''میں اب نہیں بچنے کا۔''

میں ان کی یہ بات سن کر کیا کہتی۔ آنسو کی دھارا بہہ چلی۔ اس وقت مجھے دونی طاقت چاہیے تھی۔

وہ روتے ہوئے بولے ''جلودر ہے۔ میں نے دو چار کڑے شبد ڈاکٹر کے لیے کہے۔''

ماں کی طرح انھیں سنبھالتی ہوئی بولی ''ڈاکٹر ایسے ہی بے ہودے ہوتے ہیں پیسے اینٹھنے کے لیے کہہ دیا ہوگا۔ آپ اچھے ہو جائیں گے۔ بولیے کھاتے کیا ہیں؟''

انھیں جیسے میری باتوں کا دشواس ہوگیا۔ بولے کھانا بھی چھڑا دیا۔ تین روز سے تو کچھ نہیں کھایا۔''

میرے منہ سے نکلا ''کچھ بھی نہیں کھایا تین روز سے!''

آپ نے کہا ''نہیں۔''

میں نے کہا ''تبھی آپ کمزور پڑ گئے ہیں۔ آخر اس نے کھانے کے لیے کچھ بتایا کہ نہیں؟''

آپ بولے ''بارلی اور بوتل کا دودھ کھانے کو بتلایا ہے۔''

میں نے پانی گرم کروا کر بارلی چڑھوادی۔ پہلے دودھ پینے کو دیا۔ میرا خیال تھا کہ خود دودھ پلاؤں۔ آپ بولے ''ابھی میں اتنا کمزور نہیں ہوا ہوں۔''

دودھ پی چکے تو میں بولی ''میں خود کل لکھنؤ جانے والی تھی۔''

آپ بولے ''کئی دن رات بھر دست آتے رہے۔ شاید اس نے جلاب دے دیا تھا'' پھر بولے ''میں نے ہی دھنو سے لکھوایا تھا کہ چلی آؤ۔ کیونکہ دست مجھے آتے تھے تو رات کا کموڈ حکیم جی کو خود صاف کرنا پڑتا تھا۔ حکیم دیوتا ہے۔ اس کی شرافت کیا بتاؤں۔ انھوں نے میری سیوا جی جان سے کی۔ جو دس دن وہاں رہا حکیم جی سوئے نہیں۔ دھنو کو سلا کر وہ رات بھر میرے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ ایسا شریف آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ ایسے مسلمان پر ہزاروں ہندو قربان ہو سکتے ہیں۔ اس نے جیسی میرا سیوا کی اس کی تعریف میں نہیں کر سکتا۔ میں اچھا ہو گیا تو ان کی سیوا میں کروں گا۔''

اس دن کی ان باتوں سے میرے دل کے گھاؤ ایسے ہوئے ہیں کہ اگر حکیم جی کی سیوا میں کچھ بھی کر پاتی تو اپنی خوش نصیبی سمجھتی۔ یقیناً میں انھیں اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔

اپنی ایک ایک تکلیف کا بیان انھوں نے اس دن مجھ سے کیا۔ میں بولی ''آپ وہیں رہتے۔ میں تو کل آ ہی جاتی۔''

آپ بولے ''میں نے سوچا اگر چل بسا تو دیکھنے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔''

ان باتوں میں سوچیے کتنا درد بھرا ہے۔ اور ان میں کتنا اپنا پن ہے۔ انداز لگایئے ان باتوں کو سنتے ہوئے محض اس ڈر سے کہ کہیں اس کا اثر ان پر برا نہ پڑے مجھے کتنا خون پینا پڑا ہوگا۔ آشا بس یہی تھی کہ وہ اچھے ہو جائیں گے۔ مگر وہ آشا اور وہ بھگوان ان دونوں سے اگر مجھے بیزاری ہو جائے۔ ان پر وشواس جاتا رہے تو شاید میری غلطی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ جس چیز کو آدمی اپناتا ہے اس پر وشواس کرتا ہے اگر اس پر سے اعتماد جاتا رہے تو دل میں ایک بغاوت سی پیدا ہوتی ہے۔ وہ بغاوت ہم لوگوں کو جلا کر راکھ نہیں کر سکتی خود راکھ بن جاتی ہے۔ دوبارہ ان دونوں پر وشواس لانا میرے قابو کی بات نہیں ہے'' اس میں بھی میرے پھوٹے نصیب کو دخل ہے۔ جو ان پر وشواس کرتے ہیں، انھیں تھوڑی سی شانتی ملتی ہے مگر میں ان میں بھی جلن ہی محسوس کرتی ہوں۔

دھنو ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ یہ دوسرا ہومیو پیتھ ڈاکٹر تھا میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا بیماری ہے''؟

ڈوکٹر نے کہا ابھی بتاتا ہوں۔"

آپ بولے "میں تو جانتا ہوں۔ آپ کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ڈوکٹر نے یقین دلایا "آپ اچھے ہو جائیں گے۔"

آپ بولے "یہ سب باتیں ہیں۔"

لکھنؤ سے آتے ہی مجھ سے کہا تھا "مجھے دیہات لے چلو" ایک بار نہیں کتنی ہی بار کہا۔ بلکہ یہ بھی کہا "دیکھا دیہات جانے سے اس بار اچھا ہو گیا تھا۔"

میں بھی چلنے کو تیار ہو گئی۔ مگر بیماری کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا، جاتے نہیں بنتا تھا۔ مگر ان کی یہی ضد تھی کہ گھر چلو۔

میں نے دھنو سے کہا "میں دیہات لے جانا چاہتی ہوں۔"

دھنو بولا "ایک تو شہر سے دور، دوسرے مینھ اتنی زور سے پڑ رہا ہے کہ ایک پل کے لیے بھی نہیں رکتا۔ بابو جی کی جانے وہاں کیسی حالت ہو جائے۔ یہاں وقت پر ڈاکٹر وغیرہ تو مل جائے گا۔"

میں نے بھی کہا "تمھارا کہنا ٹھیک ہے۔"

مجھ سے دوبارہ بولے "رانی تم گھر نہیں چل رہی ہو؟"

میں نے کہا "ہمت نہیں ہوتی، کیسے لے چلوں۔ ذرا آپ طبیعت سنبھل جائے تو کچھ ہمت پڑے۔"

گاؤں جانے کی چاہ انھیں آخر تک رہی۔

رام کٹورے والے میرے موجودہ مکان کو وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ مجھے بھی وہ مکان پسند آیا تھا۔

میں نے پنڈت سے پچھوایا۔ پنڈت نے دس اگست کو نئے مکان میں جانے کا مشورہ دیا۔ ان کی بیماری کا حال سن کر میرے بھائی بھی دیکھنے آئے تھے۔ بھائی نے میری پریشانی کو دیکھ کر اپنی بیوی کو میرے پاس بھجوا دیا۔

پانی زوروں سے پڑ رہا تھا، پھر بھی میرے گھر کا سامان ڈھویا جا رہا تھا۔ ان کے کمرے میں کچھ کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ سب سامان اتھل پتھل تھا۔ آپ نے ایک بار اٹھنے کی کوشش کی مگر اپنی صحت سے لاچار تھے۔ مجھے دیکھا تو لیٹ رہے۔

میں بولی'' آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟''

بولے'' کچھ نہیں دونوں لڑکے کہاں گئے''؟

میں بولی'' یہیں کہیں سامان وغیرہ ٹھیک کر رہے ہوں گے۔''

آپ بولے'' کتابوں کا بنڈل کیوں نہیں بندھوا دیتیں؟''

میں دروازے سے آنگن کو لوٹ رہی تھی تو بولے'' کوئی ٹھیک کرے یا نہیں۔ اپنے کو کیا۔'

ان الفاظ میں سوچیے کیسا تمناؤں کا چھوٹا بھرا تھا۔ یہ الفاظ کتنی مایوسی کے تھے۔ جس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک چیز کو جمع کیا ہو، جن چیزوں کے لیے پسینے کی جگہ خون بہایا ہو، جن چیزوں کو سمیٹنے کے لیے، وہ ابھی ایک منٹ پہلے ہی اٹھے تھے انھی کے لیے ایسی مایوسی!

تھوڑی دیر بعد میں پھر اسی کمرے میں گئی۔ اس سے تھوڑی ہی دیر پہلے پانی کی بوندیں تھمی تھیں۔

مجھ سے بولے'' چاٹتیں کیوں نہیں تم؟ پانی میں بھیگ جاؤں گا نہیں تو۔''

میں تھوڑا اسا دہی اور شکر لا کر ان کے سامنے رکھ کر بولی'' ذرا اسے زبان پر لگا لیجیے۔''

میرے کہنے پر انھوں نے اسے زبان پر تو ضرور لگایا لیکن کلی کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

وہ خوشی کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ سوچیے اس میں کتنا طنز بھرا تھا! وہ طنز یہی تھا کہ کہیں مرتا ہوا آدمی دہی چاٹ کر صحت یاب ہوا ہے۔ میرا خیال ہے مسکرانے کی یہی وجہ ہوگی۔

میں اسی طرح تانگے میں بیٹھ کر نئے مکان گئی۔ راستے بھر میں ایک ہاتھوں سے بیٹی کے بچے کو اور دوسرے سے انھیں پکڑے رہی تھی کیونکہ مجھے ان پر بھروسہ نہ تھا۔ وہ اس وقت بچے ہی کی طرح ہو گئے تھے۔

جب میں نئے گھر میں پہنچی تو لڑکا تو خود اتر کر چلا آیا انھیں میں اپنے سہارے لائی۔ وہ میرا سہارا کیا تھا بس خود اعتمادی' کیونکہ اگر وہ گرتے ہی تو میں کب انھیں روک پاتی۔

انھوں نے شاید میرا سہارا لینا اس لیے منظور کیا تھا کہ میں سمجھوں کہ انھوں نے میری بات مان لی۔

چارپائی پہلے ہی سے بچھی ہوئی تھی پر وہ اتر 'دکھن' بچھی ہوئی تھی۔ جب وہ لیٹ گئے تو مجھے سمت کا خیال آیا۔

میں نے کہا ''ذرا چارپائی کو ٹھیک تو کرنے دیجیے۔''

آپ بولے ''اس سے کیا ہوگا جی۔ جو ہونا ہوتا ہے وہی ہوگا۔''

میں بولی ''ذرا اٹھ جایئے۔''

بولے ''اچھا تھوڑی دیر میں اٹھتا ہوں۔''

جب ستا چکے تو اٹھ کھڑے ہو گئے۔ بیٹی کو بلا کر میں نے ان کی چارپائی یورپ مختم کردی۔

اس دن شام کو کھانا نہیں پکا۔ کھانا پکتا بھی کیسے۔''

آپ بولے ''بازار سے پوری منگوا لو۔ میرے لیے پانی گرم کرکے دودھ بنادو۔''

میں نے پوچھا ''پارلی نہ لیجیے گا؟''

بولے ''پارلی لینے کو میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا ہے۔''

جس روز میں اس گھر میں آئی۔ ٹھیلے پر سامان لاد کر پرانے مکان سے یہاں آرہا تھا۔ ٹھیلے کے ساتھ چھوٹا لڑکا بنو آرہا تھا۔

بارش جاری تھی۔

ٹھیلہ بنو کے پیر پر چڑھ گیا۔

کسی طرح ٹھیلہ بھیتر آیا۔

میں اس کے پیر کو دیکھ کر بولی ''یہ کیا ہوگیا؟''

میں اس کے پیر کو ٹھیک کرنے کے لیے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ چاہتی تھی کسی طرح اس کا پیر ٹھیک ہو جائے۔

آپ کمرے سے بولے۔ ''یہاں آؤ''

میں نے کہا ''ہاں بنو کے پیر میں چوٹ لگ گئی کیا؟''

میں نے کہا ''ہاں بنو کے پیر میں چوٹ لگ گئی۔''

آپ بولے ''سب آفت ایک ہی دن آتی ہے۔ کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟''

میں نے کہا ''نہیں تو''

بولے ''تم یہیں بیٹھو۔ اور لوگ ہیں اس کے دوا لگا دیں گے۔''

دوسرے دن بیٹی کے دونوں بچے شور مچا رہے تھے۔ بیٹی بھی دکھی تھی۔ اس نے بچوں کے دو دو طمانچے لگائے۔ میں بھی ڈانٹ بیٹھی۔

بیٹی دوسرے روز ان کے پاس بیٹھتی تھی۔ یہ دونوں لڑکے بھی وہیں پہنچ گئے۔ پہلے بڑا جا کر پوچھنے لگا ''بابو جی کیسی طبیعت ہے؟'' اس کو دیکھ کر چھوٹا بھی پوچھنے لگا۔ ان دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے اچھی ہے۔''

بڑا ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ چھوٹا بیٹی کی طرف بڑھا۔ بیٹی کمرے سے باہر نکل آئی۔ ساتھ ہی دونوں لڑکے بھی باہر آ گئے۔ جب وہ باہر چلے گئے تو آپ مجھ سے بولے ''ان بے چاروں کو تو کوئی پیار نہیں کرتا۔''

میں بولی ''میں آپ کی سیوا میں لگی ہوں۔ پیار کرنے والا یہاں اور کون ہے؟ سب ہی پریشان ہیں۔ کون کس کی خبر لے۔''

آپ بولے ''بیٹی تو بیماری ہی سے اٹھی ہے۔ جس دن یہ سب یہاں آئے میں اسی دن سے بیمار پڑا ہوں۔ ان بے چاروں کو پوچھے تو کون پوچھے۔ میں اچھا ہوتا تو ان بے چاروں کو کھلاتا۔ بے چارے لاوارثوں کی طرح ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ ان بچوں کے لیے ایک نوکر رکھ لو۔ بیٹی کو بھی آرام ملے گا۔ میں اچھا ہو جاؤں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

۲۵ راگست ۱۹۳۶ء

اگست مہینے کی ۲۵ ویں تاریخ کو رات دس بجے میں جاگ رہی تھی۔ اس دن صبح ہی سے میں فکر مند تھی۔ رات کو آپ سوئے ہوئے تھے۔ میں خاموشی سے سر دبا رہی تھی۔ سامنے گھڑی تھی۔ بار بار اس پر نگاہ جاتی تھی۔ بار بار ایشور سے پراتھنا کرتی تھی کہ ایشور دیا کر۔

دو یا سوا دو کا سمے تھا۔ مجھ سے بولے۔

''رانی مجھے گرمی ہو رہی ہے۔'' شاید مجھے پھر خون کی قے ہو گی۔ آج ۲۵ ویں تاریخ ہے نا؟''

میں نے کہا ''نہیں تو آج ۲۴ ہے۔''

آپ بولے ''مجھے بڑی گرمی لگی ہے۔ دیکھو گھڑی میں ڈھائی تو نہیں بجے ہیں۔''

میں بولی ''آپ کو بے وجہ فکر ہو رہی ہے۔''

میرے زور دینے پر انھوں نے مان لیا۔ گھڑی میں نے آدھ گھنٹہ لیٹ کردی' بولی "ابھی تو دو بجے ہیں"۔ "ان باتوں کی طرف دھیان مت دیجیے' سوچنے سے فکر اور بڑھ جائے گی۔"

آپ بولے "میں ان باتوں کو سوچنے تھوڑی جاتا ہوں۔ اور ان باتوں کو سوچنے میں مجھے سکون بھی نہیں ملتا۔ مجھے اس ستے میں بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ جان بس نہیں نکلتی اور سب کچھ بھگت لیتا ہوں۔ میں کروں کیا' مجھے خود ہی پریشانی ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "آپ چنتا چھوڑ دیں۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ سو جائیے۔"

انھیں سمجھا تو میں [illegible] تی پر خود بھی ہوئی تھی۔ وہ تو ان باتوں کو سن کر شاید کچھ مطمئن ہو گئے تھے۔

اس دن رات بھر جاگ کر ہی صبح کی۔ ان کی اس چنتا سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کہ کیا انھیں سچ مچ علم ہو گیا ہے کہ آج ۲۴ ہے؟ بیماری ہی میں نہیں وہ میری ہر بات کو ہمیشہ مان لیتے تھے۔ اس لیے وہ میری بات کو مانتے تھے کہ میں ان سے زیادہ سمجھدار تھی بلکہ اس لیے کہ وہ میرا مان رکھنا چاہتے تھے۔ کئی بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میری طرح' مجھے وشواس ہے' تمھارے بچے تمھاری بات نہ مانیں گے۔ اور اسی کا خیال کر کے بچوں کی کوئی شکایت میں نے ان سے نہیں کی۔ ہاں انھیں یہی جواب دیتی تھی کہ لڑکوں کے ساتھ تو بیاہی نہیں گئی ہوں۔

جس نے اپنے لڑکوں پر اپنا سارا جیون ڈال رکھا ہو اور اسے وہی چھوڑ کر چلا جائے تو اس کے جیون میں کیا باقی رہ جاتا ہے؟ بس آخیر میں اس کے ہاتھ لگتی ہے نراشا اور دور بھاگیہ۔ ناامید اور بدنصیبی۔

پہلے جس مکان میں رہتی تھی۔ نیچے اسی میں پریس بھی تھا۔ جب وہاں سے ہٹے تو ساتھ ہی پریس بھی منتقل ہوا۔ آج جس حصہ میں پریس ہے' وہ ان دنوں بن رہا تھا۔ دن بھر ادھر ہی آپ کی آنکھ رہتی۔ نہیں معلوم راجوں کی کاریگری دیکھتے تھے یا قدرت کا کھیل۔ دیکھتے اسی طرف رہتے تھے۔

اصل میں پہلے ہم لوگ یہاں آئے تھے۔ دس پندرہ دن بعد پریس یہاں منتقل ہوا تھا۔ نئے مکان میں آنے کے بعد دو دن تک وہ شام کو لون میں ٹہلتے تھے۔ اور کہتے تھے یہاں میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

میں نے بھی یہی سمجھا کہ شاید اس مکان میں وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔

سچ ہے دھرتی سبھی کو کھا جاتی ہے۔ اور دھرتی کو کوئی نہیں کھا پاتا۔ قسمت اپنی خراب ہوتی ہے جگہ وغیرہ کا تو بہانہ ہوتا ہے۔

اس مکان میں کتابوں کا اشاک لگ رہا تھا دن میں اکثر مجھ سے کہتے' دیکھو ٹھیک سے رکھا جا رہا ہے کہ نہیں۔ نیا بنا ہوا مکان ہے۔ اس میں دیمک لگنے کا زیادہ امکان ہے۔ نہیں معلوم کہ وہ میرے دیکھنے کو اپنے دیکھنے کے برابر سمجھتے تھے۔ جب یہ بات انھوں نے مجھ سے کئی بار کہی کہ دیکھ آؤ تو میں بولی ''بھائی رکھتے رکھاتے ہوں گے' میں کیا دیکھ آؤں۔''

آپ بولے ''اس کی فکر کرنے کی ضرورت تو تمھیں ہے۔ جتنی فکر مجھے اور تمھیں ہے' اس سے زیادہ ہوگی انھیں؟

دیمک لگ جانے سے نقصان ہو جائے گا۔''

میں بولی ''سب حالت دیکھ تو رہی ہوں۔''

جا کر دیکھا تو دیوار سے سٹا کر کتابیں رکھ رہے تھے۔ آدمیوں سے میں بولی ''دیوار سے سٹا کر کیوں کتابیں لگاتے ہو؟''

آپ نے یہ بات سن لی۔ بولے ''میرا کہنا سن لیا نا۔ بے فکر ہو کر کبھی آدمی نہ بیٹھے۔ اپنے کام میں اپنا سر لگا دینا چاہیے۔''

میں بولی ''رکھ دیں گے۔''

آپ نے کہا ''یہی دنیا کا طریقہ ہے۔ ایک تو نقصان پر نقصان ہو۔ دوسرے دنیا بے وقوف بنائے۔''

جس وقت سامان پہلے مکان سے آ رہا تھا اور کچھ آ گیا تھا' کچھ باقی تھا۔ مکان مالک اور دھنو میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ مکان مالک سامان نکالنے ہی نہیں دیتا تھا اور گھر میں تالا ڈال دیا تھا۔ کام کرنے والوں کو لے کر دھنو وہاں پہنچا۔ تالا اپنے آدمی توڑنے لگے تو مار پیٹ ہونے لگی۔ آپ کو پتہ چلا کہ دھنو اور مالک مکان میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ داماد یہیں تھے۔ ان سے کہا' بیٹا جا کر سامان اٹھوا لاؤ'' جب ادھر وہ لڑکا چلا گیا تو مجھ سے بولے ''ادھر میں بیمار پڑا ہوں ادھر یہ فوجداری کرنے پر تلا ہوا ہے۔''

میں نے کہا ''غلطی انھی کی ہے کیوں کہ سامان نہیں دیتا۔ تالے لگا دیے ہیں پھر وہ بھی تو لونڈا ہی ہے۔ آپ کو نہیں معلوم جب ہم لوگ وہاں رہ رہے تھے تو وہ دوسروں کی طرح آپ سے بھی جھگڑا تھا؟ ہم لوگ لڑکا سمجھ کر بولتے نہیں تھے۔ آخر دونوں لونڈے ٹھہرے۔''

آپ بولے ''یہ سے شانتی سے کام چلانے کا ہے۔ آخر جھگڑا ہوا کیوں؟''

میں بولی ''جھگڑا اس بات پر ہوا کہ وہ پانی کا پیسہ مانگ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے مکان کا پانی تم ہی نے خرچ کیا ہے ٹیکس اور کون دے گا؟ دھنو کا کہنا ہے کہ نئے مکان میں پانی تم لے جاتے تھے اس لیے زیادہ پانی لگا۔

آپ بولے ''تم ہی دے دوگی تو کیا ہو جائے گا۔ غنڈوں کے ساتھ غنڈہ گردی کرنے سے کام نہیں چلتا۔ بالا کر روپے دے دو۔''

آپ نے مکان مالک کو بلوایا۔ جب وہ آیا تو اس سے پوچھنے لگے ''کل کیوں جھگڑا کر بیٹھے؟''

وہ بولا ''شری پت نے جھگڑا کیا۔ پانی کا ٹیکس آپ کو دینا چاہیے تھا۔''

میں یہ سن کر بولی ''تم چاروں دھنو سے بڑے ہو کر بھی کتنا جھگڑا ہم سے کرتے تھے۔ مکان جب کرایے پر دے دیا گیا تو اس سے پانی لینے کے مستحق تم نہیں رہے۔''

لڑکا بولا ''آپ کے داماد نہ گئے ہوتے تو وہ جانے کیا کرتے۔ آپ کے داماد بڑے شریف ہیں۔''

میں بولی ''جھگڑا تمھاری ہی طرف سے شروع ہوا۔ تم اپنی پوری طاقت سے وہاں تھے۔ اسی لیے دھنو بھی پوری طاقت سے گیا تھا۔''

آپ بولے ''اب تم جھگڑا کروگی کیا؟ بولو جی کتنے روپے ہوئے؟''

اس نے کہا ''اٹھارہ روپے۔''

مجھ سے بولے ''دے دو جی۔ لو اپنے روپے لے جاؤ۔ سیدھے میرے پاس چلے آئے ہوتے روپے مل جاتے، جھگڑا بھی نہ ہوتا۔ ابھی لڑکے ہو، سنبھل کر چلنے کی عادت ڈالو۔ اور تو کچھ نہیں بقایا ہے کرایہ تو نہیں باقی ہے؟''

ان لوگوں نے کہا نہیں کرایہ پورا مل گیا۔

آپ اسے نصیحت کرنے لگے ''دیکھو تھوڑی تھوڑی بات کے پیچھے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔ ایمان دار بنو۔ برتاؤ میں امن پسند رہو۔ ذرا ذرا سی بات کے پیچھے اپنی عزت نہ گنواؤ۔ تم اپنی بدنامی کراؤگے اور دوسرے کی بھی۔ ان سب باتوں میں عزت نہیں ہے۔ ان روز کی لین دین کی باتوں میں ایماندار اور بیوپار کا سچا ہونے کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔''

ان باتوں میں پیار اور نصیحت دونوں ہیں۔ نصیحت کی پھٹکار بہت ضروری ہوتی ہے۔ یہ پھٹکار اپنے کو پہچاننے کی قوت دیتی ہے۔

بیماری کے دنوں میں انھوں نے مجھے ایک روداد سنائی۔

ایک دن انھیں رات کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ انھیں نیند آ جائے۔ رات کا ایک بجے کا سمے تھا۔ آپ بولے۔

''میں بیمار کیا پڑا تمھارے لیے کھانا پینا سب حرام ہو گیا۔''

پھر اپنے سر سے ہاتھ کھینچتے ہوئے بولے ''ادھر آؤ جب نیند نہیں آ رہی تو کچھ بات ہی کریں۔''

میں بولی ''نہیں' آپ سو جائیے۔ رات زیادہ چلی گئی ہے۔''

تب آپ بولے ''میں گھنٹوں سے سونے اور تمھیں سلانے کی کوشش میں ہوں۔ پر نیند آئے تب نا! دیکھو تم سے اپنی ایک چوری کا قصہ کہوں۔ پر منہ سے نکالتے ہوئے جھجک ہو رہی ہے۔''

میں بولی ''کیسی چوری؟''

آپ بولے ''اس بنگالی جوان کو تمھارے پیچھے جو دیا تھا وہ تو دیا ہی تھا اپنی بی بی کے اور زیور اور کپڑے بھی اس نے میری ہی ضمانت پر لیے تھے۔ ان روپوں کو تمھاری چوری سے میں نے ادا کیا۔''

میں بولی '' آپ نے کیسے دیے۔''

آپ بولے '' تم ہی سوچو کرتا کیا؟ جو تم سے تمھاری چوری سے کہانیاں لکھتا تھا اس کے پیسے انھیں دے آتا تھا۔ تم سے روپوں کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ کیا کرتا' اس کا بھی قرض دار رہا ہوں گا۔ اور میں کیا کہوں؟''

میں بولی ''نہیں صاحب' مجھے سب معلوم ہوتا رہتا تھا۔ میں بھی چپ رہتی تھی۔''

آپ بولے'' سچ؟ بتاؤ کیسے معلوم ہوتا تھا؟''

میں بولی' صراف اور بزاز کو کئی بار آپ کے پاس آتے دیکھا تھا۔ تب ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا''

آپ بولے'' تم نے کبھی مجھ سے پوچھا نہیں؟''

میں بولی میں پوچھتی کیا؟ جب آپ چوری سے دیتے تھے تب پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ جب آپ دھوکا کھا ہی چکے تو دینا تو پڑے گا ہی۔''

آپ بولے'' اچھا ایک چوری اور سنو۔ میں نے اپنی پہلی بیوی کے جیون کال میں ہی ایک عورت رکھ چھوڑی تھی۔ تمھارے آنے پر بھی اس سے میرا تعلق تھا۔''

میں نے کہا'' مجھے معلوم ہے۔''

یہ سن کر وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ اس دیکھنے کے بھاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے چہرے کو پڑھ لینا چاہتے ہوں۔ میں نے انھیں اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر نگاہیں نیچی کرلیں۔ بڑی دیر تک وہ گہرے جذبات میں ڈوبے میرے چہرے کو دیکھتے رہے۔ میں شرم سے سر جھکائے تھی بار بار میرے دل میں خیال آرہا تھا ان بیتی باتوں کو کہنے کا بھید کیا ہے۔

کچھ دیر کے بعد بولے ''تم مجھ سے بڑی ہو۔''

ان کی اس بات کا بھید میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔

میں بولی ''آج آپ کو ہو کیا ہو گیا ہے؟ میں بھلا آپ سے بڑی ہو سکتی ہوں!''

تب آپ ہنستے ہوئے بولے ''تم دل سے مجھ سے سچ مچ بڑی ہو۔ اتنے دن میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی تم نے بھول کر بھی اس بات کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔''

یہ سن کر میں نے ان کا منھ بند کر دیا اور بولی ''میں اسے نہیں سننا چاہتی۔''

اس وقت میرے دل میں یہی خیال آیا کہ بات کیا ہے۔ آج اس بیتی بات کو مجھے سنانے کا مقصد کیا ہے۔ ان سب باتوں کو سوچ کر میں ٹھنڈی پڑ گئی۔

آپ اپنے آپ بڑبڑانے لگے ''ہے بھگوان میں آج تم سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ مجھے کچھ دن کے لیے اچھا کر دو''۔ وہ اسی طرح کی پرارتھنا کر رہے تھے اور میں چارپائی پر پڑی پڑی رو رہی تھی۔

پھر اپنے آپ وہ بولے ''تم سنتے نہیں ہو بھگوان۔ اگر ہو تو تمھیں سننا چاہیے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا بس اس بار اچھا ہونا چاہتا ہوں۔ جو بے کپٹ یہ میری سیوا کر رہی ہے محض اس کے لیے تو مجھے ایک بار زندہ کر دے۔'' شاید وہ رو بھی رہے تھے۔

''بھگوان اگر تو میری اس التجا پر کان نہیں دھرتا تو اگلے جنم میں پھر انھیں مجھ سے ملا دے۔ اگر نہیں ملایا تو میں یہی سمجھوں گا کہ میرا جنم رائگاں ہو گیا۔''

میں اسوقت غیر محترم ہو کر رہ گئی تھی۔ اور میرا گلا بھر آیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ آنسو روکنے کی بہت کوشش کی پر سب بے کار۔ جتنی ہی کوشش میں روکنے کی کرتی آنسو نکلتے آرہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ڈر تھا کہ کہیں انھیں معلوم نہ ہو جائے کہ میں رو رہی ہوں۔ آخر میں کرتی کیا؟ میں بھی تو ایک کمزور عورت ہوں۔ اپنے کو کہاں تک بس میں کر پاتی! جس کا ایسا محبت کرنے والا جدا ہو رہا ہو۔ اسے کیسے چین ملے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر بیت الخلا چلے گئے۔ وہاں سے لوٹ کر دوسری چھت پر ٹہل رہے تھے۔ میں نے چپکے سے اٹھ کر منہ دھویا۔ گلہ صاف کیا۔ جیسے ہی میرا گلہ صاف ہوا وہ بھی آ کر چارپائی پر لیٹ رہے۔ مجھے جاگتی سمجھ کر بولے۔

''میں تم سے کئی دن سے اپنی باتیں بتا دینے کا خواہش مند تھا۔''

میں بولی ''مجھے ان باتوں کو سننے کی خواہش نہیں ہے۔''

آپ بولے ''کوئی دوسرا ہوتا تو شاید میں بھی نہ کہتا۔ مگر اس سے میں تم سے ان باتوں کو کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں جتنا ہی تمھارے بارے میں سوچتا ہوں اتنا ہی مجھے دکھ ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم میرے پاس سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہ ہٹو۔ نہ جانے مجھے ادھر کئی سالوں سے کیا ہو گیا ہے۔ تم کہیں چلی جاتی ہو تو مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔''

میں نے کہا ''تو میں جاتی ہی کہاں ہوں۔''

''پھر آخر میں ایسا کیوں ہوتا جا رہا ہوں؟''

میں بولی ''جب گھر میں دو ہی آدمی ٹھہرے اگر ان میں سے ایک چلا جائے گا تو ضرور سونا لگے گا۔''

بولے۔ ''نہیں جی' کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا جانے سبھی کا حال ایسا ہو جاتا ہے یا ہمارا ہی۔''

یوں پہلے بھی ان کی طبیعت ایسی ہی تھی۔ بیمار ہونے پر وہ پاس سے اٹھنے نہ دیتے تھے۔ شاید میرا ان کے پاس سے دوسری جگہ چلا جانا انھیں اچھا نہ لگتا تھا۔ آدمی اپنے کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھتا ہے اور طاقتور بھی۔ ہوتا اس کے برعکس ہے۔ عقل کی تو یہ حالت ہے کہ جسم کے اندر کا پتہ نہیں پاتے کب کیا ہو جائے گا اس کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ طاقت کی یہ حالت ہے کہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا ہے اور ہم کچھ نہیں کر پاتے۔ خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ جو تھوڑی بہت عقل وقت پر رہتی بھی ہے وہ بھی جواب دے جاتی ہے۔ ناطاقتی کا یہ حال ہے۔ کہ کڑے سے کڑا دکھ سہتے رہتے ہیں اور کچھ کرتے نہیں بنتا۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ حالات سے ہار کر سبھی اپنا سر جھکا دیتے ہیں اور سب کو حالات کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔ آدمی کر ہی کیا سکتا ہے۔ اس میں ایسی شکتی نہیں کہ حالات کا مقابلہ کر سکے مقابلہ تو جب ہی ہو سکتا ہے جب وہ خود مرنے کے لیے تیار ہو جائے' تب ہی کوئی کچھ کر سکتا ہے۔ آج میں ان باتوں کو سوچتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ میں کتنی نیچ اور کتنی بزدل ہوں جو میں کچھ نہیں کر پاتی۔ جو کبھی ایک دن کے لیے بھی الگ نہ ہونا چاہتا تھا اس کے چلے جانے

پر بھی اسی رفتار اور اسی ڈھنگ سے جو اس کی زندگی میں تھا میں آج بھی جیئے جا رہی ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا گراوٹ اور بزدلی ہوگی۔ اگر یہ سب باتیں کسی کو محسوس نہ ہوں تو کوئی بات نہیں مگر سب کچھ محسوس کرتے ہوئے بھی کوئی خاموش بیٹھا رہے تو کیا کچھ پتا نہیں ہے۔ اور ایک دن دو دن کی بات نہیں ہے۔ جس نے اپنے دل کی ساری باتیں کہی ہوں اس کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے؟

میں اس بڑے انسان کو ذرا بھی نہ پہچان سکی۔ بڑے انسانوں کو پہچاننے کے لیے اپنے میں زور چاہیے طاقت چاہیے۔ پھر میں سمجھتی ہوں وہ طاقت آہی کیسے سکتی تھی۔ میں انھیں پہچانتی ہی کیسے؟ میں تو اپنے پاگل پن میں مست تھی۔ میں تو انھیں اپنی چیز سمجھتی تھی۔ وہ اگر میرے اپنے نہیں تھے تو ڈرتے کیوں تھے؟ مجھ سے چھپا کر وہ کوئی کام نہ کرتے۔ میں ان کے مقابل تھی کیا؟ یہ مقابل بھلا ہو سکتی تھی! مگر نہیں میری آنکھوں کو دھوکا تھا۔ آنکھ کھلی بھی تو اس سے جب اس کے کھلنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنے دل کی ساری باتیں ایک ایک کر کے کہہ گئے اور میں اس سے بھی انھیں نہ پہچان پائی۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ اندھیاری رات اور اس رات میں بھٹکنا۔ اور اپنے نصیبے کو کوسنا۔ بار بار یہی منھ سے نکل جاتا ہے کہ میں اس دیوتا کو پہچان نہ سکی۔

اس گھر میں آنے پر آپ کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔

میں بولی ''پانی گرم کر کے سینک دوں؟''

آپ نے کہا' سینک دو' شاید کچھ آرام ہی مل جائے۔''

میں نے پانی گرم کروا کے منگایا۔ چارپائی پر بیٹھ کر ان کے پیٹ کو سینک رہی تھی۔ میری جٹھانی پاس بیٹھی ہوئی میری مدد کر رہی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بولے ''تم ہی سینکو جی۔''

میں بولی ''اور کون ہے؟ میں ہی سینک رہی ہوں۔''

آپ بولے ''بھوجی کو کیوں تکلیف دے رہی ہو۔''

میں نے آپ کی خفگی سے بچنے کے لیے جٹھانی کو اشارے سے وہاں سے اٹھا دیا۔ جب وہ چلی گئیں تو انھوں نے مجھ سے کہا ''دروازہ بند کر دو۔''

میں نے دوروازہ بند کر دیا۔

مجھ سے بولے' میرا کام تم خود کیا کرو۔''

میں نے کہا ''میں ہی کرتی ہوں۔''

آپ بولے''ہاں میں کسی کا قرض دار نہیں ہونا چاہتا۔ کسی کا قرض دار اگر ہونا چاہتا ہوں تو صرف تمھارا۔''

میں نے کہا''اس میں قرض دار ہونے کی کیا بات ہے؟''

آپ بولے''جو خدمت کرے گا بدلے میں خدمت طلب نہیں کرے گا؟''

میں نے کہا''اپنے گھر میں کوئی کسی کا قرض دار نہیں ہوتا۔''

یہ سنتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں بولی''یہ آپ کیا کر رہے ہیں''؟

بولے کچھ نہیں جی''میں خالی تمھارا ہی قرض دار ہونا چاہتا ہوں دوسروں کا نہیں۔ تم جتنی بھی خدمت کرو گی مجھے خوشی ہی ہوگی کیونکہ تمھارے ہاتھوں اس جنم میں بھی آرام ملے گا اور اس جنم میں بھی''

اس وقت میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ میں اس خیال سے کہ انھیں میرے آنسو نہ دکھائی پڑیں باتھ روم میں چلی گئی۔ سوچ سوچ کر آنکھوں میں آنسو بھر بھر آرہے تھے کہ اتنی سخت تکلیف میں بھی انھیں میرا کتنا خیال ہے۔ مگر مجھے رونے کی جگہ کہاں؟ ان کے سامنے رونے سے ان کی طبیعت اور بھی خراب ہو جاتی۔ باہر روؤں تو لڑکے لڑکیوں کو کیسا لگے گا؟ میری ہی ہمت پر گھر کے سب آدمیوں کو سہارا تھا۔ بار بار یہی دل میں آتا کہ کیا ہوگا؟ بدنصیبوں کی قسمت میں رونا بھی نہیں ہوتا۔ سب کو سمجھانے والی میں تھی۔ میرا سمجھانے والا تو خود ہی بے چین ہے میں کس کے پاس جا کر روؤں؟ پھر میری ڈیوٹی بھی رونے کی نہیں تھی۔

رات کو پھر پیٹ میں درد اٹھا۔ پھر وہی بے چینی۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے سینکنے سے بھی آرام نہیں مل رہا تھا۔ اٹھنے کی طاقت نہیں تھی، پھر بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں کرتی کیا؟ یہ سب باتیں میری آنکھوں کے سامنے ہو رہی تھیں۔ میں ان تکلیفوں سے انھیں بچا نہیں پا رہی تھی۔ گھر بھر سو رہا تھا۔ رات میں، میں اکیلی بیٹھی کبھی پیٹ سہلاتی، کبھی پنکھا جھلتی، جب پیٹ کا درد کچھ کم ہوا تو بولے۔

''رانی میں اب نہیں بچوں گا۔''

میں نے پوچھا''کیا بات ہے؟''

بولے''میری حالت دیکھ رہی ہو پھر بھی تم یہ سوال کر رہی ہو۔''

میں نے کہا'' ڈاکٹر بھی تو یہی کہتا ہے کہ گھبرایئے مت۔''

بولے'' گھبرا نہ جاؤں تو کیا کروں؟''

میں نے کہا'' گھبرانے سے کہیں کام چلتا ہے۔''

پھر بولے'' رات دن تم بھی تو میرے ساتھ پس رہی ہو۔ میں تمھاری خدمت گزاری دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہوں۔''

میں نے کہا'' آپ کو اچھا ہونا ہے۔''

آپ بولے'' نہ اچھا ہوؤں تب''؟

میں نے کہا'' میں یہ نہیں سننا چاہتی۔''

بولے'' آخر۔۔''

میں نے کہا'' اس کے پہلے میں اپنی موت چاہتی ہوں۔''

بولے'' سنو! اگر تم پہلے چلی جاؤ تو مجھے دکھ ہوگا بالکل تمھاری طرح۔ مگر سوچو تب میں تمھارے فرائض اور زیادہ ذمہ داری سے نبھاہتا نا! ویسے ہی تمھیں بھی چاہیے کہ تم اپنے فرائض پورے کرو۔ اگر میں نہ رہوں تو تمھارا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ بنو کو آرام سے رکھنا۔ ایماندار اور نیک انسان بنانا۔ تم ابھی بھی اپنے لیے نہیں جی رہی ہو۔ بعد میں اپنے لیے نہ جیو گی۔ کون سی تم ہی امر ہو کر آئی ہو۔ ایک دن سب کو مرنا ہے''۔

مجھ میں اس وقت بولنے کی طاقت مطلق نہیں تھی ۔ میں لیٹی تھی وہ اپنے آپ بولے جارہے تھے۔ باوجود ان کے سب کچھ کہنے کے میری امید ویسے ہی بندھی ہوئی تھی۔ انھی امیدوں کو لے کر میں جی رہی تھی۔

انھوں نے سمجھا میں سوگئی ہوں۔ اس وقت ایک مصرعہ وہ خود پڑھ رہے تھے

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دنیا کی دعا کر رہے تھے اور اپنے جانے کی تیاری۔ پھر خود کہنے لگے۔

'' دنیا کی سب نعمتیں رہیں گی پر ہم نہیں رہیں گے''۔

ان کی ان باتوں کو سن کر میرا دل پھٹا جارہا تھا۔ پھر میں نے پیچھے کا دروازہ کھولا اور اندھیری رات

میں باہر کھڑی کھڑی روتی رہی۔ رونے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ میں آخر زندہ کیوں ہوں؟ بھیتر سے میری آتما پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ: دیکھ تجھے کتنا دکھ سہنا پڑے گا۔

میں اسی اندھیری رات میں کنوئیں کی طرف چلی۔ جب کنوئیں کی جگت پر پہنچی تو خیال آیا 'تم ڈوبنے تو جا رہی ہو ان کی سیوا کون کرے گا؟ یہ پریم نہیں ہے۔ پریم تو اسی میں ہے کہ گھٹ گھٹ کر مرو۔ اگر اچھے ہو گئے تو سکھ سے رہنا۔

پیر میں جیسے بیڑی پڑ گئی۔ وہ محض ایک امید تھی۔

اس وقت تک آپ جاگ رہے تھے۔ بولے۔

''آؤ چارپائی پر بیٹھ کر پنکھا جھلو۔''

میں پنکھا جھلنے لگی۔ شاید انھوں نے میرا رونا تو نہیں دیکھا تھا پر انداز سے جان لیا تھا میں رو رہی تھی۔ میرا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے ''تم کو ست دیکھتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں کہیں تم بیمار پڑ گئیں تو میں مر جاؤں گا۔ اچھا ہونے والا ہوں گا بھی تو تمھارے بیمار پڑنے پر بچنے کا نہیں۔''

میں بولی ''میں بیمار کہاں پڑی جاتی ہوں' بیماری تو انھیں ہی آتی ہے جو سب کو سکھی کرتے ہیں۔ مجھ ایسوں کو بیماری نہیں آسکتی۔''

میرے گال پر دھیرے سے ایک چپت لگاتے ہوئے بولے ''اگر تم بیمار پڑ جاؤ تو میں کہیں کا نہ رہوں۔ اوروں کو چاہے تمھاری ضرورت نہ ہو مگر میرے لیے تو تم ہی سب سے زیادہ ضروری ہو۔''

ان لفظوں میں کتنا پیار اور اپنا پن ہے۔ چاہے آدمی اور کچھ نہ چاہے پر پیار تو چاہتا ہی ہے۔ ان دونوں کے پیچھے آدمی جو بھی لٹا دے تھوڑا ہے۔

بیماری کے انھی دنوں میں ناتھورام پریمی بمبئی سے ملنے کے لیے آئے۔ انھی دنوں 'ہنس' کی ضمانت بھی دینی تھی۔

آپ بولے ''ہنس' کی ضمانت جمع کرا دو۔''

میں نے کہا ''اچھے ہونے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرائیے نہیں۔''

آپ بولے ''رانی 'ہنس' ضرور نکلے گا چاہے میں رہوں یا نہ رہوں۔''

جب میں نے یہ سنا تو چپ رہ گئی۔ بولی ''کل جمع کرا دوں گی۔''

پریمی جی کئی دن رہے ایک اور صاحب بھی الہ آباد سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ وہ میرے بھائی کے دوست تھے۔ ان دونوں حضرات کو فکر ہوئی کہ کہیں میں بھی بیمار نہ پڑ جاؤں۔ ان دونوں نے ان کے چھوٹے بھائی سے کہا

''یہ رات دن جاگتی ہیں۔ اگر یہ بیمار پڑ گئیں تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔''

ان کے بھائی بولے ''اگر وہ کہیں تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

پریمی جی مجھ سے دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے کہ آپ کہہ دیجیے کہ رات کو وہی جاگا کریں۔''

میں ان سے کہہ رہی تھی کہ میں کیوں کسی سے کہوں۔ میں کیا کافی نہیں ہوں۔ پھر مجھے دوسروں کی سیوا پر وشواس بھی نہیں ہے۔''

نہ معلوم کیسے یہ آواز ان کے کان میں چلی گئی۔ مجھے آواز دے کر بولے ''یہاں تو آؤ۔''

جب میں ان کے پاس گئی تو بولے ''پریمی جی کیا کہہ رہے تھے؟''

میں نے کہا '' آپ نے کہاں سے سن لیا؟''

بولے '' آخر کیا بات تھی؟ میں کسی اور سے سیوا نہیں کرانا چاہتا۔ بس تمھاری ہی سیوا چاہتا ہوں۔''

میں نے جواب دیا '' میں نے کہا ہی آخر کس سے ہے جو آپ ایسی بات کہہ رہے ہیں؟ آپ ہی جب دلہن سے پیر دبوانے کے لیے کہتے ہیں تو انھیں بھیجتی ہوں '' کہیے تو انھیں بھی منع کر دوں۔''

بولے ''ان سے تو میں اپنی مرضی سے پیر دبواتا ہوں۔ ان کو میری خدمت کرنے کا شوق ہے تو میں کیا کروں۔''

میں بولی '' میں بھی نہیں چاہتی کہ دوسرے آپ کی خدمت کریں۔ یوں لڑکا لڑکی جو چاہیں کر دیں' کہیے تو میں انھیں بھی منع کر دوں۔''

اس پر آپ بولے ''نہیں جی یہ تو اپنے ہی ہیں۔''

دوسرے دن تیج* کی صبح تھی دلہن بیٹھ کر پیر دبا رہی تھی۔ میں پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ بٹی من مارے زمین پر بیٹھی تھی۔ دلہن لال رنگ کے کپڑے پہنی تھی۔ میری طرف اشارہ کر کے بولے۔

'' آج بڑی اچھی ساڑھی پہنی ہے۔ اچھا' کل شاید تیج تھی۔''

میں نے کہا '' بٹی کی ساڑھی نہیں آئی۔''

آپ بولے''میں اچھا ہوتے ہی ڈھیر کی ڈھیر ساڑیاں لا دوں گا۔''

آج سب ہی ہمیشہ کے لیے نراش ہو گئے۔ان کی باتوں میں کتنا پریم بھرا ہوتا تھا!

پریمی جی کئی دن رہے۔گھنٹوں بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے۔جس دن دو بجے رات کی گاڑی سے جانے والے تھے میں شاید سو گئی تھی۔آپ مجھے جگا کر بولے۔

''رانی اٹھو پریمی جی کو پہنچا آؤ۔''

پریمی جی بولے''نہیں نہیں سونے دیجیے۔''

میں جاگ گئی تھی''بولی''کہیے کیا بات ہے؟

بولے''پریمی جی جا رہے ہیں۔ان کو کچھ دور تک پہنچا دو۔''

میں پریمی جی کو پہنچانے گئی۔مگر میرے دل کو ان کے وہ الفاظ کہ میری ڈیوٹی تم پوری کرو ایک عجیب طرح کی تکلیف دینے لگے۔میں اپنے من میں بار بار ان شبدوں کو دہرانے لگی۔رہ رہ کر میرے من میں یہی شبد ناچ رہے تھے کہ یہ اپنی ڈیوٹی مجھے سونپ رہے ہیں۔یہ تو اپنے دوستوں کا سواگت خود کرتے تھے'اپنے متروں کو دیکھ کر یہ نہال ہو جاتے تھے۔یہاں تک کہ انھیں پا کر کھانا پینا تک بھول جاتے تھے۔اسی طرح منشی دیا نرائن (نگم) صاحب کے جاتے سے بھی دیکھنے میں آئی۔اس دن اپنی آنکھوں سے اشارہ کیا تھا۔ان میں دکھاوا نہیں تھا۔وہ پریم سے ایسا کرتے تھے۔یہ ان کی عادت کی بات تھی۔ان سے ملنے جو بھی آتا اس سے ہنس کر ملتے۔

آج یہی میری ذمہ داری ہے۔یہی بار بار دماغ میں آتا ہے'ایشور تم نے ان کو اتنا بے بس کر دیا تھا۔پہلے کسی بھی کام کو نہیں کرنے دیتے تھے'آج میری ڈیوٹی بتا رہے ہیں۔'

پریمی جی کو پہنچا آنے کے بعد جب میں لوٹی تو مجھے گھنٹوں رلائی آئی۔مگر زیادہ سانس لینے کی گنجائش میرے لیے نہیں تھی۔

دانتوں کے بیچ زبان کی طرح میں اپنے بوجھ سے دبی تھی اور سانس لینے کی تاب نہ تھی۔سب کچھ سہنے کے لیے میں بھی تیار تھی مگر یہ دیکھنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ دکھی ہو جائیں۔مجھے وشواس تھا کہ وہ اچھے ہو جائیں گے۔

میری آشا کی رسی ٹوٹ چکی ہے۔ان کو تو کھو ہی چکی'ان کی آشا اور ان کا وشواس بھی کھو بیٹھی اور اس کے بنا جیون میرے لیے اماوس کی رات ہے۔اس کے آگے اور کیا کہوں۔

....

ایک پرانا واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔

پریس کھل گیا تھا۔ اور آپ خود وہاں کام کرتے تھے۔ جاڑے کے دن تھے۔ مجھے ان کے سوتی پرانے کپڑے دیکھنے میں بھدے لگے اور گرم کپڑے بنانے کے لیے منت سماجت سے دو بار انھیں میں نے چالیس چالیس روپے دیے لیکن دونوں بار انھوں وہ روپے مزدوروں کو دے دیے۔
گھر پر جب میں نے پوچھا ''کپڑے کہاں ہیں'' تو آپ ہنس کر بولے۔

کیسے کپڑے وہ روپے تو میں نے مزدوروں کو دے دیے۔ شاید ان لوگوں نے کپڑے خرید لیے ہوں گے۔''

اس پر میں بگڑ گئی۔ تب وہ اپنے دھیمے لہجے میں بولے۔

''رانی جو دن بھر تمھارے پریس میں محنت کرے وہ بھوکوں مرے میں اور گرم سوٹ پہنوں' یہ تو شوبھا نہیں دیتا۔''

ان کی اس دلیل پر میں چڑھ گئی اور بولی ''میں نے کوئی تمھارے پریس کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔''

آپ کھل کھلا کر ہنس پڑے اور بولے ''جب تم نے میرا ٹھیکہ لے لیا ہے تو میرا رہا ہی کیا؟ سب کچھ تمھارا ہی تو ہے۔ پھر ہم تم دونوں ایک ناؤ کے مسافر ہیں۔ میرا تمھارا فرض جدا نہیں ہوسکتا۔ جو میرا ہے وہ تمھارا بھی ہے۔ کیونکہ میں نے خود کو تمھیں سونپ دیا ہے۔''

میں لاجواب ہوگئی اور بولی ''میں تو ایسا سوچنا نہیں چاہتی۔''

تب انھوں نے بے انتہا پیار کے ساتھ کہا ''تم پاگل ہو۔''

جب میں نے دیکھا کہ وہ اس طرح جاڑے کے کپڑے نہیں بناتے ہیں تو میں نے ان کے بھائی کو روپے دیے اور کہا کہ ان کے لیے آپ کپڑے بنوا دیں۔ تب بڑی مشکل سے آپ نے کپڑا خریدا۔ جب سوٹ سل کر آیا تو اسے آپ پہن کر میرے پاس آئے اور بولے۔

''میں سلام کرتا ہوں۔ تمھارا حکم بجالایا ہوں۔''

میں نے بھی ہنس کر آشیرواد دیا اور بولی ''ایشور تمھیں سکھی رکھے اور ہر سال نئے کپڑے پہنو۔''

کچھ رک کر میں نے کہا ''سلام بڑوں کو کیا جاتا ہے۔ میں نہ تو عمر میں بڑی ہوں نہ رشتے میں' نہ رتبے میں۔ پھر آپ مجھے کیوں سلام کرتے ہیں۔''

اس کا جواب انھوں نے یہ دیا ''عمر' رشتہ' یا رتبہ کوئی چیز نہیں ہے۔ میں تو دل دیکھتا ہوں اور تمھارا دل

ماں کا دل ہے۔ جس طرح ماتا اپنے بچوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتی ہے اسی طرح تم بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہو اور اس لیے اب میں ہمیشہ سلام کیا کروں گا۔''

ہائے! مئی ۱۹۳۶ء میں انھوں نے نہا کر نئی بنیان پہنی تھی اور مجھے سلام کیا تھا۔ یہی ان کا آخری سلام تھا۔

ان کا آخری دن

ایک دن بے ہوشی دور ہوئی تو بولے ''شو پرساد جی گپت نے ایک ماتر مندر بنوایا ہے۔ مہاتما جی اسے کھولیں گے۔ اسے دیکھنے کے لیے لاکھوں کی بھیڑ وہاں جمع ہوگی۔''

میں نے کہا ''اگر تب تک آپ اچھے ہو جائیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ اسے دیکھنے کے لیے چلوں گی۔''

آپ نے ہنس کر کہا '' میں بھگوان سے پراتھنا کرتا ہوں کہ رانی تمھاری باتیں سچ نکلیں۔ مگر رانی تمھاری اس جنم کی تپسیا سپھل ہوتی نہیں نظر آتی۔

میں نے کہا'' آپ من کیوں چھوٹا کرتے ہیں۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ بھگوان ہماری آشا سپھل کریں گے۔''

آپ بولے'' رانی تم میرے پاس سے کہیں مت جایا کرو۔ تم پاس بیٹھی رہتی ہو تو میری ہمت نہیں ٹوٹتی۔ کل تم نے جو گوشت کی یخنی پلا دی تھی وہ مجھے نہیں پچی۔ تم ایسی چیزیں کیوں مجھے کھلاتی ہو؟''

میں نے جواب دیا'' ڈوکٹر کی رائے سے وہ چیز میں نے آپ کو کھلائی ہے۔ ڈوکٹر کی رائے مانوں یا آپ کی۔''

آپ نے ہنس کر کہا'' ڈوکٹر کو تو تکلیف نہیں ہے۔ تکلیف تو مجھے ہے۔''

میں نے کہا'' اس سے آپ کو نقصان کیا ہوگیا۔''

آپ بولے'' رانی دیکھا نہیں تم نے کتنے زور کا دست مجھے ہوا تھا۔''

میں نے کہا'' اس سے تو فائدہ ہی ہے۔ سب پانی نکل جائے گا۔''

آپ نے فکر بھری آواز میں کہا'' پانی کے ساتھ سب کچھ نکلا جارہا ہے۔'' رانی''

میں ان کے یہ الفاظ سن کر رو پڑی۔ ٹپ ٹپ کر کے میرے آنسو زمین پر گرنے لگے۔ حالانکہ بڑی کوشش میں رہتی تھی کہ آپ کے سامنے میری آنکھوں سے آنسو نہ نکلیں پر اس بار میرا من بے بس ہو گیا۔ میرے حوصلے کا بند ٹوٹ گیا۔

دوسرے دن پھر آپ کو بے ہوشی ہوئی۔ بہت زور کا دست بھی ہوا۔ میں اسے صاف کرنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی کہ بھائی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''بہن وہ اب نہیں رہے' کہاں جاتی ہو۔''

میں کھل کر رو پڑی۔

اور تب سے آج تک رو رہی ہوں' اب مجھے کس کا ڈر ہے۔ پڑھنے والو! آگے مجھ سے اب لکھا نہیں جا رہا ہے۔ اب میری باقی زندگانی رونے ہی کے لیے رہ گئی ہے۔

میں نہ کوئی ادیبہ ہوں نہ فن کار۔ اس تحریر سے پڑھنے والوں کا ذرا بھی فائدہ ہو سکا تو اپنے کو شاباشی کے قابل سمجھوں گی۔